اٹلی کا سفر

مجھے اٹلی کے شہر وینس پہنچنا تھا۔

میری جیب میں پاسپورٹ، بحرین تک سمندری جہاز کے ٹکٹ اور پچیس امریکی ڈالروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اٹلی کا ویزا میں نے کسی نہ کسی طرح لگوا لیا تھا۔ میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ سفرنامہ لکھ رہا ہوں تو وہ سب واقعات پوری دیانت داری کے ساتھ بیان کروں گا جو مجھے دوران سفر اور اٹلی پہنچ کر پیش آئے۔ میرے سفر کی یہ داستان بالکل سچی ہے۔ اسی لیے میں لکھتے ہوئے نہ تو مبالغے سے کام لوں گا اور نہ اپنی طرف سے کوئی واقعہ لکھوں گا۔ میرا سفرنامہ پڑھ کر اگر کوئی مجھے برا بھلا کہتا ہے تو بے شک کہتا پھرے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں اپنے پڑھنے والوں کے سامنے حقائق بیان کروں اور جو کچھ مجھ پر بیتی ہے، وہ صحیح تفصیلات کے ساتھ پیش کر دوں۔

میرے پاؤں میں شروع ہی سے ایک چکر رہا ہے۔ بچپن میں ہی میں گھر سے بھاگ کر جنوب مشرقی ایشیا کے شہروں، سمندروں اور جنگلوں کی طرف نکل گیا تھا اور وہاں ایسے ایسے واقعات پیش آئے کہ آج انہیں یاد کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل میں محبت بھری یادوں کی شمع بھی روشن ہو جاتی ہیں۔

میں نے اٹلی کا سفر کیوں اختیار کیا؟

اس کی دو وجوہات تھیں۔۔۔۔۔۔۔ ایک تو یہ کہ میں ان کھنڈرات کو دیکھنا اور وہاں رات بسر کرنا چاہتا تھا جو کبھی عظیم رومن ایمپائر کے عظیم الشان محلات ہوا کرتے تھے اور ان محلات کے ایوانوں میں سنہری بالوں اور سیاہ آنکھوں والی شہزادیاں رہا کرتی تھیں۔ میں پرانے قلعوں کے وہ تاریک تہہ خانے بھی دیکھنا چاہتا تھا جہاں قیدیوں کے سروں میں میخیں ٹھونک کر انہیں اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا جاتا تھا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ میں کسی گولڈن بالوں والی خوبصورت اطالوی لڑکی سے رومانس لڑانا چاہتا تھا۔ اطالوی لڑکیوں کے حسن و جمال کے بارے میں، میں نے بہت کچھ پڑھا تھا اور بہت کچھ سن بھی رکھا تھا۔ ان کی عیاشیوں کی کہانیاں بھی میں نے بہت سنی تھیں۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں اٹلی پہنچ کر یہ ساری عیاشیاں بھی کرنا چاہتا تھا اور اٹلی کی شان و شوکت والی تہذیب کے بوسیدہ کھنڈر بھی دیکھنا چاہتا تھا۔

یہی شوق و فضول اور ایڈونچر تھا جو مجھے اٹلی کی طرف کھینچے لیے جا رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہاں میں کہاں رہوں گا۔ دن کہاں گزرے گا' راتیں کہاں بسر ہوں گی' سورج غروب ہوتے ہوئے مجھے کس حال میں دیکھے گا اور جب طلوع ہو گا تو میں کہاں اور کس حال میں ہوں گا۔ بس میرا ذوق آوارگی اور ذوق عیاشی مجھے کشاں کشاں لیے جا رہا تھا۔ پردیس میں تکلیفیں اٹھانے کا مجھے پہلے ہی سے تھوڑا بہت تجربہ تھا مگر یہ معاملہ یورپ کا تھا جہاں اگر جیب خالی ہو تو کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔ اس کے باوجود میں اپنی منزل یعنی اٹلی کے شہر وینس میں پہنچنے کو بے تاب تھا۔ وینس کا شوق مجھے اس لیے بھی تھا کہ میں نے پڑھا بھی تھا اور فلموں میں بھی دیکھا تھا کہ اس شہر کی گلیوں میں ایڈریاٹک سمندر کا پانی بہتا ہے اور گلیوں میں کشتیاں چلتی ہیں جنہیں گنڈولا کہا جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جزیروں پر آباد یہ ملک میں ضرور دیکھنا چاہتا تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ جس اطالوی لڑکی سے میں عشق کرنے کی نیت اور خیال لے کر جا رہا ہوں' وہ مجھے وینس میں ہی ملے گی۔ اس خیالی اطالوی لڑکی کا تصور میرے اندیشہ ہائے دور دراز کو میرے قریب نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔ میں نے اپنا سفر کراچی سے شروع کیا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے ایک طرح سے بحرین کے آگے پیدل ہی سفر کرنا پڑے گا۔ کیونکہ میرے پاس کرایہ صرف بحرین تک کا ہی تھا اور جو چھبیس امریکی ڈالر تھے وہ زیادہ دیر تک میرا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔

میں نے سوچ رکھا تھا کہ راستے میں جہاں کوئی چھوٹا موٹا کام ملا کر لوں گا اور جب کرایہ جمع ہو گیا تو اگلے شہر کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ میری منصوبہ بندی بہت اچھی اور منطقی تھی مگر راستے میں مجھے کیسے کیسے ہوشربا واقعات پیش آئیں گے اور کیسے کیسے دشوار گزار جنگلوں سے مجھے اکیلے گزرنا پڑے گا' اس کا مجھے پورا احساس نہیں تھا۔ بحرین میں میرا ایک امرتسری دوست کسی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ کچھ روز اسی کے پاس رہوں گا۔ اس کی مدد سے بحرین میں کوئی جاب حاصل کروں گا اور تھوڑی بہت رقم جمع کر کے آگے چلوں گا۔

میرا روٹ یہ تھا۔۔۔۔۔۔۔ بحرین سے بذریعہ بحری جہاز بصرہ جاؤں گا' بصرے سے بغداد' بغداد سے شام کے ملک میں داخل ہوں گا اور لبنان پہنچ جاؤں گا۔ لبنان سے بحری جہاز میں بیٹھ کر سیدھا اٹلی جانے کی کوشش کروں گا۔ اگر اتنے لمبے سمندری سفر کا کرایہ مجھ سے نہ ہو سکا تو راستے میں رکتا ہوا اپنا سفر جاری رکھوں گا یعنی لبنان سے سائپرس (قبرص) جاؤں گا' وہاں محنت مزدوری کر کے کرایہ جمع کروں گا اور "کریٹ" پہنچوں گا اور وہاں سے کسی جہاز میں سوار ہو کر اٹلی کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ پروگرام بنانے بڑے آسان ہوتے ہیں' لیکن جب ان پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تب جا کر پتہ چلتا ہے کہ جس ایک چیز کو ہم بہت آسان سمجھ رہے تھے' اس کی مشکلات کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔

یہ سفرنامہ لکھنے کا میرا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ جو نوجوان یہ ایڈونچر کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں' وہ میرے سفرنامے سے راہنمائی حاصل کریں۔ اس طرح وہ ان مصیبتوں اور ناگہانی آفتوں سے محفوظ رہ سکیں گے جو مجھے اپنے پیدل سفر کے دوران قدم بقدم پیش آئیں۔

اب میں اپنا ہوش ربا رونگٹے کھڑے کر دینے والا سفر نامہ شروع کرتا ہوں۔

اسلام آباد سے اپنے پاسپورٹ پر اٹلی کا ویزا لگوانے کے بعد میں لاہور واپس آ گیا۔ یہ ٹورسٹ ویزا تھا اور اس کی مدت تین ماہ کی تھی۔ میں اٹلی میں اتنی دیر ہی ٹھہرنا چاہتا تھا کیونکہ میرے نزدیک اٹلی میں رہ کر وہاں رومن ایمپائر کے کھنڈرات' وینس کی گلیاں جہاں نہریں بہتی تھیں' دیکھنا اور وینس کی کسی گولڈن بالوں والی لڑکی سے عشق کرنے کے لیے اتنی مدت کافی تھی۔ لاہور میں' میں نے کسی سے ذکر تک نہ کیا کہ میں اٹلی جا رہا ہوں۔ میرے وسائل محدود تھے۔ میں کسی سے قرض بھی نہیں لینا چاہتا تھا۔ کچھ رقم میں نے اس ایڈونچر کے لیے بچا رکھی ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک روز میں تین کپڑوں میں گھر سے اٹلی کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

مجھے دیکھ کر کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ یہ نوجوان لاہور سے اٹلی جا رہا ہے۔ میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ ایک ٹوتھ برش تھا۔ سیب کاٹنے والا چاقو اور ایک بٹوہ تھا جس میں' میں نے لاہور سے بدلوائے ہوئے ڈالر اور پاسپورٹ رکھ کر اسے ایک رومال میں لپیٹ کر بنیان کے اندر کمر سے باندھا ہوا تھا۔ باقی اللہ کا نام تھا اور میں تھا۔ میں نے زندگی میں جتنے بھی ایڈونچر کئے' اسی بے سرو سامانی کی حالت میں کئے تھے۔ سامان ساتھ رکھ کر ایڈونچر نہیں ہوتا۔ پھر آدمی سامان کو ہی سنبھالتا رہتا ہے۔ ٹرین نے مجھے کراچی پہنچا دیا۔ کراچی میں اپنے ایک دوست کے فلیٹ میں ٹھہرا۔ اسے میں نے خط لکھ کر پہلے سے اطلاع کر دی تھی کہ میں اٹلی جا رہا ہوں' وہ مجھے سٹیشن پر لینے آیا ہوا تھا۔

پوچھنے لگا۔ "سامان کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔ "کون سا سامان؟"

وہ حیران ہو مجھے تکنے لگا۔

"تو کیا ان تین کپڑوں میں اٹلی جاؤ گے؟"

کہا۔ "کیا آدمی تین کپڑوں میں اٹلی نہیں جا سکتا؟"

بہر حال وہ میری طبیعت سے واقف تھا' کہنے لگا۔ "تم جانو تمہارا کام"

کراچی میں میرے اس دوست کا کاروبار تو چھوٹا سا تھا مگر اس کی واقفیت بہت تھی۔ اس نے دو تین روز کی تگ و دو کے بعد کراچی سے بحرین جانے والے ایک بحری جہاز کے ڈیک کی ٹکٹ دلوا دی۔ وہ مجھے جیٹی تک چھوڑنے آیا۔ جب میں نے اسے خدا حافظ کہا تو وہ مجھ سے بغل گیر ہو گیا اور بولا۔

"دوست! کاش میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا۔۔۔۔۔۔۔۔ اپنا خیال رکھنا۔"

میں مسکرا دیا۔ بحری جہاز کے بندرگاہ سے روانہ ہونے میں ابھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ میرا دوست چلا گیا۔ میں جہاز کے ڈیک پر آ کر ٹہلنے لگا۔ بحرین جانے والے مسافر اپنا اپنا سامان ڈیک پر لگا رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر مزدور پیشہ محنت کش لوگ تھے۔ عورتیں اور بچے بھی ان کے ساتھ جا رہے تھے۔ میں لوئر ڈیک میں آ گیا۔ یہاں جہاز کی چھوٹی سی کینٹین تھی۔ میں نے کینٹین میں بیٹھ کر چائے پی۔ جہاز پر میرا کوئی واقف نہ تھا۔ کچھ دیر اکیلا کینٹین میں بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ پھر اوپر ڈیک پر آ گیا۔ جہاز لنگر اٹھا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد جہاز کے انجن چلنے لگے۔ ان کی تھرتھراہٹ میں ڈیک کے لکڑی کے فرش پر محسوس کر رہا تھا۔ میں اس سے پہلے بھی سمندری جہازوں میں سفر کر چکا تھا۔ جہاز رک رک کر وسل دے رہا تھا۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ کراچی کی بندرگاہ کو چھوڑنا شروع کر دیا۔ یہ منظر مجھے ہمیشہ بڑا اچھا لگا تھا۔ میں ڈیک کے جنگلے پر جھک کر کھڑا جہاز کو آہستہ آہستہ جیٹی کے پشتے سے پیچھے ہٹتے دیکھ رہا تھا۔ ہمارے اور بندرگاہ کے درمیان سمندر کا نیلا پانی حائل ہو رہا تھا۔ یہ فاصلہ بڑھتا چلا گیا۔ جہاز جب کراچی کی بندرگاہ سے کافی آگے آ گیا تو اس نے اپنا رخ مغرب کی طرف پھیرا اور کھلے سمندر کی جانب اپنا سفر شروع کر دیا۔

سمندر کا یہ سفر بھی کٹ گیا اور جہاز گلف کے خوبصورت جزیرے بحرین کی بندرگاہ پر پہنچ گیا۔ یہاں بھی میرا بحرین والا دوست مجھے لینے آیا ہوا تھا۔ اس نے بھی سب سے پہلا سوال یہی کیا۔

"سامان کہاں ہے؟"

جب اسے معلوم ہوا کہ میں بغیر سامان کے سفر کر رہا ہوں تو وہ بھی بڑا حیران ہوا۔ میرے اس بحرین والے دوست نے میری بڑی مدد کی۔ اس نے مجھے ایک نائیلون کا بنا ہوا سفری تھیلا اور ضرورت کی کچھ چیزیں بھی خرید کر لے دیں۔ یہ تھیلا سیاح لوگ سفر کرتے ہوئے اپنی کمر پر باندھ لیتے ہیں۔ کہنے لگا۔

"تم جس ملک میں جا رہے ہو، وہاں سخت سردی پڑتی ہے، یہ ٹھنڈی جیکٹ تمہارے کام نہیں آئے گی وہاں۔"

اس نے مجھے نائیلون کے فوم والی گرم جیکٹ بھی لے دی جو زپ لگا کر گلے میں بند ہو جاتی تھی۔ اس جیکٹ کے ساتھ ایک گرم ٹوپی بھی تھی جس کے پہننے سے کان ڈھک جاتے تھے۔ ایک گرم پتلون بھی خرید کر دی۔ میرے پاس خرچ وغیرہ کر کے بیس ڈالر باقی رہ گئے تھے۔ اس نے مجھے اپنی طرف سے مزید بیس ڈالر دے دیئے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ دوست واقعی وہی ہوتا ہے جو مشکل میں دوست کے کام آئے۔

سرزمین عراق

میرے پاسپورٹ پر اٹلی کے علاوہ شام، سائپرس، سسلی کے ویزے بھی لگے ہوئے تھے۔ چونکہ یہی میرا روٹ تھا اس لیے میں نے

اسلام آباد میں اطالوی سفارت خانے سے ان ملکوں کے خاص طور پر ویزے لگوا لیے تھے۔ دو تین دن میں بحرین میں اپنے دوست کے پاس رہا۔ پھر اس نے مجھے بصرہ جانے والے بحری جہاز میں بٹھا دیا۔ یہاں سے مجھے بغداد جانا تھا۔ میرے دوست نے مجھے راستے کے بارے میں ساری معلومات گوش گزار کر دی تھیں۔ وہ ان ملکوں میں کافی سفر کر چکا تھا۔ چنانچہ بصرے پہنچ کر میں اپنے دوست کے بتائے ہوئے تیسرے درجے کے ایک ہوٹل میں آ گیا۔ یہاں میں نے ایک گندے مندے کمرے میں رات بسر کی اور ساری رات مچھروں سے لڑتا رہا۔

دوسرے دن میں کویت کی سرحد پار کر کے عراق میں داخل ہو گیا۔ عراق کی قدیم تہذیب کے بارے میں، میں نے بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ یہ بابل کے بادشاہ موروتی کی سرزمین تھی۔ جہاں کبھی ایک چاہ بابل ہوا کرتا تھا۔ بابل کے بادشاہ بخت نصر نے اپنی چہیتی بیوی کے لیے اپنے محل کی چوتھی منزل پر معلق باغات لگوائے تھے۔ اس کی وجہ یورپ کے مورخین نے یہ لکھی ہے کہ بخت نصر شاہ بابل کی اس بیوی کا تعلق میڈیا کے علاقے سے تھا جو ایک سرد علاقہ تھا۔ عراق کی سخت گرمی میں ملکہ پریشان ہو گئی چنانچہ بادشاہ نے اس کی خاطر محل کی چھت پر باغات لگوائے جہاں بڑے گنجان درخت تھے اور ان باغات کو پانی نیچے سے اوپر سپلائی کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں یہ انجینئرنگ کا ایک کمال تھا۔ میں سارے بغداد میں اور اس کے قرب و جوار میں گھوما پھرا، مجھے چاہ بابل اور بخت نصر کے معلق باغات والا محل کہیں دکھائی نہ دیا۔ اس عالی شان محل اور چاہ بابل کے اب کھنڈر بھی باقی نہیں تھے۔ صحرا کی ریت نے بابل کے شاہی محلات کو نگل لیا تھا۔ جہاں کبھی ان شان و شوکت والے بادشاہوں اور نازک اندام بستر کمخواب پر سونے والی شہزادیوں کی خواب گاہیں ہوا کرتی تھیں، وہاں اب ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

بغداد کے چہکتے ہوئے بازار رات کے وقت ضرور الف لیلیٰ کی داستانوں کی یاد دلاتے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے خلیفہ ہارون الرشید کے بغداد کا زمانہ زندہ ہو گیا، جب اس شہر کو حقیقی معنوں میں عروس البلاد کہا جاتا تھا۔ یہاں بیٹھ کر مسلمان سائنس دانوں نے طب، فلسفہ، فزکس، جغرافیہ، کیمیا، فلکیات اور ریاضی کے علوم میں حیرت انگیز ریسرچ کی اور ایسی شمعیں روشن کیں کہ جن کی روشنی میں یورپ نے نشاۃ ثانیہ کی راہیں تلاش کیں۔ کس قدر جلیل القدر تھے وہ مسلمان سائنس دان کہ جن کی دکھائی ہوئی روشنی آج بھی یورپ کے سائنس دانوں کی راہ نمائی کر رہی ہے۔ اور ان کی کتابوں کے تراجم آج بھی یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ الف لیلہ اس شہر بے مثال کا ایک ایسا کارنامہ تھا کہ جس نے بغداد کو دنیائے ادب میں ایک کلاسیک حیثیت کا حامل بنا دیا۔

مگر آج کا بغداد اور پرانے بغداد سے کافی مختلف تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی ہر طرف امن تھا۔ لبنان میں بھی خانہ جنگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ عراق پر صدر صدام حسین امن چین سے حکمران تھے۔ ایران کے ساتھ ان کی سیاسی چپقلش ضرور چل رہی تھی مگر جنگ تک نوبت نہیں

پہنچی تھی۔ میں بہت سوچ سمجھ کر پیسے خرچ کر رہا تھا کیونکہ ان ممالک میں مجھے کسی جاب ملنے کی توقع نہیں تھی۔ میں ایک سرائے نما تھرڈ کلاس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا جہاں ایک حویلی نما ہال کمرے میں مجھے صرف ایک چارپائی رات کو سونے کے لیے مل گئی تھی۔

بغداد میں، میں نے متبرک زیارات کا شرف بھی حاصل کیا۔ مقدس مزارات پر فاتحہ خوانی کی۔ بغداد کی سب سے بڑی مسجد میں جمعہ المبارک کی نماز پڑھی اور خدا کے حضور پاکستان کے استحکام کے لیے دعائیں مانگیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنے وطن سے باہر جاتے ہی اپنے وطن کی قدر و قیمت کا مجھے احساس ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میرے ڈالر خرچ ہونا شروع ہو گئے تھے۔

اگلی پہنچنے تک میں کم از کم خرچ کرنا چاہتا تھا۔ پھر بھی یہ ممالک جن کے گلی کوچوں کی میں سیاحت کر رہا تھا، پاکستان کے مقابلے میں بڑے مہنگے تھے اور چیزیں پاکستان کے مقابلے میں نسبتاً مہنگی تھیں۔ مگر ایک بات ضرور تھی کہ چیزوں میں ملاوٹ بالکل نہیں تھی۔ بغداد کی تندوری روٹی بڑی لذیذ اور خالص تھی۔ دریائے دجلہ کے کنارے ایک معمولی سے ریسٹوران میں بیٹھ کر میں نے مچھلی کے کباب کھائے اور ان کا میٹھا اور گاڑھا قہوہ بھی پیا۔ یہاں شام کے وقت ایک گٹار نواز سے عربی گانے بھی سنے۔ یہ گٹار نواز موصل کا رہنے والا تھا۔ اور بغداد کے ریسٹورانوں میں گٹار پر عربی گانے گا کر اور عربی گانوں کی دھنیں بجا کر اپنی روزی کماتا تھا۔

ملک شام

بغداد کو میں نے ایک دن صبح صبح الوداع کہا اور ملک شام کی طرف بذریعہ بس روانہ ہو گیا۔ ملک شام کے لوگوں کا رنگ عراقیوں کی نسبت زیادہ صاف اور گورا تھا۔

اس ملک کی تہذیب اور تاریخ بھی بہت پرانی ہے لیکن یہ ملک قدیم زمانے میں زیادہ تر بابل کے بادشاہوں کے زیر نگیں رہا ہے۔ یا پھر ساسانی شہنشاہوں نے اسے اپنے ملک فارس میں شامل کر لیا تھا۔ مگر اس سے بھی پہلے شام کی تہذیب ایک وقت میں اپنے عروج پر تھی اور اس کے خود مختار بادشاہ پورے شرق الاوسط پر حکمرانی کرتے تھے۔ دمشق میں بڑے بڑے جلیل القدر مسلمان بادشاہوں نے بھی حکومت کی۔ خلیفہ ہارون الرشید نے یہاں بیت الحکمت قائم کیا جہاں طب سمیت زندگی کے دوسرے علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔

آج کا دمشق ایک ماڈرن شہر ہے۔ یہاں بڑی بڑی عالی شان ماڈرن عمارتیں ہیں۔ تعلیم عام ہے اور شامی خواتین مردوں کے دوش بدوش دفتروں، عدالتوں اور کارخانوں میں کام کرتی ہیں۔

لبنان

دمشق کے بعد میں لبنان کے شہر اور بندرگاہ بیروت میں آ گیا۔ یہ شہر اس زمانے میں اپنی جاگتی روشن راتوں کی وجہ سے سارے یورپ

میں مشہور تھا۔ ایک بار تو میری آنکھیں بھی اس شہر کی روشنیوں اور عیش پرستی کے ماحول کو دیکھ کر چکا چوند ہو گئیں۔ مگر میری منزل لبنان نہیں اٹلی تھی۔ بیروت میں ہر شے اتنی مہنگی تھی کہ میں سوچ سمجھ کر خرچ کر رہا تھا۔ میرے پاس صرف پندرہ ڈالر باقی رہ گئے تھے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ میں صبح کافی کے ایک پیالے کے ساتھ ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے کھا کر ناشتہ کرتا۔ دوپہر کو کسی سستے سے ریستوران میں جا کر ایک طرح سے چٹنی کے ساتھ روٹی کھا لیتا اور رات کو بھی ایسا ہی کرتا۔ یہاں قدم قدم پر بیروت کے حسن جہاں سوز کی عشوہ طرازیاں میرا دامن کھینچ رہی تھیں۔ میں تو وہ آدمی ہوں کہ عشوہ طرازیاں میرا دامن کھینچ رہی تھیں۔ میں تو وہ آدمی ہوں کہ عشوہ طرازیاں میرا دامن نہ بھی کھینچتیں تو میں خود بخود ان کی طرف چل پڑتا مگر مجبور تھا۔ کیونکہ بیروت میں ڈالر کے بغیر عشق میسر نہیں آتا تھا۔ اور میں چند ایک ڈالروں کو جو بچ گئے تھے اٹلی کے لیے بچا کر رکھے ہوئے تھا۔ میں صرف اٹلی پہنچنا چاہتا تھا۔ اگر مجھے کوئی حماقت کرنی ہی تھی تو میں اٹلی پہنچ کر یہ حماقت کرنا چاہتا تھا۔

قبرص

میری اگلی منزل سائپرس یعنی قبرص تھی جو بحیرہ روم میں ایک بہت بڑے جزیرے پر آباد ہے اور جہاں مسلمان ترکوں اور یونانیوں کی آبادی ہے۔ بیروت سے چھوٹے بڑے بحری جہاز سائپرس جاتے تھے۔ بعض بحری جہاز سسلی جاتے ہوئے راستے میں سائپرس رکتے تھے اور بعض سیدھے اٹلی کے لیے روانہ ہوتے تھے۔ میرے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بیروت سے اٹلی کے جنوبی شہر کی بندرگاہ تک کا بحری جہاز کے تھرڈ کلاس کا کرایہ اتنا ہے کہ میرے پاس اس کا تیسرا حصہ بھی نہیں ہے۔ سوچنے لگا کیا کروں .... کسی مال بردار بحری جہاز میں اگر جگہ مل جائے تو جہاز پر کام مل جانے کی صورت میں پیسے بھی بچ جائیں گے' کیونکہ میرے اندازے کے مطابق اٹلی پہنچ کر میرے پاس چند ایک ڈالر ہی بچتے تھے۔ اتنی تھوڑی سی رقم اٹلی ایسے ملک میں داخل ہونے کے لیے ناکافی تھی۔ خاص طور پر جبکہ وہاں میرا کوئی جاننے والا بھی نہیں تھا اور مجھے کوئی جاب ملنے میں بھی دیر لگ سکتی تھی۔ بیروت میں بھی میرا کوئی واقف کار نہ تھا۔ میں جس چھوٹے سے ریستوران میں کھانا وغیرہ کھاتا تھا' اس کا مالک ایک مسلمان عراقی تھا۔ میں نے اس کو سارا ماجرا بیان کیا اور مدد چاہی۔ وہ کافی عرصے سے لبنان میں رہ رہا تھا۔ اس کی وساطت سے میں ایک عرب مکینک سے ملا جو بندرگاہ پر کام کرتا تھا۔ قصہ مختصر اس عرب نے مجھے ایک مال بردار بحری جہاز کے کپتان سے ملایا جس کو دیکھ کر مجھے بحری ڈاکو یاد آ گئے۔ اس کے منہ سے سگار تھا۔ مجھے دیکھ کر کرخت لہجے میں بولا۔ ""تم چوری تو نہیں کرتے؟""

یہ فقرہ اس نے انگریزی میں پوچھا تھا۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑا۔ اس کے آگے کا ایک دانت غائب تھا۔ وہ جہاز کے ڈیک پر کھڑا یوں جھول رہا تھا جیسے پئے ہوئے ہو۔ اس نے میری تلاشی لی۔ پاسپورٹ دیکھا' کہنے لگا۔ ""او کے' کل صبح صبح جہاز پر آ جانا۔""

یہ مال بردار جہاز اٹلی کی جنوبی بندرگاہ ٹارنٹو جا رہا تھا جو ایونین سمندر میں اٹلی کے جنوب میں واقع تھا۔ میں نے نقشے میں اٹلی کے تمام شہروں کو دیکھ رکھا تھا۔ دوسرے روز میں صبح صبح جہاز پر پہنچ گیا۔ کیپٹن نے مجھے اسی وقت کچن میں کام پر لگا دیا۔ میرا کام ڈش واشنگ اور کچن کی صفائی ستھرائی کرنا تھا۔ میرے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کیپٹن نے کہا تھا کہ کھانا وغیرہ تمہیں مفت ملے گا اور اٹلی پہنچ کر تمہیں تھوڑا بہت معاوضہ بھی دے دیا جائے گا۔

میں بہت خوش تھا کہ اٹلی بھی پہنچ جاؤں گا اور تھوڑی بہت رقم بھی میری جیب میں آ جائے گی۔ یہ مال بردار جہاز دن کے وقت بیروت کی بندرگاہ سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ بڑا لمبا سفر تھا۔ راستے میں جہاز نے رکنا تھا۔ سب سے پہلا سٹاپ سائپرس تھا۔ یہاں جہاز پورا ایک دن رکا رہا۔ کچھ سامان اتارا گیا۔ نیا سامان لادا گیا۔ جہاز کی اگلی منزل بحیرۂ روم میں واقع یونان کا جزیرہ کریٹ تھا۔ کریٹ پہنچنے پر میں جہاز سے اتر کر ادھر ادھر گھومنے لگا۔ یہ وہ جزیرہ تھا جہاں یونانی تہذیب اور ڈرامے نے جنم لیا تھا۔ یہ جزیرہ سطح مرتفع پر آباد تھا۔

مکانوں کی تعمیر اور لوگوں کے چہروں سے یونانی تہذیب اور کلچر کے آثار صاف ظاہر ہو رہے تھے۔ کریٹ سے روانہ ہو کر جہاز بحیرۂ روم سے نکل کر شمال کی جانب ایونین سمندر میں داخل ہو گیا۔ یہ سمندر دنیا کی دو قدیم ترین تہذیبوں کے حامل ممالک یونان اور روم کے درمیان موجزن تھا۔ شمال کی جانب سے ایڈریاٹک سمندر کا پانی آ کر ایونین اور بحیرۂ روم کے پانیوں میں شامل ہو رہا تھا۔ میں سارا دن کچن میں برتن صاف کرتا پھر کچن کے فرش پر گیلا جھاڑو لگاتا۔ رات کو تھک ٹوٹ کر وہیں کچن کے فرش پر سو جاتا۔ آخر ایک دن دوپہر کے بعد جہاز اٹلی کی بندرگاہ ٹارنٹو پہنچ گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

میں ڈیک پر کھڑا اٹلی کے نیلے آسمان کو تک رہا تھا۔ آسمان پر آبی پرندے جہاز کے اوپر چکر لگا رہے تھے۔ سمندر کے نیلے پانیوں کو دیکھ کر مجھے سا خیال آ گیا کہ آج سے سینکڑوں برس پہلے یہاں نہ جانے کتنی بحری جنگیں لڑی گئی تھیں۔ یہی وہ سمندر ہے جہاں یونان کے مختصر سے بحری بیڑے نے ایران کے بہت بڑے بحری بیڑے کو شکست دے کر ایران کی بحری بالادستی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔ میں اپنے تصورات میں گم تھا کہ پیچھے سے کسی نے بڑے زور سے میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر مجھے اپنی طرف کھینچا۔ میں گرتے گرتے بچا۔ یہ جہاز کا کپتان تھا۔ وہ اپنے مخصوص اجڈ لہجے میں بولا۔ ”چلو نیچے اترو۔ تمہارا سفر یہاں ختم ہوتا ہے۔“

کیپٹن نے مجھے اپنی جیکٹ کی جیب میں سے پچاس امریکی ڈالروں کے نوٹ نکال کر دیئے اور کہا۔ ”یہ تمہارے کام کی مزدوری ہے۔ چلو اب بھاگ جاؤ۔“

میں نے کچن میں جا کر اپنا سفری تھیلا باندھ کر کمر پر ڈالا اور جہاز سے اتر گیا۔

◆ ◆ ◆

اٹلی کی سرزمین

اٹلی کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی میں نے گہرا سانس لیا۔ میرا خیال تھا کہ اٹلی کی فضاؤں میں سائپرس کے درختوں اور سرخ گلابوں کی خوشبو ہوگی۔ مگر ایسی بات نہیں تھی۔ بندرگاہ کی فضا میں تو ڈیزل کی بو رچی ہوئی تھی۔ اطالوی مزدور جہاز پر سے سامان اتار رہے تھے۔ میں بندرگاہ سے باہر آ گیا۔ اٹلی میں یہ بہار کا موسم تھا۔ میں نے اپنے ایڈونچرس سفر کے لیے پوری معلومات حاصل کر کے وہ مہینہ چنا تھا جب اطالیہ میں بہار کا موسم ہوتا ہے۔

اٹلی کا شہر ٹارنتو

یہ یورپ تھا اور میں اٹلی کے جنوبی ساحلی شہر میں کھڑا تھا۔ میرے سامنے دو رویہ سڑک تھی جس پر موٹر گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ اطالوی مرد اور عورتیں کھلے موسم کے لباس میں فٹ پاتھ پر تیز تیز قدموں سے چلے جا رہے تھے۔ عورتیں بڑی خوبصورت تھیں۔ کسی کے بال سنہری تھے تو کسی کے سیاہ تھے۔ رنگ سب کے گورے تھے۔ میں ابھی کسی سنہری بالوں والی اطالوی دوشیزہ سے عشق کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ویسے بھی مجھے وینس پہنچنا تھا جو ملک کے شمال میں کافی فاصلے پر ایڈریاٹک سمندر میں واقع تھا۔ پچاس امریکی ڈالر بحری جہاز پر تھرڈ کلاس میں سفر کرنے کے لیے بہت تھے۔ مگر میں دو ایک روز ٹارنتو شہر میں رک کر اس شہر سیر و سیاحت کرنا چاہتا تھا۔

میرے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ یہاں ایک بہت بڑی مصیبت میرا انتظار کر رہی ہے۔ ایک ریستوران میں بیٹھ کر میں نے بلیک کافی پی۔ کافی کا ذائقہ مجھے بہت اچھا لگا۔ میرے پاس امریکن سگریٹ تھے جو میں نے جہاز پر ہی خریدے تھے۔ کھانا بھی میں نے جہاز پر کھا لیا تھا۔ یوں میں نے دوپہر کے کھانے کے پیسے بچا لیے تھے۔ کافی دیر تک میں ٹارنتو شہر کی سڑکوں اور پارکوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ شہر کی عمارتیں جدید بھی تھیں اور پرانی عمارتیں بھی جگہ جگہ نظر آ رہی تھیں۔ چھوٹی سڑکوں پر دونوں جانب اونچے اونچے پرانے ٹائپ کے چھجوں والے مکان تھے جن کے درمیان لوہے کے تار باندھ کر وہاں عورتوں نے گیلے کپڑے سکھانے کے لیے ڈال رکھے ہوئے تھے۔ یہ منظر میں نے اطالوی فلموں میں بھی دیکھا ہوا تھا۔

رات میں نے بندرگاہ کے پاس ہی ایک سرائے نما ہوٹل میں بسر کی۔ رات کا کرایہ ایک ڈالر تھا۔ بحری جہاز کے سفر نے اور ویگن میں

ڈنر واشنگ نے مجھے تھکا دیا تھا۔ چنانچہ ساری رات سویا رہا۔ صبح آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ بڑی سڑک پر سے ٹرام کے گزرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ نیچے آ کر ریستوران کی ٹوٹی پھوٹی کرسی پر بیٹھ کر ناشتہ کیا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے وینس پہنچنے کے لیے کون سا روٹ اختیار کرنا چاہیے۔ بحری جہاز کا تارنتو سے وینس تک کرایہ بہت زیادہ تھا۔ بس پر سفر کرتے ہوئے بھی مجھے تین چار دن لگ جاتے اور بسوں کا کرایہ بھی اٹلی میں بہت زیادہ تھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ ہچ ہائیکنگ کی جائے یعنی بڑی شاہراہ پر پیدل چلنا شروع کر دوں۔ ہائی وے پر گزرتی ہوئی موٹر گاڑیوں ٹرکوں کو ہاتھ دیتا جاؤں، کوئی نہ کوئی تو مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا ہی لے گا۔ اس طرح اٹلی کی وادیاں جنگل اور راستے میں پڑنے والے سارے شہر اور قصبے بھی دیکھ لوں گا اور کرایہ خرچ کیے بغیر وینس پہنچ جاؤں گا۔

وینس کو روانگی

یہ پروگرام مجھے بہت پسند آیا۔ میں نے وقت دیکھا، دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ سڑکوں پر سائن بورڈ اطالوی زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ مگر میں اپنا مطلب نکال لیتا تھا۔ میں ریستوران سے نکل پڑا۔ سفری تھیلا میں نے پیٹھ پر باندھ رکھا تھا جو ذرا ہلکا تھا۔ اس میں ایک گرم کمبل اور قمیض پتلون کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ گرم کمبل مجھے مال بردار جہاز کے کیپٹن نے بطور تحفہ دیا تھا جو بہت عمدہ قسم کا تھا۔ رات کو ٹھنڈ ہو جاتی تھی۔ میں یہی کمبل اوڑھ کر سوتا تھا۔ میں اندازے سے شمال کی طرف سڑک کے فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا۔ ہائی وے کا حدود اربعہ میں نے ہوٹل والوں سے ہی پوچھ لیا تھا۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے بھی میں نے ایک دو آدمیوں سے پوچھ لیا تھا۔ آخر میں شہر کے باہر سے گزرنے والی ہائی وے پر آ گیا۔ یہ کافی چوڑی سڑک تھی۔ چار لین تھی۔ دو شمال کی طرف اور دو جنوب کی طرف جاتی تھی۔ میں ہائی وے سے تھوڑا ہٹ کر شمال کی طرف چل پڑا۔ میں بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا کہ اگر مجھے لفٹ ملنے میں دیر بھی ہو جائے تو تھکاوٹ نہ ہو۔ پیچھے سے گاڑیاں بڑی تیز رفتاری سے آ رہی تھیں اور شوں کی آواز کے ساتھ آگے نکل جاتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس سے لفٹ مانگوں۔ انگریزی فلموں میں میں نے لفٹ لینے کا طریقہ دیکھا ہوا تھا۔ مگر میں ابھی پیدل ہی چلنا چاہتا تھا۔ جب میں شہر سے کافی دور نکل آیا اور سرسبز وادیوں اور چھوٹے چھوٹے سرسبز ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تو میں سڑک کے کنارے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ جو گاڑی آتی، میں ہاتھ کا مخصوص اشارہ کرتا، جس کا مطلب تھا کہ میں ٹورسٹ ہوں اور مجھے اگلے پڑاؤ تک کے لیے لفٹ چاہیے۔ کسی نے پروا نہ کی۔ گاڑیاں پیچھے سے آ کر گزرتی رہیں۔ میرا ہاتھ تھک گیا۔ میں نے دل میں ان گاڑی والوں کو پنجابی میں گالیاں دیں اور پیدل ہی چلنا شروع کر دیا۔ میں نے سوچا کہیں میں نے غلطی تو نہیں کی۔ ہو سکتا ہے یہاں سیاحوں کو لفٹ دینے کا رواج ہی نہ ہو۔ میں کہاں تک پیدل چل سکوں گا۔ میں سڑک کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

ابھی میں تارنتو شہر سے زیادہ دور نہیں آیا تھا کہ واپس نہ جا سکوں۔ سوچنے لگا کہ اس سے تو بہتر ہے کہ میں بحری جہاز میں سفر کرتا، پیسے خرچ

ہوتے ہیں تو ہو جائیں' کم از کم پیدل چلنے سے تو نجات مل جائے گی۔ آخر میں کب تک اور کہاں تک پیدل چل سکوں گا۔ کہیں بیمار پڑ گیا تو یہاں تو کوئی پرسانِ حال بھی نہیں ہے۔ یہ سوچ کر میں اٹھا اور واپس چلنے لگا۔ دوپہر ڈھلنے لگی تھی۔ میں ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ دور سے ایک بہت بڑا ٹرک آتا نظر آیا۔ میں نے ٹرک کو دیکھتے ہی اسے اشارہ کیا۔ ٹرک میرے قریب سے گزر گیا۔ میں ٹرک ڈرائیور کو گالی دینے ہی والا تھا کہ ٹرک تھوڑی دور جا کر رک گیا۔ میں بڑا خوش ہوا اور ٹرک کی طرف دوڑ پڑا۔ ٹرک ڈرائیور ایک بھاری جسم والا اطالوی بوڑھا تھا' جس کی ڈاڑھی کے سفید بال بڑھے ہوئے تھے۔ اس نے سر پر کالی کنڈوروی ٹوپی ترچھی کر کے جمائی ہوئی تھی۔ منہ میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ سامنے لگے شیشے میں سے اس نے مجھے آتا دیکھ کر اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ میں ٹرک پر چڑھ کر سیٹ پر بیٹھ گیا اور انگریزی میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ بوڑھے ٹرک ڈرائیور نے کوئی جواب نہ دیا۔

ٹرک آگے چل پڑا۔ کچھ دور جا کر ٹرک ڈرائیور نے کہا: "میرا نام اوتارو ہے۔۔۔۔۔۔۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

میں نے اسے اپنا نام بتایا۔ وہ چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد بولا۔ "تم انڈین ہو؟"

میں نے کہا "نہیں' میں پاکستانی ہوں۔"

وہ شکستہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے پاکستان کے بارے میں پوچھا۔

میں نے اسے مختصر الفاظ میں بتایا کہ پاکستان ایک آزاد اسلامی ملک ہے جو انڈیا کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ ساتھ ہی میں نے اسے تھوڑا سا سیاسی پس منظر بھی بتایا۔ وہ بے توجہی سے سنتا رہا۔ اس نے آگے سے کوئی بات نہ کی۔ ٹرک ایک خاص رفتار سے ہائی وے پر چلتا رہا۔ کافی وقفے کے بعد اوتارو نے کہا۔ "میں سان مارینو جا رہا ہوں' تم کہاں جاؤ گے؟"

"وینس" میں نے جواب دیا۔

ٹرک ڈرائیور نے سگریٹ کھڑکی سے باہر پھینک کر کہا۔ "سان مارینو تک بڑا لمبا سفر ہے' میں تمہیں رات کو اپنے ٹرک پر سونے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں' میں کسی درخت کے نیچے سو جاؤں گا۔ میرے پاس کمبل ہے۔"

وہ "ہوں" کہہ کر خاموش ہو گیا۔ کوئی دو گھنٹے بعد ایک ساحلی شہر آیا جس کا نام Bari تھا۔ ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ یہاں وہ دو گھنٹے رکے گا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا میں ٹرک سے دور چلا جاؤں؟"

وہ ہنس پڑا۔ اس کے دانت کالے ہو رہے تھے۔ کہنے لگا۔ "نہیں' تم چاہو تو ٹرک میں ہی بیٹھے رہو۔ چاہو تو باری شہر کی سیر کرو۔"

باری ایک پہاڑی قصبے کی قسم کا شہر تھا۔ پہاڑی کے دامن میں دور ڈھلانوں پر سرخ چھتوں والے مکان ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ

بجے ہوئے تھے۔ ٹرک ایک منڈی میں جا کر رکا تو جہاں بڑا شور تھا۔ میں ٹرک سے اتر آیا۔ ادھر ادھر پھرنے لگا۔ بوڑھے ڈرائیور نے مجھے بتا دیا تھا کہ ٹھیک دو گھنٹے بعد آ جانا' نہیں تو میں تمہارے بغیر ہی چل پڑوں گا۔ میں یہ خطرہ مول نہ لینا چاہتا تھا کیونکہ مجھے سان مارینو تک مفت سفر کرنے کا بڑا سنہری موقع مل گیا ہوا تھا۔ چنانچہ میں ٹرک کے آس پاس ہی منڈی کے گوداموں اور کوٹھڑوں کے آس پاس ہی پھرتا رہا۔ پھر ایک گھٹیا سے ریستوران کے باہر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اطالوی بیرے نے آ کر اطالوی زبان میں پوچھا کہ مجھے کیا چاہیے۔ الفاظ میری سمجھ میں نہ آئے لیکن ظاہر ہے اس نے یہی پوچھا ہوگا۔ میں نے کہا۔ ''کافی''

وہ واپس چلا گیا۔ پھر ایک مگ میں کافی بھر کر لے آیا اور میز پر زور سے رکھ کر چلا گیا۔ کافی بلیک تھی۔ میرا دل دودھ والی کافی پینے کو چاہ رہا تھا۔ مگر مجھے اطالوی زبان میں دودھ کے لیے جو لفظ تھا وہ معلوم نہیں تھا۔ بیرا ایک بار میرے قریب سے گزرا تو میں نے Milk کا نام لیا۔ وہ ہنس کر آگے نکل گیا۔ خدا جانے وہ کیا سمجھا تھا' کیونکہ اس کے بعد وہ دودھ لے کر بالکل نہ آیا۔

اسی طرح وقت گزر گیا۔ میں نے اطالوی سگریٹوں کا ایک پیکٹ خریدا۔ یہ سگریٹ بڑے سستے تھے اور بڑے سخت تھے۔ شاید یہ بندرگاہوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور پیتے تھے۔ ایک کش لگایا تو نانی یاد آ گئی۔ میں آدھ گھنٹہ پہلے ٹرک کی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ ٹرک ڈرائیور ٹرک کا پچھلا دروازہ کھول کے لکڑی کی پیٹیاں اتروا رہا تھا اور نئے کریٹ لدوا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے ٹرک باری شہر سے روانہ ہوا۔ یہ سارے کا سارا پہاڑی علاقہ تھا۔ اور ٹرک پہاڑی ٹیلوں کا چکر کاٹ کر جا رہا تھا۔ شام کے سائے پھیلنے شروع ہو گئے۔ سردی محسوس ہونے لگی۔ مگر میری جیکٹ نے مجھے کافی حد تک سردی سے بچایا ہوا تھا۔ پھر سورج شمالی اٹلی کے پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو گیا اور وادیوں میں اندھیرا چھا گیا۔ ٹرک کی ہیڈ لائٹس روشن ہو گئیں۔

ٹرک سڑک پر چلتا گیا۔ کوئی آدھی رات کے قریب راستے میں ایک قصبہ آیا جہاں ڈرائیور نے ٹرک ایک چھوٹے سے اڈے کے احاطے میں کھڑا کر دیا۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''سینورا یہاں میں رات ٹھہروں گا' تم جہاں چاہو جا کر سو جاؤ' میں ٹرک لاک کر رہا ہوں۔''

میں ٹرک سے اتر گیا۔ میں نے دوسری طرف جا کر ڈرائیور سے پوچھا کہ وہ صبح کس وقت روانہ ہوگا۔ اس نے تھکے ہوئے لہجے میں صرف اتنا کہا۔ ''دس بجے آ جانا۔''

وہاں قریب ہی ایک پٹرول پمپ تھا جہاں بڑی روشنی ہو رہی تھی۔ رات کے وقت کافی ٹھنڈ ہو گئی تھی۔ اگرچہ یہ بہار کا موسم تھا مگر معلوم ہوا کہ یورپ میں موسم بہار میں بھی راتیں کافی سرد ہوتی ہیں۔ میں رات گزارنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کرنے لگا۔ ایک طرف مجھے ایک کاؤنٹر سا بنا ہوا نظر آیا۔ یہ شاید کسی سبزی یا پھل فروش کا کاؤنٹر تھا۔ ٹریش میں سے باسی سیبوں کی بو آ رہی تھی۔ کاؤنٹر لکڑی کا تھا جس کے پیچھے کھڑے ہونے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ یہ کوئی دو فٹ چوڑی اور سات فٹ لمبی جگہ تھی۔ یہاں ہلکی ہلکی گرمائش بھی تھی۔ سونے کے لیے اس

سے بہتر جگہ مجھے اور کہیں نہیں مل سکتی تھی۔ میں نے تھیلے میں سے کمبل نکالا۔ تھیلے کا تکیہ بنایا، کمبل اوپر لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میری آنکھوں میں لاہور شہر کے بازاروں اور گلی کوچوں کی تصویریں پھرنے لگیں۔ لاہور کی یاد نے نیند غائب کر دی۔ مگر میرے سر پر وینس شہر دیکھنے اور وہاں کی کسی سنہری بالوں والی لڑکی سے رومانس لڑانے کا بھوت سوار تھا۔ میں کیسے ابھی لاہور واپس جا سکتا تھا۔ پس لاہور کے خیال کو دل سے نکال دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی میں غنودگی کے عالم میں ہی تھا کہ اچانک کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے سوچا کوئی چوکیدار قسم کا آدمی ہوگا، گزر جائے گا۔ مگر قدموں کی آواز کاؤنٹر کے پاس آ کر رک گئی۔ یہاں اندھیرا تھا۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کہ اچانک کسی نے میرے اوپر کمبل پھینک دیا۔ ابھی میں سنبھل ہی رہا تھا کہ کسی نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جو میرے اوپر گرا تھا وہ بھی گھبرا گیا اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ یہ ایک عورت تھی۔

جرمن لڑکی

وہاں اتنا بھی اندھیرا نہیں تھا۔

میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی جلدی سے پیچھے ہٹی اور کسی اجنبی زبان میں مجھے کچھ کہنے لگی۔ میں نے انگریزی میں سوری کہی تو وہ مسکرائی اور پھر زور سے ہنس پڑی۔ یہ ایک لڑکی تھی جس کی آنکھیں نیم اندھیرے میں بلوروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس کے سیدھے بال کھلے تھے۔ ماتھے پر اس نے ایک پٹی باندھی ہوئی تھی۔ بدن پر جیکٹ اور جینز تھی۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔

"میں سمجھی تھی یہ جگہ خالی ہے۔ میں ٹورسٹ ہوں، میرا نام ہلڈا ہے۔ میں انڈیا سے آ رہی ہوں، واپس برلن جا رہی ہوں۔ ۔۔۔۔۔۔ کیا تم بھی ٹورسٹ ہو؟"

اس جرمن ٹورسٹ کا ایک پہلو میرے جسم کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اس کے جسم کی گرمی مجھے سکون بخش رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"میں ٹورسٹ ہوں، وینس جا رہا ہوں، پاکستان سے آیا ہوں۔"

"پاکستان ۔۔۔۔۔؟" وہ بے اختیار پکار اٹھی۔ "میں نے وہاں کی سیر کی ہے ۔۔۔۔۔۔ اوہ گاڈ ۔۔۔۔۔۔ بیوٹی فل لوگ"

وہ اپنا کمبل اپنے جسم کے گرد لپیٹتی ہوئی کہنے لگی۔

"کیا میں تمہارے ساتھ یہاں سو جاؤں، میرا مطلب ہے تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔

"بے شک سو جاؤ۔"

وہ جمائی لے کر بولی۔ "میں بہت تھک گئی ہوں۔"

اور وہ میری ٹانگوں کی طرف سر کر کے کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ اس کا آدھا جسم میرے آدھے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ وہ سو گئی تھی مگر میری نیند اڑ چکی تھی۔ خدا جانے کس وقت رات کو مجھے بھی نیند آ گئی۔ آنکھ اس وقت کھلی جب دھوپ کاؤنٹر کے اوپر پھیل چکی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ لڑکی وہاں نہیں تھی۔ میں کمبل اور تھیلا سمیٹ کر کاؤنٹر پر آ گیا۔ سورج کافی نکل آیا تھا۔ کچھ فاصلے پر جو ہائی وے تھی اس پر گاڑیاں شوں شوں کرتی گزر رہی تھیں۔ پٹرول پمپ کی طرف ایک جگہ دو عورتیں کھڑی شاید بس کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے سروں پر رنگ برنگے ریشمی رومال باندھے ہوئے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ میں نے کمبل تہہ کر کے تھیلے میں رکھا۔ تھیلا کاندھے پر لٹکایا اور اس طرف چل پڑا جہاں بوڑھے ڈرائیور نے رات کو اپنا ٹرک کھڑا کیا تھا۔ ٹرک اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ ڈرائیور غائب تھا۔

میں نے ٹرک کے گرد ایک چکر لگایا۔ ٹرک کی دونوں کھڑکیاں بند تھیں۔ پٹرول پمپ کے ساتھ ہی ایک باتھ روم تھا جہاں ایک دروازے پر مرد کے جوتے کی اور دوسرے دروازے پر عورت کے سینڈل کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ مجھے پاکستان ریلوے کے دیہاتی ریلوے اسٹیشنوں کے باتھ روم یاد آ گئے جو ٹین کی چادروں کے بنے ہوتے تھے اور جہاں عورتوں والے باتھ روم کے باہر ایک عورت کی تصویر بنی ہوتی تھی جس نے ہاتھ میں جھاڑو پکڑ رکھا ہوتا تھا۔ اسی طرح مردوں والے حصے میں مرد کی تصویر بنی ہوتی تھی اور مرد کے ہاتھ میں بھی جھاڑو تھمایا گیا ہوتا تھا۔ میں مسکراتا ہوا مردانہ باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ باتھ روم میں ایک رنگ آلود ٹب بھی تھا۔ اس میں بیٹھ کر جس طرح سے بھی نہا سکتا تھا، نہایا۔ شیو بنائی، تھیلے میں سے دوسری قمیض اور جینز نکال کر پہنی اور واپس اپنے ٹرک کے پاس آ گیا۔ میری آنکھیں ڈرائیور کے علاوہ اس جرمن ٹورسٹ لڑکی کو بھی ڈھونڈ رہی تھیں جس نے میری ساری رات برباد کر دی تھی مگر وہ تو جیسے کسی چڑیل کی مانند غائب ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی چڑیل ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ اٹلی میں چڑیلیں ہوتی ہیں اور خوبصورت لڑکیوں کا روپ بدل کر آتی ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ اٹلی کی سنہری بالوں والی لڑکی اگر چڑیل کے روپ میں بھی میرے پاس آ جائے تو میں اسے جانے نہیں دوں گا۔ میں بھوت بن جاؤں گا۔ ہم لوگ آدھے بھوت تو پہلے ہی ہوتے ہیں۔

پٹرول پمپ کے پاس ہی ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ تھا۔ میں نے وہاں بریڈ اور کافی کا ناشتہ کیا۔ سگریٹ سلگا کر ٹائم دیکھا۔ ابھی دس نہیں بجے تھے۔ بوڑھے ڈرائیور نے مجھے دس بجے آنے کو کہا تھا۔ مگر ٹرک ڈرائیور اطالوی نہیں تھا شاید۔ یا شاید اطالوی ہی تھا۔ میں اس کی قومیت کا تعین نہیں کر پایا تھا کہ وہ مجھے ایک طرف سے سگریٹ پیتا ہوا اسی طرح چلتا نظر آ گیا۔ میں دوڑ کر ٹرک کے پاس آ گیا۔ اس نے مجھے دیکھا اور مسکرایا۔ بولا کچھ نہیں۔ ٹرک میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اپنی کھڑکی کی طرف سے ٹرک میں داخل ہونے کے بعد اس نے میری کھڑکی کو کھول دیا۔ میں ٹرک کے بمپر پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھ کر ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے انجن سٹارٹ کیا۔ گاڑی

کو گیئر میں ڈالا اور ریس دینے لگا۔ جب انجن اس کی مرضی کے مطابق گرم ہو گیا تو ٹرک کو چلا دیا۔

اس طرح راستے میں ہمیں ایک اور رات بسر کرنی پڑی۔ دوسری رات میں نے ٹرک کی چھت کے اوپر لیٹ کر گزاری۔ اس کی میں نے خاص طور پر منت سماجت کر کے ڈرائیور سے اجازت لے لی تھی۔ رات کو سردی بھی تھی اور اوس بھی پڑ رہی تھی مگر کمبل بڑا گرم تھا۔ اس نے مجھے سردی سے بچائے رکھا۔ تیسرے دن شام کے وقت ہمارا ٹرک سان ماریو پہنچ گیا۔ یہاں ٹرک ڈرائیور مجھ سے جدا ہو گیا۔ جاتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔

"یہاں سے آگے تم بلوگنا جاؤ گے بلوگنا سے وینس تک سٹیمر چلتے ہیں۔ سٹیمر میں سفر کرنا اور ہاں اب تم اٹلی میں ہو ہوشیار رہ کر چلنا پھرنا' یہاں تمہارے ساتھ کوئی بھی حادثہ پیش آ سکتا ہے۔"

سان ماریو

بوڑھا ڈرائیور ہنستا ہوا ٹرک میں بیٹھ کر سان ماریو شہر میں داخل ہو گیا۔ میں شہر کے پرانے دروازے کے باہر ایک سنگی مجسمے کے پاس کھڑا تھا۔ یہ کافی بڑا شہر تھا۔ ہر طرف ماڈرن بلڈنگیں تھیں۔ شہر کی روشن روشن سڑکوں پر خوش لباس عورتیں اور مرد تیز تیز قدموں سے جا رہے تھے۔ سکوٹر اور گاڑیاں وغیرہ بھی چل رہی تھیں۔ ایک خالی ٹیکسی میرے قریب سے گزر گئی۔ عورتوں کا حسن زیادہ تر مشرقی تھا۔ یعنی اکثر عورتوں اور لڑکیوں کے بال سیاہ اور آنکھیں بھی سیاہ تھیں۔ رنگ اگرچہ گورے تھے۔ مجھے قدیم رومن ایمپائر کا دور یاد آ گیا۔ مگر اٹلی کے اس ماڈرن شہر میں رومن ایمپائر کے زمانے کی کوئی بھی نشانی باقی نہیں تھی۔ یہاں صرف ایک شکستہ پرانا دروازہ تھا جو پرانی گیٹ کے دروازے سے ملتا جلتا تھا اور جس کے محرابی ستون کے پاس میں کچھ حیران کچھ پریشان کھڑا تھا۔ پریشان اس لیے کہ مجھے خیال آنے لگا تھا کہ اتنے ماڈرن شہر میں مجھے رات بسر کرنے کے لیے کوئی سستا ہوٹل کہیں نہیں ملے گا۔ نیون سائن کی کمپنیوں کے تھے ان میں شراب اور کوکا کولا کے نیون سائن سب سے نمایاں اور سب سے زیادہ بھڑکیلے تھے۔ دو لڑکیاں جو نیم عریاں لباس میں تھیں اور گہرا میک اپ کیا ہوا تھا' میرے قریب سے گزریں تو انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ایک لڑکی نے ہاتھ سے کچھ اشارہ بھی کیا۔ مگر دونوں میں سے کسی لڑکی کے بھی بال سنہری نہیں تھے اور یہ وینس کی لڑکیاں نہیں تھیں۔

میں روشنیوں سے جگمگاتے ہوئے فٹ پاتھ پر ایک طرف چل پڑا۔ یہ سوچ کر کہ شاید اس فیشن ایبل خوش پوش علاقے کے آگے مڈل کلاس کے لوگوں کی کوئی بستی ہو جہاں مجھے سستا سا ہوٹل مل جائے اور میں رات بسر کروں۔ چلتے چلتے میں ایک پارک کے قریب سے گزرا تو رک گیا۔ پارک بالکل خالی تھا۔ کیونکہ رات ہو گئی تھی اور اوس گرنے لگی تھی جس کی وجہ سے موسم سرد ہو گیا تھا۔ پارک کا گیٹ بند تھا۔ مجھے دور لیمپ پوسٹ کی روشنی میں ایک خالی بنچ نظر آ گیا۔ یہ جگہ رات بسر کرنے کے لیے موزوں تو نہیں تھی مگر پارک میں کوئی دوسری جگہ بھی میسر آ

سکتی تھی۔ میں ایک جگہ سے گارڈینیا کی باڑ پھلانگ کر پارک میں داخل ہو گیا۔ ایک جگہ درختوں کا جھنڈ تھا۔ یہاں اوس نہ گرنے کی وجہ سے فضا میں کچھ گرماہٹ تھی۔ ایک خالی بنچ بھی تھا۔ یہ رات بسر کرنے کے لیے آئیڈیل جگہ تھی۔ میں نے بنچ کا انتخاب کر لیا اور واپس چوک میں آ گیا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ جگہ جگہ ریستوران تھے مگر مجھے معلوم تھا کہ یہاں مجھے سستا کھانا نہیں ملے گا۔ میں سڑک پار کر کے دوسرے فٹ پاتھ پر آیا تو ایک جگہ بڑی سی چھتری تانے ایک آدمی برگر بیچ رہا تھا۔ میری روح خوش ہو گئی۔ یہ اطالوی برگر تھے جس کی تعریف میں نے بہت سن رکھی تھی۔

برگر واقعی بڑے مزیدار تھے اور سستے بھی تھے۔ میں نے خوب مزے لے لے کر برگر کھائے۔ وہاں کافی بھی چل رہی تھی، کافی کا ایک مگ پیا، سگریٹ سلگایا اور ٹہلتا ٹہلتا پارک کی باڑ کے پاس آ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کوئی چوکیدار تو نہیں مجھے دیکھ رہا۔ جب وہاں مجھے کوئی گارڈ نظر نہ آیا تو میں باڑ پھلانگ کر پارک میں داخل ہو گیا۔ سیدھا درختوں کے نیچے خالی بنچ پر آ کر تھیلے کا تکیہ بنایا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ کہتے ہیں رات کو درختوں کے نیچے نہیں سونا چاہیے مگر میں پردیس میں تھا اور بے سرو سامانی کے عالم میں سفر کر رہا تھا۔ درختوں کے نیچے زیادہ سردی نہیں تھی۔ مجھے جلدی نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو پارک میں سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ایک باوردی گارڈ میرے پاس آ کر کہنے لگا۔

”میں نے تمہیں جگایا نہیں، تم ٹورسٹ ہو، ٹورسٹ ہمارے ملک کو زرِ مبادلہ دیتے ہیں...... اب جاگ پڑے ہو تو یہاں سے چلتے بنو، پارکوں میں سونا منع ہے۔“

وہ صاف انگریزی بول رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”سینور! کیا تم مجھے بتا سکو گے کہ بلوگنا شہر کے لیے یہاں سے سٹیمر کب روانہ ہوتے ہیں۔ وہاں کا کرایہ کتنا ہے؟“

گارڈ کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ڈنڈا تھا۔ اس نے ڈنڈا گھما کر اپنی کنپٹی کے ساتھ لگایا اور گردن ٹیڑھی کر کے مجھے دیکھنے لگا۔

”تم ٹورسٹ ہو، ظاہر ہے تمہارے پاس اتنے فالتو ڈالر نہیں ہوں گے کہ سٹیمر کا کرایہ برداشت کر سکو۔ تم وہی کرو جو دوسرے ٹورسٹ کرتے ہیں۔“

اس اطالوی گارڈ نے مجھے وہی طریقہ بتایا جس پر میں اب تک عمل کرتا آیا تھا یعنی ہچ ہائیکنگ یعنی مفت لفٹ لے کر ہائی وے پر سفر کرنا۔ میں تھیلا کندھے پر ڈال کر پارک سے نکل آیا۔ میرے پاس ڈالر نہیں تھے پھر بھی میں پوچھتا پوچھتا شٹل بس میں سفر کرتا ہوا ساحل ریجیو کی بندرگاہ پر جا پہنچا۔ میں نے معلوم کیا تو گارڈ کی بات درست نکلی۔ سٹیمر کے تھرڈ کلاس کا کرایہ بھی بہت زیادہ تھا۔ میں نے سٹیمر میں سفر کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور ایک بار پھر ہائی وے پر آ گیا۔ وہاں ایک پٹرول پمپ کے باتھ روم میں گھس کر منہ ہاتھ دھویا۔ وہیں ایک کینٹین پر ناشتہ کیا اور ہائی وے کے کنارے بلوگنا شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

چند قدم چل کر میں رک کر پیچھے دیکھتا۔ پیچھے سے جو گاڑی آ رہی ہوتی اسے انگوٹھے کا اشارہ کرتا۔ مگر کوئی گاڑی نہ رکتی۔ میں کوئی ایک گھنٹے تک چلتا رہا۔ آخر ایک پھٹیچر قسم کے ٹرک کے ڈرائیور نے مجھے لفٹ دے دی۔

یہ ادھیڑ عمر کا اطالوی اپنے گھر کا سامان لے کر بلوگنا جا رہا تھا۔ اس کے سامان میں مرغیوں کے ڈربے بھی تھے۔ یہ بڑا باتونی شخص تھا۔ سارا راستہ اطالوی بول بول کر میرے کان کھاتا رہا۔ اب میں تھوڑی اطالوی زبان سمجھنے لگا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ شکستہ انگریزی بھی بول لیتا تھا۔ میں ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ یہ اٹلی کا ساحلی علاقہ تھا۔ بڑا سرسبز تھا۔ ٹرک چھوٹے بڑے ہرے بھرے ٹیلوں کی شاداب وادیوں میں سفر کر رہا تھا۔ ہوا میں سبزے کی مہک تھی۔ تیسرے پہر ٹرک بلوگنا پہنچ گیا۔ یہ کافی بارونق اور بڑا شہر تھا۔

بلوگنا

بلوگنا شہر کی تاریخ بھی وینس کی طرح بڑی پرانی ہے۔ وینس میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا تھا اور بلوگنا میں چودھویں صدی عیسوی کے دانشوروں اور سائنس دانوں نے نشاۃ ثانیہ کی راہیں ہموار کی تھیں اور اندلس میں عربوں نے یونانی کلاسیکل کتابوں کے یونانی زبان سے عربی میں ترجمے کئے تھے بلوگنا کے ان دانشوروں نے انہیں لاطینی زبان میں منتقل کیا تھا۔ یہ انہی دانشوروں کی محنت کا نتیجہ ہے کہ یورپ میں احیائے علوم کی تحریک شروع ہوئی۔ بلوگنا شہر شیشہ سازی اور فرنیچر بنانے کے فنون میں بھی بڑا مشہور تھا۔ میں شام ہونے تک بلوگنا شہر کے بازاروں میں گھومتا پھرتا رہا۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ اٹلی میں مشرقی تہذیب اور کلچر کے اثرات بڑے نمایاں تھے۔ کوئی شہر ایسا نہیں تھا کہ جہاں دوسری عمارتوں کے ساتھ ساتھ تنگ و تاریک اونچی نیچی گلیاں نہ ہوں۔ ان گلیوں میں اطالوی عورتیں اپنے اپنے مکان کے تھڑوں پر بیٹھی اونچی آواز میں باتیں کرتی نظر آتیں۔ گلی کے مکانوں کے درمیان تار باندھ کر کپڑے سکھانے کے لیے ڈالے ہوئے تھے۔ مکانوں کی طرز تعمیر بھی مشرقی تھی۔ گیلریوں میں پھولوں کے گملے رکھے ہوئے تھے۔ لکڑی کے تختے آگے کو بڑھے ہوئے تھے۔ بچے گلیوں میں کانچ کی گولیاں کھیلتے بھی نظر آئے اور فٹ بال بھی۔ چھوٹے ریستورانوں سے گرم مصالحوں کی مہک بھی آتی تھی۔ بلوگنا شہر اگرچہ بہت بڑا اور ماڈرن شہر تھا مگر یہاں تنگ و تاریک گلیوں والے علاقے بھی تھے جہاں اونچی نیچی گلیوں کے فرش ٹوٹے ہوئے تھے۔ عورتیں کھلے گریبانوں والے فراک پہنے مکانوں کے آگے بیٹھی سگریٹ پی رہی تھیں۔ میں نے ان علاقوں کی خوب آوارہ گردی کی۔

اتنے میں شام کا اندھیرا پھیلنے لگا اور مکانوں میں روشنیاں ہو گئیں۔ میں ایک نیم روشن گلی سے نکل کر ایک اونچی جگہ پر آگیا۔ یہاں کسی شخص کا بہت بڑا مجسمہ لگا ہوا تھا۔ یہاں سے دائیں اور بائیں شہر کی روشنیوں کا منظر اتنا دلفریب تھا کہ میں وہیں مجسمے کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ جب بھوک نے تنگ کیا تو وہیں شہر کی ایک گلی میں آ کر دھمکا اور گرم مصالحوں کی خوشبو سے بھرے ہوئے

ریستوران کے باہر بیٹھ کر ایک پیزا کھایا۔ کافی پی اور رات بسر کرنے کے لیے ٹھکانے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

غنڈے میرے پیچھے

میں ایک گلی میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے تین نوجوانوں کو دیکھا جو اپنے لباس اور شکل وصورت سے ہی غنڈے لگتے تھے۔ وہ دیوار کے پاس کھڑے سگریٹ پی رہے تھے اور مجھے مسلسل اپنی طرف آتا دیکھ رہے تھے۔ جب میں ان کے قریب سے گزرا تو ایک لڑکے نے اطالوی زبان میں کچھ کہا۔ میں ان کی طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرایا اور آگے گزر گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ لڑکے میرے پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔ میں گھبرا گیا۔ مجھے بوڑھے ترک ڈرائیور کی نصیحت یاد آگئی اس نے کہا تھا۔ "یہاں ہوشیار رہنا تمہارے ساتھ کسی بھی وقت کوئی حادثہ پیش آسکتا ہے۔"

اتنے میں تینوں غنڈے لڑکے میرے سر پر پہنچ گئے۔ ایک نے میرا تھیلا پکڑ کر مجھے پیچھے کھینچا اور ہنس کر دوسرے سے کچھ کہا۔ دوسرے لڑکے نے میری جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو میں نے ان دونوں کو زور سے دھکا دیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ خطرہ تھا کہ پیچھے سے کہیں وہ مجھ پر فائر نہ کر دیں۔ مگر شاید ان کے پاس پستول وغیرہ نہیں تھے۔ گلیاں پیچ دار تھیں۔ مجھے ان گلیوں کا بھی پتہ نہیں تھا کہ کدھر جاتی ہیں۔ میں بھاگتا چلا گیا۔ غنڈے بھی میرے پیچھے بھاگتے آرہے تھے۔ میں ایک گلی کا موڑ گھوم کر دوسری گلی میں آیا تو میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ گلی آگے سے بند تھی۔ آگے کوئی دس پندرہ فٹ اونچی پتھر کی دیوار تھی۔ کونے والے مکان کے باہر لیمپ پوسٹ پر روشنی ہو رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ ہی کوڑے کرکٹ والا ٹرش کین پڑا تھا۔ غنڈے اب گلی کا موڑ گھوم کر میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا لیمپ پوسٹ کی روشنی میں مجھے ایک غنڈے کے ہاتھ میں چمکتا ہوا چاقو نظر آیا۔

قصہ ایک عورت کا

میں جلدی سے ٹرش کین پر چڑھا اور اچھل کر دیوار کے کنارے کو پکڑا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ میں اٹھ کر بھاگنے لگا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں ایک مکان کے صحن میں آگیا ہوں۔ میرے چھلانگ لگاتے ہی ایک عورت کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ میں نے دیکھا ایک بھاری بدن والی عورت ہاتھ میں تام چینی کا تسلہ تھامے صحن میں کھڑی تھی۔ میں نے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے جلدی جلدی انگریزی میں بتایا کہ میں ٹورسٹ ہوں میرے پیچھے غنڈے لگے ہوئے ہیں۔ اس عورت نے کمرے کے ادھ کھلے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "گو" میں تیزی سے کمرے میں گھس گیا۔ اس دوران غنڈے گلی کی دیوار کے اوپر آگئے تھے۔ مجھے اس عورت کی تیز تیز بولنے کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ اطالوی زبان میں انہیں گالیاں دے رہی تھی اور دہائیاں دے رہی تھی۔ اس کے بعد

باہر گلی میں خاموشی چھا گئی۔ اتنے میں وہ عورت کمرے میں آ گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور مسکرا کر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔

"تم خوش قسمت ہو بچ گئے۔۔۔۔۔۔۔ یہاں سے کوئی ٹورسٹ بچ کر نہیں جاتا۔۔۔۔۔۔۔ تم کہاں سے آئے ہو؟"

کمرہ چھوٹا سا تھا۔ ایک کمزور بلب روشن تھا۔ زمین پر گھسا پٹا پرانا قالین بچھا تھا۔ کونے میں چھوٹی سی گول میز کے ساتھ سٹول پڑا تھا جس کے پاس ہی تام چینی کی ایک چائے دانی اور چینی کے دو تین جگ پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں پر گلابی رنگ کے کاغذ منڈھے ہوئے تھے۔ ایک جانب دیوار پر کسی ایکٹریس کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ کمرے میں عجیب قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ پرانا پلنگ بچھا تھا جس پر کچھ پرانے کپڑے اور کمبل بے ترتیبی سے پڑا تھا۔ میں ابھی تک کمرے میں کھڑا تھا۔ میں نے اس عورت کا شکریہ ادا کیا۔ اب میرا سانس درست ہو چکا تھا۔ میرا تھیلا ابھی تک میری کمر کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ عورت نے خالی تسلا میز کے نیچے رکھ دیا اور میرے قریب آ کر مجھے عجیب نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس کے جسم سے بھی وہی بو آ رہی تھی جو سارے کمرے کی فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے میز کے پاس رکھی لوہے کی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں بیٹھ جاؤ۔ باہر گئے تو غنڈے تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

میں نے تھیلا اتار کر کرسی کے پاس ہی رکھ دیا اور خود کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے یہ عورت کچھ پراسرار سی لگ رہی تھی۔ لیکن میں اس کا ممنون احسان ضرور تھا کہ اس نے مجھے غنڈوں سے بچایا تھا۔ اگر وہ چاہتی تو مجھے ان غنڈوں کے حوالے بھی کر سکتی تھی۔ اس چھوٹے سے نیچی چھت والے کمرے میں ایک دروازہ تھا۔ عورت دروازے میں سے دوسری طرف چلی گئی۔ دروازہ ادھ کھلا تھا۔ دوسری طرف شاید کچن تھا۔ مجھے دیوار کے شیلف میں لگے چینی کے کچھ برتن اور ڈبے دکھائی دے رہے تھے۔ اندر سے عورت نے انگریزی میں کہا۔

"میں تمہارے لیے کافی بناتی ہوں۔۔۔۔۔۔۔ تم کچھ کھاؤ گے؟ میرے پاس تھوڑی مچھلی ہے۔"

میں نے آواز دے کر کہا۔ "شکریہ ریسٹورنٹ میں نے کھانا کھا لیا تھا۔"

"میں کافی بناتی ہوں ٹورسٹوں کی میزبانی کرنا ہمارا فرض ہے۔ تمہارے ذریعے ہمارا ملک بہت زرمبادلہ کماتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ تمہارے پاس کتنے ڈالر ہیں؟"

میں چونکا۔ میں نے سوچا کہ یہ عورت بھی مجھے لوٹنا چاہتی ہے۔ میں نے کہا۔ "دس ڈالر رہ گئے ہیں۔ تمہیں ضرورت ہے تو بے شک لے لو۔"

میں نے سوچا کہ ڈالر دے کر اس عورت سے جان بچانی چاہیے۔

کچن میں سے اس عورت کی آواز آئی۔

''ان ڈالروں کو سنبھال کر خرچ کرنا۔ تم کافی بے وقوف ٹورسٹ لگتے ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا تم انڈیا کے رہنے والے ہو؟''

میں نے جواب میں کہا۔

''نہیں سینورا! میں پاکستان سے آیا ہوں۔''

اس کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کچن سے نکلی تو اس کے ہاتھ میں دو مگ تھے جو کافی سے بھرے تھے۔ اس نے مگ میز پر رکھے اور دوسری کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ پیچھے ہاتھ ڈال کر اس نے پلنگ کے نیچے رکھا ہوا بسکٹوں کا ڈبہ نکالا اور پلیٹ میں بسکٹ رکھنے لگی۔ اس عورت کی عمر چالیس پینتالیس برس کی ہوگی۔ جسم بھاری تھا۔ اس کے فراک کا گریبان بھی وہاں کے فیشن کے مطابق کافی کھلا تھا۔ وہ میز پر دونوں کہنیاں رکھے ہاتھوں میں مگ تھامے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کافی کی چسکیاں لے رہی تھی اور مجھ سے کبھی اطالوی زبان میں اور کبھی شکستہ انگریزی میں باتیں بھی کر رہی تھی۔ (میں اس کی انگریزی کے شکستہ جملوں کا یہاں صاف اردو میں ترجمہ کر کے لکھ رہا ہوں) اب مجھے اس کے کپڑوں میں سے گوبھی کی بو آنے لگی تھی۔ اصل میں یہ اس کے جسم کی بو تھی جس نے سارے کمرے میں پھیل کر فضا کو بوجھل کیا ہوا تھا۔ میں کافی پیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر یہاں مجھے رات بسر کرنے کا موقع مل جائے تو کوئی برا نہیں۔ کیونکہ وہاں زیادہ دیر بیٹھنے سے گوبھی کی بو ہلکی پڑ چلی تھی میں نے رات بسر کرنے کی اپنی خواہش کا اظہار ابھی اس عورت سے نہیں کیا تھا کہ اس نے مگ میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''اب تم کہاں جاؤ گے۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا تم وائی ایم سی اے میں رہتے ہو؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا۔

''شاید مجھے رات کسی پارک میں بسر کرنی پڑے۔ میں آج ہی بلونیا میں وارد ہوا ہوں۔ مجھے وائی ایم سی اے کا کچھ پتہ نہیں۔''

وہ مسکرائی۔ اس نے میرے پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور لمبا کش لے کر نتھنوں سے دھواں چھوڑتے ہوئے ایک ہاتھ سے دھواں پرے ہٹاتے ہوئے بولی۔

''تم اگر چاہو تو یہاں میرے پلنگ پر رات بسر کر سکتے ہو۔ یہ کافی بڑا پلنگ ہے۔ میں بھی ایک طرف پڑ جاؤں گی۔''

مجھے گوبھی کی بو تیز محسوس ہوئی۔ وہ خالی مگ لے کر کچن میں گئی۔ اندر سے اس نے آواز دی۔

''تمہارے لیے اور کافی لاؤں؟''

میں نے کہا ''نہیں سینورا! تھینک یو۔''

جب وہ کچن سے باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں وائن کی بوتل تھی اور دوسرے ہاتھ میں شیشے کے دو چھوٹے گلاس تھے۔ اس نے

وائن کی بوتل میز پر رکھ دی اور کہا۔

”تم نے اطالوی وائن ضرور پی ہوگی۔ ہمارے ملک کے انگور یہاں کے انگوروں کے مقابلے میں بڑے کھٹے ہوتے ہیں اس لیے اس کی وائن بڑی اچھی بنتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں میں نے اطالوی وائن ابھی تک نہیں پی۔“

دراصل میں نے اس عورت کے آگے جھوٹ بولا تھا مگر جیسا کہ میں نے سفرنامے کے شروع میں آپ سے وعدہ کیا تھا میں آپ کے سامنے جھوٹ نہیں بولوں گا جب میں سے اٹلی کی سرحد میں داخل ہوا تھا میری کوئی رات ایسی نہیں گزری تھی کہ جس رات میں نے تھوڑی سی اطالوی وائن نہ چکھی ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اطالوی وائن کی بڑی تعریف سن رکھی تھی۔ وہ عورت حیرانی کے ساتھ بڑی بڑی کالی آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنے لگی۔

”سینور! تم بڑے بدقسمت ہو کہ تم نے ابھی تک ہمارے ملک کا مشروب مارٹینی نہیں چکھا۔ یہ تو ہمارا نیشنل مشروب ہے۔“

اور اس نے دونوں چھوٹے گلاس میز پر رکھے اور بوتل کا کاک کھول کر گلاسوں میں وائن انڈیلنے لگی۔ وائن کا رنگ گہرا سرخ تھا بالکل حنا کے عطر کی طرح۔ گلاسوں میں آتے ہی مارٹینی کی خوشبو میں گوبھی کی بو ملنا شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ان دونوں کا فرق بھی مٹ گیا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ حنا کے عطر کی خوشبو کہاں سے شروع ہوتی ہے اور گوبھی کی بو کہاں جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ میں ساری رات گوبھی کے کھیتوں میں پھرتا رہا جہاں کہیں کہیں حنا کی جھاڑیاں بھی رستے میں آ جاتی تھیں۔

گوبھی کے کھیت سے فرار

صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے میں نے تکیے میں ہاتھ ڈال کر اپنا پاسپورٹ دیکھا۔ خدا کا شکر ہے پاسپورٹ بھی موجود تھا اور میرے جو ڈالر باقی رہ گئے تھے وہ بھی موجود تھے۔ یہ عورت چور نہیں تھی لیکن مجھے اس عورت سے خوف آنے لگا تھا۔ میں اس سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر اس نے مجھے گھر میں بند کر دیا تھا۔ جب میں جانے کی بات کرتا تو وہ یہ کہہ کر مجھے ڈرا دیتی کہ اس رات والے غنڈے گھر کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اگر میں باہر نکلا تو وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر وہ عورت آدم خور تھی تو مجھے بھی اس کا شکار بننے کا شوق پڑ گیا تھا۔ آخر ایک دن تنگ آ کر میں نے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جب وہ مارکیٹ میں گوبھی وغیرہ خریدنے جاتی تو باہر مکان پر تالا لگا جاتی تھی۔ ایک دن وہ کسی کام سے باہر گئی تو میں کھڑکی کی جالیاں توڑ کر عقبی صحن میں سے فرار ہو گیا۔ اس وقت دن کے دس ساڑھے دس کا وقت ہو گا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے اور خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ بلونا شہر کی سڑکوں پر خوب چہل پہل تھی۔ میں نے ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور سے اطالوی سگریٹوں کا پیکٹ خریدا۔ ایک سگریٹ سلگایا اور بارونق سڑکوں پر چلتا پھرتا ہائی وے پر آ گیا۔ میرا ارادہ لفٹ لے کر وینس پہنچنے کا

تھا۔

اٹلی کے مضافات اتنے خوبصورت ہیں کہ ان مضافات کی سرسبز پہاڑیوں اور اونچی نیچی وادیوں میں خواہ مخواہ پیدل سفر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور پھر سفر میں جگہ جگہ پرانے تاریخی کھنڈرات دیکھنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ کئی جگہوں پر میں نے پہاڑیوں کے نشیب اور کھلے میدانوں میں ایسے ستون کھڑے دیکھے جن کی چھتیں غائب تھیں۔ سنگ مرمر کے مجسمے بھی دیکھے جن میں پان دیوتا اور وینس کے مجسمے بھی تھے۔ یہ مجسمے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے مگر ان کی کلاسیکل اور تاریخی شان بدستور قائم تھی۔ اس کے باوجود اٹلی میں پیدل سفر کرنا بہت ہی خطرناک ہے۔ اس وقت مجھے اس کا تجربہ نہیں تھا۔ حالانکہ مجھے بوڑھے ٹرک ڈرائیور نے خبردار بھی کیا تھا کہ یہ اٹلی ہے۔ یہاں قدم قدم پر ہوشیار رہنا ورنہ مارے جاؤ گے۔ میں نے اس کی نصیحت کو فراموش کر دیا تھا۔ اور اپنی رومانیت پسندی اور مہم جوئی کے جوش میں بلونیا سے لفٹ لے کر اور کچھ پیدل چل کر وینس پہنچنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کا نتیجہ جس قدر بھیانک نکلا اور میں موت کے منہ میں جا کر کیسے زندہ واپس نکلا؟ یہ آپ کو آگے چل کر بتاؤں گا۔

میں ایک بار پھر ہائی وے پر تھا۔ گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ ان میں خوبصورت ماڈرن کاریں بھی تھیں۔ دیوہیکل ٹرالر بھی تھے اور ٹرک بھی تھے۔ ایک کار میرے اشارے پر رک گئی۔ یہ بلیو پونٹیک کار تھی اور اسے ایک ادھیڑ عمر اطالوی چلا رہا تھا۔ کار گرین بیلٹ کے قریب آ کر رکی تھی۔ میں دوڑ کر پہنچا تو اس آدمی نے کھڑکی میں سے اپنا سر نکال کر انگریزی میں پوچھا۔ "تم ٹورسٹ ہو؟" میں نے کہا۔

"یس سر! میں ٹورسٹ ہوں۔ وینس جانا چاہتا ہوں۔"

وہ آدمی مسکرایا۔ چہرے کے خدوخال سے وہ کوئی خاندانی آدمی لگتا تھا۔ سر کے بال تھوڑے سفید تھے۔

آنکھیں نیلی تھیں اور اس نے اورنج کلر کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ کہنے لگا۔

"میں تمہیں پادوا تک پہنچا سکتا ہوں۔ میں وہیں رک جاؤں گا۔ آگے تم کسی اور سے لفٹ لے لینا ـــــــــ آ جاؤ۔"

میں شکریہ ادا کر کے اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ یہ شخص بڑی روانی سے انگریزی بول لیتا تھا۔ کہنے لگا۔

"بلونیا سے مدینی اور جھیل کے راستے وینس تک چھوٹے جہاز بھی جاتے ہیں۔ ان کا کرایہ زیادہ نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "مگر مجھے تو کسی نے ان کا کرایہ بہت زیادہ بتایا تھا۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ "ہم اطالوی لوگ بہت زیادہ مبالغہ کرتے ہیں۔ شاید ہماری تہذیب میں شامل ہے۔"

راستے میں اس نے اپنا لنچ باکس کھولا اور مجھے بھی کھانے میں شامل کر لیا۔ کھانے کے بعد تھرماس میں سے کافی نکال کر پلائی اور بڑا اعلیٰ قسم کا سگار بھی دیا۔ تھوڑی دیر ہم ہائی وے کے کنارے لنچ پوائنٹ کے بنچوں پر بیٹھے سگار پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ اسے پاکستان

کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ پھر وہ ۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کی باتیں کرنے لگا۔ سگار کا ہلکا سا کش لگا کر بولا۔

"تم پاکستانی ایک مارشل قوم ہو۔ تم بہادر قوم ہو۔ سن ۶۵ء میں تم نے اپنے سے تین گنا طاقت والے ہندوستان کا منہ پھیر دیا۔ ہم تمہاری بہادری کی عزت کرتے ہیں۔"

اس کے بعد وہ اپنا سفید بالوں والا سر کھجاتے ہوئے بولا۔

"کبھی ہم رومن لوگ بھی بڑے بہادر ہوا کرتے تھے۔ ساری دنیا میں ہماری بہادری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ رومن ایمپائر کے دبدبے اور شان و شوکت سے کون واقف نہیں ہے۔ مگر افسوس اب یہ ساری باتیں عہد پارینہ کا حصہ بن کر رہ گئی ہیں۔"

وہ تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر اس نے کاغذ کے گلاس میں سے ڈرنک کا آخری گھونٹ پیا اور گلاس ڈسٹ باکس میں پھینک کر کہنے لگا۔

"تم سیکنڈ ورلڈ وار کی مثال ہی لے لو۔ میں دوسرے اطالویوں کی طرح مبالغے سے کام نہیں لوں گا اور جھوٹ بھی نہیں بولوں گا۔ دوسری جنگ عظیم میں مسولینی نے مردہ رومن قوم میں ایک بار پھر عہد رفتہ کی کلیاں بھرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے عظیم رومن ایمپائر کے جاہ و جلال کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر قوم نے اسے نہیں پہچانا۔ خاص طور پر کمیونسٹ اسے لے ڈوبے۔ اطالوی فوجیں بھی کسی محاذ پر قدیم رومن سورماؤں کی طرح نہ لڑ سکیں۔ تمہیں معلوم ہے کیا ہوتا تھا؟ ہوتا یہ تھا کہ کسی محاذ پر اگر ایک مورچے کے اطالوی سپاہی ہتھیار ڈالتے تھے تو پوری کمپنی اس کے ساتھ ہی ہتھیار ڈال دیتی تھی۔ نتیجہ کیا نکلا؟ ساری دنیا میں اطالوی فوج کی بدنامی ہوئی۔ لوگ اطالوی فوج کو بزدلوں کی فوج کے نام سے پکارنے لگے۔"

پھر وہ گہرا سانس بھر کر بولا۔

"ہماری ساری تاریخ گواہ ہے کہ ہماری قوم کو ہماری آپس کی دشمنیوں اور خانہ جنگی نے ڈبو دیا۔ قدیم دور میں جب شہروں کی خودمختار ریاستیں ہوتی تھیں تو کیا ہوتا تھا؟ یہی کہ ایک ریاست دوسری ریاست سے لڑتی رہتی تھی۔ اس وقت تک یہ آپس کی چپقلش جاری رہتی تھی جب دشمن باہر سے آکر دونوں ریاستوں پر قبضہ نہیں کر لیتا تھا۔ سیزر بادشاہوں نے آکر رومن قوم کو متحد کیا اور ایک عظیم رومن سلطنت وجود میں آئی مگر کچھ دیر بعد وہ بھی عیاشیوں میں غرق ہو گئی اور ساری قوم کا شیرازہ ایک بار پھر بکھر گیا۔ ایک بات میں تمہیں ضرور بتاؤں گا کہ ہماری قوم کو اس وقت ایک اور مسولینی کی ضرورت ہے۔"

اس کی باتیں میں بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔ یہ اطالوی بڑا صاف گو اور پڑھا لکھا تھا اور اپنی قوم کی تاریخ سے آگاہ تھا۔

"چلو میرے دوست اب ہم سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ مجھے بھی شام ہونے سے پہلے پاڈوا تک پہنچنا ہے۔"

ہائی وے پر پونٹنگ کار ایک بار پھر فراٹے بھر رہی تھی۔ میں ایک عرصے بعد کسی آرام دہ قیمتی کار میں بیٹھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے

میں کسی تیز رفتار کشتی میں دریا میں سفر کر رہا ہوں۔

پارما

راستے میں پارما کا ایک تاریخی شہر بھی آیا۔ یہ چھوٹا سا شہر تھا اور اٹلی اور یورپ کے دوسرے چھوٹے شہروں کی طرح بارونق اور صاف ستھرا تھا۔ یہاں ہم نے ایک فاسٹ فوڈ ریستوران میں بیٹھ کر چائے پی اور ساتھ سنیکس بھی کھائے۔ چائے لپٹن والوں کی ہی تھی۔ بڑی خوشگوار اور تازہ تھی۔ یہاں سے پھر ہم آگے روانہ ہو گئے۔ شام ہو چکی تھی جب ہم پاڈوا پہنچے۔ اس اطالوی نے گاڑی ایک چوک میں پٹرول پمپ کے احاطے میں کھڑی کر دی اور کہنے لگا۔

"یہاں سے وینس کے لیے ٹرین بھی مل جائے گی' کرایہ زیادہ نہیں ہوتا۔ ٹرین میں ہی سفر کرنا۔ آگے مت جانا۔ کیونکہ موسم خراب ہے۔ بادل آ رہے ہیں' ہو سکتا ہے بارش ہو۔ اگر تمہیں کچھ پیسوں کی ضرورت ہے تو مجھ سے لے لو۔"

میرا دل چاہتا تھا کہ وہ مجھے کچھ پیسے دے دے مگر میں نے تکلف سے کام لیا اور کہا کہ شکریہ! مجھے ضرورت نہیں ہے۔ وہ مسکرا کر بولا۔

"اوکے۔۔۔۔۔۔بائی"

اور پورشے گاڑی آگے نکل گئی۔ میں ایک بار پھر بارونق شہر میں اکیلا کھڑا تھا۔ مجھے اس خوش مزاج پڑھے لکھے اور باشعور یعنی قومی شعور رکھنے والے اطالوی کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ میں پٹرول پمپ کے باہر ایک خالی بنچ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے اس شخص نے بتا دیا تھا کہ وینس وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اور کرایہ بھی زیادہ نہیں لگتا۔ میں نے پٹرول پمپ کے ایک آدمی سے پاڈوا کے ریلوے سٹیشن کے بارے میں پوچھا تو اس نے اطالوی زبان میں مجھے خدا جانے کیا بتایا۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آ سکا۔ میں وہاں سے اٹھ کر ایک سنیک بار میں آ گیا۔ یہاں بھی سب لوگ اطالوی زبان ہی بولتے تھے۔ میں ایک کیمسٹ یعنی ڈرگ شاپ میں آ گیا۔ یہاں ایک خوبصورت عورت کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ شاید وہ مجھے پناہ گیر سمجھ رہی تھی۔ میں نے انگریزی میں بات کی تو وہ بولی۔

"یس! میں انگریزی بول لیتی ہوں' تھوڑی۔"

میں نے پوچھا۔ "ریلوے اسٹیشن میں کیسے جا سکتا ہوں؟"

اس نے کاؤنٹر کے نیچے ہاتھ ڈال کر شہر کا نقشہ نکال کر میرے آگے رکھ دیا۔ پھر ایک جگہ انگلی رکھ کر بولی۔

"تم اس جگہ پر ہو۔"

میں اس کی انگلی دیکھنے لگا۔ ناخن پر گلابی پالش چمک رہی تھی۔ بڑی ستواں اور نازک انگلی تھی۔ میں جلدی سے ہوش میں آ گیا۔

"میں سینٹورینا میں اس جگہ پر ہوں۔"

میں نے اپنی انگلی اس کی نازک انگلی کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

اس نے مجھے ریلوے سٹیشن تک جانے کا سارا راستہ سمجھا دیا۔ یہ بھی بتا دیا کہ اسی چوک سے فلاں نمبر بس مجھے سیدھی ریلوے اسٹیشن پہنچا دے گی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور بس سٹاپ پر آ کر بس کا انتظار کرنے لگا۔ بس آئی تو میں اس میں بیٹھ گیا۔ یہاں میں نے ان ڈالروں کے عوض اٹلی کی کرنسی لیرا میں نوٹ تبدیل کرائے تھے جو ڈالر میرے پاس باقی بچے تھے۔ یہ نوٹ میں نے جمع کر کے بٹوے میں رکھے ہوئے تھے جو میری جیکٹ کی بغلی اندرونی جیب میں تھا۔

میں لٹ گیا

بس میں زیادہ رش نہیں تھا۔ مگر ساری سیٹیں بھری ہوئی تھیں۔ بس شہر کے مختلف جگمگاتے ہوئے بازاروں میں سے گزرتی ہوئی ایک عالی شان بلڈنگ کے آگے جا کر رک گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ ریلوے سٹیشن کی عمارت ہے۔ وہاں بس سٹاپ پر کافی رش تھا۔ میں بس سے بڑی مشکل سے اترا۔ اطالوی لوگ ہماری طرح بڑے جلد باز ہوتے ہیں۔ بس پر یک دم رش پڑ گیا تھا۔ ایک آدمی نے مجھے دھکا دیا تو میں ایک طرف گرتے گرتے بچا۔ دل میں اس شخص کو گالیاں دیتا میں نیچے اتر آیا۔ ریلوے سٹیشن کی بلڈنگ میں جا کر ٹکٹ ونڈو پر پہنچا۔ کاؤنٹر کے پیچھے ایک نوجوان ٹکٹ دے رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وینس جانے والی گاڑی کس وقت چھوٹے گی۔ اب میں بھی ٹوٹی پھوٹی اطالوی زبان بولنے لگا تھا۔ اس نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"ایک گھنٹے دس منٹ بعد چھوٹے گی۔"

میں نے کرایہ پوچھا۔ اس نے کرایہ بتایا جو زیادہ نہیں تھا۔ میں نے جیکٹ پیچھے ہٹا کر بغلی جیب میں ہاتھ ڈالا تو میرا بٹوہ غائب تھا۔ میں دھک سے رہ گیا۔ جیب کو بار بار ٹٹول ٹٹول کر دیکھا مگر بٹوہ ہوتا تو ملتا۔ میں قطار میں سے باہر نکل کر ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ سخت پریشان ہوا۔ بٹوہ کسی نے نکال لیا تھا۔ ضرور اسی شخص نے نکالا تھا جس نے بس میں سے اترتے وقت مجھے دھکا دیا تھا۔ میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ کمر سے تھیلا اتار کر کھولا۔ اس کی جیب دیکھی۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ میرا پاسپورٹ تھیلے میں موجود تھا۔ یہ نصیحت پوچینک کاروزے اطالوی نے کی تھی کہ پاسپورٹ بٹوے میں نہ رکھنا اسے اپنے تھیلے میں ہی رکھو۔ کیونکہ کوئی پتہ نہیں کہاں تمہارا بٹوہ اڑا لیا جائے۔ اب نئی مصیبت یہ آن پڑی تھی کہ بٹوے میں میرے سارے پیسے تھے جو بٹوے کے ساتھ ہی مجھ سے جدا ہو گئے تھے۔ میں بالکل قلاش ہو چکا تھا۔ وینس کے کرائے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا میرے پاس رات کے کھانے تک کے پیسے نہیں تھے اور یہ یورپ کا شہر تھا۔ یہاں تو کوئی لنگر بھی نہیں تھا کہ جہاں میں مفت دال روٹی کھا سکتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ منزل کے قریب آ کر میں لٹ گیا تھا۔ یہ

پاکستان نہیں تھا کہ میں ریلوے والوں کو دھوکا دے کر ٹرین میں بغیر ٹکٹ بیٹھ جاتا۔ آخر مجھے ایک راستہ نظر آیا کہ ایک بار پھر ہائی وے پہ چلو۔ لفٹ مانگو اور اللہ کے بھروسے پہ چل پڑو۔۔۔۔۔۔۔جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

اب سوال یہ تھا کہ میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اتنا مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہاں سے ہائی وے کافی دور ہے۔ میں بس میں بیٹھ کر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور پیدل ہی مغرب کی سمت کا اندازہ لگا کر فٹ پاتھ پہ چل پڑا۔ بڑی خوبصورت عورتیں میرے قریب سے خوشبوئیں اڑاتی گزر رہی تھیں مگر اس وقت وہ مجھے زہر لگ رہی تھیں۔ چوک میں آیا تو بڑی روشنیاں تھیں۔ نیون سائن مختلف رنگوں کے ساتھ جگمگا رہے تھے۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہاں تک روشنیاں تھیں کہ تارے کیا نظر آتے۔ آسمان پر بدستور بادل چھائے ہوئے تھے اور کبھی کبھی بجلی بھی چمک جاتی تھی۔ چوک بہت کشادہ تھا۔ موٹر گاڑیاں اور سکوٹر چل رہے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے زیبرا کراسنگ تلاش کر کے وہاں سے چوک کوئی پانچ منٹ میں عبور کیا۔ دوسری طرف آیا تو رک گیا۔ ایک نوجوان اطالوی میرے قریب سے گزرا تو میں نے اسے روک کر ہائی وے کا راستہ پوچھنا چاہا۔ وہ اشارے سے نو نو کرتا آگے نکل گیا۔ شاید وہ سمجھا کہ میں ٹورسٹ ہوں اور اس سے پیسے مانگوں گا۔ میں فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ ایک سنیک بار میں بڑا رش تھا۔ اندر سے گرم مصالحوں اور بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو آ رہی تھی۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی مگر آہ بھر کر رہ گیا۔

میں ہوں بے وطن مسافر

ٹریفک کا ایک سپاہی مجھے نظر آ گیا۔ میں نے اس سے ہائی وے کا راستہ پوچھا۔ اس نے ایک طرف اشارہ کیا اور اطالوی میں جو کچھ کہا میں یہی سمجھ سکا کہ آگے ایک چوک آئے گا وہاں سے بائیں جانب ہو جانا۔ وہ سڑک سیدھی ہائی وے پہ پہنچ جائے گی۔ بہر حال میں کسی نہ کسی طرح ہائی وے پہ پہنچ ہی گیا۔ یہاں پہلی بار مجھے آسمان پر بجلی کڑکتی دکھائی دی۔ کیونکہ یہاں شہر کی چکا چوند کر دینے والی روشنیاں نہیں تھیں۔ میں مزید پریشان ہو گیا۔ اگر بارش شروع ہو گئی تو کہاں جاؤں گا۔ وہاں کوئی جائے پناہ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہائی وے کی دونوں جانب لیمپ پوسٹ کی روشنیاں دور تک چلی گئی تھیں۔ ہائی وے پر وہ ٹریفک نہیں تھی جو دن کے وقت ہوتی تھی۔ کاریں اور ٹرالر کبھی کبھی گزر جاتے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ ہوا میں نمی بھی تھی۔ لگتا تھا کہ آس پاس پہاڑوں میں بارش ہو رہی ہے۔ میں خدا کے بھروسے پہ ہائی وے کی گرین بیلٹ کے کنارے کنارے شمال کی طرف چلنے لگا۔ پیچھے سے جو گاڑی آتی میں ٹھہر جاتا اور پیچھے مڑ کر آگے جانے کے لیے ہاتھ کا اشارہ کرتا۔ مگر گاڑی تیزی سے گزر جاتی۔ شاید وہاں رات کے وقت لفٹ دینے کا رواج نہیں تھا۔ وجہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ رات کو ٹورسٹ اس طرح سفر بھی نہ کرتے ہوں۔ شاید گاڑیوں والوں کو یہ شبہ تھا کہ میں ٹورسٹ کے بھیس میں کوئی چور ڈاکو ہوں۔ میں تھوڑی دور ہی چلا تھا کہ بادلوں کی گرج دار آواز سنائی دی اور بارش شروع ہو گئی۔

مصیبتیں یکے بعد دیگرے مجھ پر نازل ہو رہی تھیں۔ غنیمت تھا کہ بارش تیز نہیں تھی ہلکی ہلکی ہو رہی تھی مگر بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج بتا رہی تھی کہ یہ کسی وقت بھی تیز ہو سکتی ہے۔ اب مجھے بھوک شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ کاش جب میرے پاس پیسے تھے تو میں کچھ نہ کچھ کسی قسم کی شے خرید کر اپنے پاس رکھ لیتا۔ مگر اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا۔ بارش آہستہ آہستہ تیز ہونے لگی۔ سردی بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ ہوا بھی سرد تھی۔ ایک بار تو میں گھبرا گیا۔ سوچا واپس پالا کے ریلوے سٹیشن پر چلا جاؤں۔ کم از کم وہاں بارش سے تو نجات مل جائے گی۔ ریل کے کسی خالی ڈبے میں رات بسر کروں گا۔ پیاس بھی تنگ کر رہی تھی مگر بھوک زیادہ لگی ہوئی تھی۔ میرے کپڑے بارش میں بھیگنے لگے۔ گرین بیلٹ پر کوئی درخت بھی نہیں تھا کہ جس کے نیچے چلا جاتا۔ ہائی وے پر تھوڑی تھوڑی دور بجلی کے کھمبے نصب تھے جن پر بلب لائٹیں روشن تھیں۔ ان کی روشنی کی وجہ سے میں سڑک کنارے چلتا ہوا پیچھے سے آنے والی گاڑی کے ڈرائیور کو اچھی طرح نظر آ سکتا تھا۔ دل میں یہی سوچ رہا تھا کہ شاید کوئی گاڑی مجھ پر رحم کھا کر کھڑی ہو جائے۔ مگر گاڑی آتی میں رک کر اشارہ کرتا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں بارش کے قطرے تیزی سے زمین پر گرتے نظر آتے اور گاڑی مجھ غریب الوطن کے قریب سے شوں کر کے آگے نکل جاتی۔ کسی کو مجھ پر ترس نہ آتا۔ کبھی میں اپنے آپ کو برا بھلا کہتا کہ میں کیوں رات کے وقت ہائی وے پر نکل پڑا اور کبھی گاڑی والے کو گالیاں دیتا۔

میں اب ہاتھ کا اشارہ بھی نہیں کرتا تھا، گاڑی آتی اور گزر جاتی۔ ہاتھ ہلاتے ہلاتے میرا بازو درد کرنے لگا تھا۔ اب یہ ہوا کہ پیچھے سے مجھے کسی گاڑی کی روشنیاں بارش والی گیلی سڑک پر نظر آئیں۔ میں نے دل میں اسے گالی نکالی اور کہا۔ ”تم بھی گزر جاؤ تمہاری۔۔۔۔۔۔۔“

مگر گاڑی مجھ سے چند قدم آگے جا کر رک گئی۔ میں سمجھا اس کے انجن میں کوئی خرابی ہو گئی ہو گی۔ مگر اس کا انجن باقاعدہ چل رہا تھا۔ گاڑی بڑی قیمتی تھی۔ اس کا رنگ سرخ تھا۔ میں بارش میں بھیگتا، دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے گاڑی کے قریب سے گزرا تو میری طرف والی کھڑکی کا شیشہ آہستہ آہستہ نیچے ہو گیا۔ گاڑی کے اندر سے پہلے مجھے انگلش میوزک کی ہلکی ہلکی آواز آئی، پھر ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

”ہیلو! تمہیں لفٹ چاہیے۔“

یہ جملہ انگریزی زبان میں ادا کیا گیا تھا۔ میرے تنِ مردہ میں جیسے جان پڑ گئی۔ میں نے کھڑکی کے پاس منہ لے جا کر کہا۔

”یس پلیز“

جنت کی حور

گاڑی کے اندر کی فضا نیم گرم تھی اور بڑے قیمتی پرفیوم کی خوشبو میرے چہرے کے قریب سے ہو کر گزر گئی۔ اندر ایک عورت بیٹھی تھی۔ اس نے گاڑی کے اندر کی مدھم روشنی روشن کر دی۔ میں نے دیکھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک بے حد حسین لڑکی بیٹھی میری طرف قیامت خیز

مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ وہ فل میک اپ میں تھی۔ نازک اور گورے جسم پر پھول دار فراک پہن رکھا تھا۔ گلے میں سنہرا لاکٹ چمک رہا تھا۔ ایک بازو اس کا ڈرائیونگ ویل پر تھا جس کی کلائی میں سنہری زنجیر والی گھڑی تھی۔ کمر کے ساتھ بھی سنہری بیلٹ بندھی تھی اور گود میں سیاہ پرس تھا۔ اس کے بال سنہری تھے اور ایک لٹ ماتھے پر پڑی تھی۔ وہ تو اس وقت مجھے جنت کی کوئی حور لگ رہی تھی۔ شاید جنت سے کوئی حور ہی میری مدد کو آ گئی تھی۔ اس نے سامنے والا ایک بٹن دبایا اور کہا۔

"پلیز اندر آ جاؤ' بولٹ کھل گیا ہے۔"

میں دروازہ کھول کر جلدی سے اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں پیرس کی کسی پرفیوم شاپ میں داخل ہو گیا ہوں۔ گاڑی ہائی وے پر چل پڑی۔ بارش بھی تیز ہو گئی تھی اور گاڑی کے وائپر دائیں بائیں حرکت کر رہے تھے۔ باہر کی بارش اور ٹھنڈ سے گاڑی میں آیا تو مجھے کچھ سکون محسوس ہوا۔ میں اس خوبصورت اطالوی لڑکی کے بارے میں سوچنے لگا کہ یہ کون ہو سکتی ہے۔ ضرور اونچے طبقے کے کسی امیر خاندان کی لڑکی ہے۔ کیا یہ میرے خوابوں کی سنہری بالوں والی اطالوی دوشیزہ تو نہیں جس سے رومانس کرنے کی آرزو میرے دل میں ہے۔ اس کے بال بھی سنہری تھے۔ پھر خیال آیا کہ کہاں میں ایک آوارہ گرد سیاح اور کہاں یہ امیر لڑکی!

"تم کس ملک سے آئے ہو؟"

میں نے پاکستان کا نام لیا تو وہ بے اختیار بولی۔

"او آئی لو پاکستان۔۔۔۔۔۔۔ مجھے پاکستان سے محبت ہے۔"

گاڑی چلاتے ہوئے اس نے انکھیوں سے مجھے دیکھا۔ میں بھی انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ مسکرائی۔ اس کے دانت بڑے چمکیلے تھے۔

"تم مجھے اچھے لگے ہو۔"

میں دل میں بڑا خوش ہوا۔ اگر واقعی یہ خوبصورت لڑکی مجھے پسند کرنے لگی ہے تو پھر میرے لیے رومانس لڑانے کا نادر چانس ہے۔ اس نے ایک ہاتھ سے ڈیش بورڈ میں سے سنہری سگریٹ کیس نکال کر مجھے دیا اور بڑے شیریں لہجے میں کہا۔

"ڈیئر' کیا تم سگریٹ پیتے ہو؟"

میں نے کہا 'ہاں'

بولی۔ "گڈ! ایک سگریٹ آپ پیو اور ایک میرے لیے سلگا کر مجھے دو۔"

لائٹر سگریٹ کیس کے ساتھ ہی لگا ہوا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا کر اسے دیا۔ ایک اپنے لیے سلگایا۔ بڑا قیمتی سگریٹ تھا۔ برانڈ مجھے

معلوم نہ ہو سکا۔ قیمتی گاڑی ہائی وے پر فراٹے بھر رہی تھی۔

اس نے پوچھا۔

''تم وینس جا رہے ہو کیا؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ کہنے لگی۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں وینس تک تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ دراصل میں ڈاکٹر ہوں اور میرا نام ایلس ہے۔ یہ اٹالین نام ہے۔ میری ماں انگریز تھی۔ میں نے لندن میں ہی ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی ہے۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

میں نے اپنا نام بتایا۔ اس نے ایک ادا سے گردن گھما کر میری طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا۔

''مجھے تمہارا نام بھی اچھا لگا ہے۔''

میری گردن فخر سے اونچی ہو گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہی وہ لڑکی ہے جس سے رومان کرنے کی حسرت لے کر میں اطالیہ میں داخل ہوا تھا۔ وہ کہنے لگی۔

''یہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر ایک سینی ٹوریم ہے۔ میں وہاں جاب کرتی ہوں۔ ہفتے میں تین دن وہاں جاتی ہوں۔ میرا خاندان بڑا امیر ہے۔ مجھے نوکری کی ضرورت نہیں۔ میں تو صرف انسانوں کی خدمت کے لیے جاب کرتی ہوں۔''

بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔ بادلوں کی گرج تو گاڑی کے اندر سنائی نہیں دیتی تھی مگر کبھی کبھی آسمان پر چمکتی بجلی ضرور دکھائی دے جاتی تھی۔ میں نے گانوں کا کیسٹ بند کر دیا تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کیے جا رہی تھی اور میں اندر سے خوش ہو رہا تھا۔

''میں تمہیں ہسپتال والے موڑ پر اتار دوں گی۔ افسوس میں تمہیں وینس تک نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے ہر حالت میں وقت کی ڈیوٹی پر پہنچنا ہے۔''

میرا دل بجھ سا گیا۔ اب کیا کروں یہ لڑکی تو کچھ دیر بعد مجھ سے جدا ہو جائے گی۔ کیا میرا ارمان ادھورا رہ جائے گا۔ بارش کی بوچھاڑ ونڈ سکرین سے ٹکرا رہی تھی۔ وائپر تیزی سے دائیں بائیں حرکت کر رہے تھے۔ گاڑی کے اندر کی لطف ہلکی گرماہٹ اور اعلیٰ قسم کی پرفیوم سے مہک رہی تھی۔ اس خوبصورت دوشیزہ کے سانس میں سے باغ عدن کی خوشبوؤں کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اب ان خوشبوؤں میں بہترین تمباکو کی خوشبو بھی شامل ہو گئی تھی۔ سامنے سے ایک ٹرالر چلا آ رہا تھا۔ ایلس نے گاڑی کو تھوڑا دائیں جانب گھمایا تو اس کا جسم میرے جسم سے چھو گیا۔ وہ مسکرا دی۔ میرے سارے بدن میں بجلی کی ایک لہری دوڑ گئی۔ پھر یہ سوچ کر میں نے اپنے آپ کو نارمل کر لیا کہ یہ دوشیزہ تو تھوڑی دیر بعد مجھ سے شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الگ ہو جائے گی۔ لہٰذا رومان لڑانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ خواہ مخواہ دل کو جلانے والی بات ہے۔

ہائی وے کے دائیں بائیں پہاڑی علاقے میں دور دور تک اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہائی وے نے ایک موڑ کاٹا تو مجھے ایک پہاڑی کے دامن میں روشنیاں جھلملاتی نظر آئیں۔ ایلس نے کہا۔

"یہ روشنیاں ہمارے سینی ٹوریم کی ہیں۔ میں اگلے موڑ پر تم سے جدا ہو جاؤں گی۔"

میں اداس ہو گیا۔ اچانک اس نے بایاں گرم ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور سانس بھر کر بولی۔

"ایک بات کہوں؟ تم مجھے بہت یاد آؤ گے اس لیے کہ مجھے تم اچھے لگے ہو۔ محبت وغیرہ کو میں نہیں جانتی' لیکن تم مجھے ضرور یاد آیا کرو گے۔ کیا تم بھی مجھے یاد کرو گے؟'

اس کا نازک اور نیم گرم ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ کے اوپر تھا اور میرا سارا جسم سنسنی خیز ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"تم بھی مجھے بہت یاد آؤ گی ایلس! اس لیے کہ تم بھی مجھے بڑی اچھی لگی ہو۔"

اس نے ہاتھ اٹھالیا۔ سگریٹ کا ایک کش لگایا اور سامنے ہائی وے پر نظریں جمائے ہوئے بولی۔

"مجھے معلوم ہے کہ میں خوبصورت ہوں۔ سوسائٹی میں مجھے ایک اونچا مقام بھی حاصل ہے' مجھ سے کئی نوجوان اظہار محبت کر چکے ہیں مگر تمہارے منہ سے اپنی تعریف سن کر مجھے دلی خوشی ہوئی ہے۔ کاش تم ہمارے ملک کے رہنے والے ہوتے۔"

وہ چپ ہو گئی۔ سگریٹ اس کے دائیں ہاتھ میں تھا جس میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنا بایاں ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اب اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ سے دبایا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے سامنے باغ عدن کے دروازے کھل گئے ہیں۔ مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ سینی ٹوریم کی روشنیاں قریب آ رہی تھیں۔

"یہاں ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ آسمان کی وسعتوں میں بھٹکتے ہوئے دو ستارے پل بھر کے لیے ایک دوسرے کے قریب آئے تھے۔ اب ایک بار پھر ہمیشہ کے لیے الگ ہو جائیں گے۔"

وہ بے حد جذباتی لہجے میں بول رہی تھی جیسے واقعی اسے مجھ سے محبت ہو گئی تھی۔ میں حیران بھی تھا اور مسرور بھی تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا راستہ اختیار کروں۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ دوپہر کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا مگر اس خوبصورت دوشیزہ کی محبت نے تھوڑی دیر کے لیے بھوک کا احساس ختم کر دیا تھا۔

گاڑی ایک روشنیوں سے جگمگاتی سڑک کی طرف تھوڑی سی مڑی۔ پھر ایک جگہ کھڑی ہو گئی۔ ایلس نے میرا ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں لے لیا اور میری طرف عجیب اداس نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"اوکے مائی ڈیئر۔۔۔۔۔۔۔ وہ مقام آ گیا ہے جہاں ہمیں ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانا ہو گا۔"

پھر اس نے کمال کر دیا۔ میری طرف جھکی اور مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ میں تو جیسے پھولوں کے ڈھیر میں چھپ گیا تھا۔ پھر وہ جلدی سے الگ ہو گئی۔ اپنا لباس درست کرتے ہوئے بولی۔

"میں بھی کیسی نادان ہوں جذباتی ہو رہی ہوں۔ وہ سامنے ہائی وے پر چلنے والی بس کا ایمرجنسی سٹاپ ہے۔ میں تمہیں وہاں اتار دیتی ہوں تو وہاں سے تمہیں وینس جانے والی بس مل جائے گی۔"

میں بت بنا بیٹھا تھا۔ اس نے انجن سٹارٹ کیا۔ پھر کچھ سوچ کر انجن بند کر دیا اور میری طرف دیکھ کر بولی۔

"مگر تم تیز بارش میں بس سٹاپ کی چھت تلے صبح تک کیسے بیٹھے رہو گے؟ بس تو صبح صبح آتی ہے۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے' میرے ساتھ سینٹ توریم چلو۔ میرا وہاں الگ ریسٹ ہاؤس ہے۔ باقی رات وہاں بسر کرو۔ صبح میں تمہیں خود ایمرجنسی بس سٹاپ پر چھوڑ آؤں گی۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہسپتال کی کوئی گاڑی وینس جا رہی ہو میں تمہیں اس میں بٹھا دوں گی۔۔۔۔۔۔۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

اندھے کو آنکھیں مل جائیں تو وہ بھی خوش نصیبی پر جس قدر ناز کرے کم ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے جنت کے دروازے کھل گئے تھے۔ کون کافر انکار کرتا پھر بھی میں نے تھوڑا سا تکلف کرنا مناسب سمجھا۔ میں نے کہا۔

"میں تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا ایلس!"

اس نے میری طرف جھکتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"مجھے تو بڑی خوشی ہو گی۔"

اور گاڑی سینٹ توریم کی طرف مڑ گئی۔

سینٹ توریم کو جانے والی سڑک پر دونوں طرف کھمبوں پر بڑے بڑے بلب روشن تھے۔ سڑک چھوٹی تھی اور چھوٹے چھوٹے موڑ گھومتی ہوئی ٹیلے پر سے ہوتے سینٹ توریم کی طرف جاتی تھی۔ ایلس نے بڑے محبت بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"تم نے کھانا کھایا ہے کیا؟"

میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"خیال تھا کہ وینس جا کر کھاؤں گا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے ٹورسٹ لوگوں کا کوئی کھانے کا ٹائم نہیں ہوتا۔"

ایلس نے میرا ہاتھ تھپتھپایا۔

"گڈ۔۔۔۔۔۔۔ میں نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ ہم دونوں اکٹھے ڈنر کریں گے۔ اصل میں جب میں یہاں رات کی ڈیوٹی پر آتی ہوں

تو ڈنر سینی ٹوریم میں ہی کرتی ہوں۔ ہمارا شیف مرغابی بڑی کمال کی بناتا ہے۔"

سینی ٹوریم کی عمارت تین منزلہ تھی اور جگمگا رہی تھی۔ پارکنگ ایریا میں گاڑیاں کھڑی تھیں۔ بارش کی شدت میں کمی آ گئی تھی۔ ایلس گاڑی کو سینی ٹوریم کے پورچ کے آگے سے نکال کر بتی سڑک پر لے آئی۔ یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پہاڑی کی ڈھلان پر بنگلے بنے ہوئے تھے جن میں روشنی ہو رہی تھی۔

"ریسٹ ہاؤس زیادہ دور نہیں ہے۔ میں نے اس لیے ریسٹ ہاؤس کا انتخاب کیا ہے کہ یہ شہر کی عام فضا سے دور ہے۔"

گاڑی ڈھلان والے بنگلوں کے سامنے سے بھی گزر گئی۔ ان بنگلوں کے عقب میں ٹیلے پر ایک جانب بارش والی رات کے اندھیرے میں ایک بنگلے کی روشنیاں سی نظر آنے لگیں۔ ایلس نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"یہ ہمارا ریسٹ ہاؤس ہے۔ میں نے کونے والا ایک کمرہ لے رکھا ہے۔ اس کی کھڑکیاں وادی کی طرف کھلتی ہیں۔ وہاں صبح کے وقت بڑا خوبصورت نظارہ ہوتا ہے۔ صبح ہم وہیں لان میں بیٹھ کر کافی پئیں گے۔"

مجھے یہ سب کچھ الف لیلہ والا سوتے جاگتے کا قصہ معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے میں ایک دن ایک رات کے لیے کسی ملک کا بادشاہ بنا دیا گیا ہوں۔ اس خیال سے میرے دل میں غم کی لہری اٹھنے لگی تھی کہ کل صبح میں اس جنت گم گشتہ سے جدا ہو جاؤں گا۔ ایلس نے گاڑی ریسٹ ہاؤس کی ایک منزلہ عمارت کے پارکنگ میں لے جا کر کھڑی کر دی۔

"آؤ ڈیئر ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔"

میں گاڑی سے باہر نکلا تو سرد ہوا کے جھونکے نے میرا خیر مقدم کیا۔ ایلس گاڑی کو لاک کر رہی تھی۔ اس نے اپنی جیکٹ کے کالر رکھے تھے۔ بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم دوڑتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کے پورچ میں آ گئے۔ سامنے شیشے کے دروازوں والا ایک دروازہ تھا۔ وہاں کوئی چوکیدار وغیرہ نظر نہ آیا۔ ایلس دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ اندر کی فضا نیم گرم تھی۔ میں ایلس کے ساتھ ساتھ تھا۔ ہم ایک کوریڈور میں سے گزر رہے تھے۔ یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کمزور روشنی والے بلب روشن تھے۔ ہم ایک لفٹ کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ایلس نے لفٹ کا بٹن دبایا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور مجھ پر اپنی مسکراہٹوں کی بجلیاں گرا رہی تھی۔ لفٹ ہمیں اوپر والی منزل پر لے گئی۔ یہاں بھی تنگ راہداری تھی جہاں روشنی بہت ہی کم تھی۔ ایلس کہنے لگی۔

"یہاں ڈاکٹروں کے اپنے اپنے کمرے ہیں جہاں وہ آرام کرنے آ جاتے ہیں۔ اسی لیے یہاں روشنیاں مدھم رکھی گئی ہیں۔ سینی ٹوریم تمہیں دکھاؤں گی۔ وہاں تو چکاچوند کر دینے والی روشنیاں ہوتی ہیں رات کو۔"

کاریڈور میں چلتے ہوئے ایلس کی اونچی ایڑی کی ٹک ٹک گونج رہی تھی۔ ایلس ایک بند دروازے کے سامنے رک گئی۔ اس نے پرس

میں سے چابی نکال کر تالا کھولا اور ہم کمرے میں داخل ہو گئے۔ ایلس نے بجلی کا بٹن دبایا۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ کمرہ بڑے سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ فرش سرخ قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ بڑا قیمتی فرنیچر تھا۔ دیوار کے ساتھ کیبنٹ پر وینس کا سنگ مرمر کا چھوٹا سا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ ایک طرف چھوٹا سا بار کاؤنٹر بنا تھا جس کے پیچھے شیلف میں وہسکی کی بوتلیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ایلس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے سامنے والے دروازے کی طرف لے جاتے ہوئے بولی۔

"آؤ تمہیں اپنا بیڈ روم دکھاؤں۔"

بیڈ روم چھوٹا سا تھا مگر خواب کی طرح پراسرار اور حسین تھا۔ ڈبل بیڈ پر صاف ستھری پھولدار چادر بچھی تھی۔ شیر کی کھال کی طرح کا کمبل پائنتی کی جانب تہہ کر کے رکھا تھا۔ ایلس کہنے لگی۔

"تم رات کو یہاں سو گے۔ آؤ پہلے کھانا کھا لیں۔ مجھے بڑی بھوک لگی ہے۔"

ہم لیونگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ ایلس نے انٹرکام پر کسی کو کہا کہ دو آدمیوں کا کھانا لے آؤ۔ میری بھوک چمک اٹھی تھی۔ ایلس اٹھ کر صوفے پر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے کھیلنے لگی۔

"تمہیں ہمارا ملک اٹلی کیسا لگا ہے؟"

میں نے کہا۔ "بہت خوبصورت۔۔۔۔۔۔ مگر تم سارے ملک سے بڑھ کر خوبصورت ہو۔"

میں بھی جوش میں آ گیا تھا اور کھل کر ایلس سے محبت کا اظہار کرنے لگا تھا۔ وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی۔

"آہ! تم مشرقی لوگ بھرپور جذبات کے ساتھ محبت کرتے ہو۔" پھر آنکھیں کھول کر کہنے لگی۔ "مجھے بس تم لوگوں کا محبت کا یہی انداز پسند ہے۔"

وہ میرے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا سر میرے کندھے کے ساتھ لگا دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے گلاب کے پھولوں کا گلدستہ میرے کندھے پر رکھ دیا ہے۔ ایک بات مجھے ایلس کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی خاص طور پر محسوس ہوئی۔ وہ بات یہ تھی کہ ڈرائنگ روم کی فضا میں کسی دوائی کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بو ایلس کے بیڈ روم میں زیادہ تیز محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا چونکہ یہ ہسپتال کا ریسٹ ہاؤس ہے یہاں دوائیوں کی بو کا موجود ہونا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ ہم محبت کی باتوں میں کھوئے تھے کہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر آہستہ سے کسی نے دستک دی۔ ایلس جلدی سے مجھ سے الگ ہو کر بولی۔

"چلو ڈیئر کھانا آ گیا ہے۔"

ہم ڈائننگ روم میں آ گئے۔ یہاں ایک جانب کھانے کی چھوٹی گول میز لگی تھی جسے ڈائننگ ٹیبل کہتے ہیں۔ ٹیبل کے وسط میں پھولوں کا

گلدستہ رکھا تھا۔ بیلس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے مالوی زبان میں آواز دے کر کہا۔

"اندر آجاؤ۔"

یہ مالوی زبان اب میں بھی سمجھنے لگا تھا۔ دروازہ کھلا اور ایک درمیانے قد کی ذرا بھاری جسم والی نوکرانی داخل ہوئی۔ اس کا رنگ گندمی تھا۔ سر پر رسوں والی ٹوپی تھی۔ کمر کے ساتھ سفید ایپرن بندھا تھا۔ وہ ہاتھ میں کھانے کا طشت لیے آرہی تھی۔ اس نے بڑے سکون کے ساتھ طشت میز کے کنارے کے ساتھ ٹکا دیا اور ایک ہاتھ سے کھانے کے برتن میز پر لگانے لگی۔ اس نے ایک قاب کا ڈھکن اٹھایا۔ اس میں مرغابی کا سالن تھا۔ بیلس خوش ہو کر بولی۔

"میں نے کہا تھا نا ہمارا شیف مرغابی بڑی اچھی بناتا ہے۔ اب تم خود کھا کر دیکھ لینا۔"

بیلس اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف گئی۔ وہاں شیلف میں سے شیشے کے دو بڑے گلاس اور مارٹینی کی بوتل لے کر آگئی۔ اس نے دونوں گلاسوں میں تھوڑی تھوڑی مارٹینی ڈالی۔ ایک گلاس مجھے دیا۔ پھر اپنا گلاس میرے گلاس کے ساتھ ٹکرا کر انگریزی میں کہا۔

"To Our Love"

میں نے گلاس منہ کے ساتھ لگا کر چہرہ ذرا سا اونچا کیا تو میری نگاہ کھانا لانے والی ویٹرس پر پڑ گئی جو میز کے درمیان مخروطی موم بتی روشن کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ میری طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو اس نے جلدی سے نظریں نیچی کر لیں۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ کھانا واقعی بڑا مزیدار تھا۔ مجھے بڑی زبردست بھوک لگی ہوئی تھی۔ خوب سیر ہو کر کھایا۔ کھانے کے بعد وہی خادمہ کافی لے آئی۔ ہم صوفے پر بیٹھ گئے اور کافی پینے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ بیلس صوفے پر میرے قریب ہو کر نہیں بیٹھی بلکہ تھوڑا فاصلہ ڈال کر بیٹھی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہا تو اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور آنکھوں سے خادمہ کی طرف اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنی خادمہ کے سامنے مجھ سے بے تکلف نہیں ہونا چاہتی۔ لیکن مجھے فوراً یاد آگیا کہ جس وقت خادمہ کھانا لے کر اندر آئی تھی تو اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا اور اس وقت اس نے خادمہ کو دیکھ کر ہاتھ نہیں چھڑایا تھا۔ مگر یہ خیال فوراً ہی میرے ذہن سے نکل گیا۔ کیونکہ بیلس برابر کافی پیتے ہوئے میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ کافی کی پیالی میز پر رکھ کر بیلس نے گولڈن سگریٹ کیس میں سے سگریٹ سلگایا۔ خادمہ کافی کی پیالی اٹھانے لگی تو اس نے خادمہ سے کہا۔

"فاطمہ! تم بھی مسلمان ہو اور میرا دوست بھی مسلمان ہے۔ -------- یہ پاکستان سے آیا ہے۔"

پھر اس نے فاطمہ سے میرا تعارف کرایا۔

"یہ ہماری بڑی وفادار خادمہ ہے۔ اس کو میرے پاس ملازمت کرتے پندرہ سال گزر گئے ہیں۔ یہ جزائر کی رہنے والی ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ جب میں نے اسے بتایا کہ میں بھی اسی کی طرح مسلمان ہوں تو خادمہ نے ذرا سا چونک کر میری طرف دیکھا تھا۔ میرے پاس اس کا کوئی جواز نہیں تھا کہ میں خادمہ کے چونک جانے پر حیران ہوتا۔ میں نے سیر ہو کر بہترین قسم کی غذا کھائی تھی، تھوڑی سی وہسکی بھی چکھی تھی، دوسرے ایلس کی محبت کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ میں بڑے سکون کے ساتھ صوفے پر دراز سگریٹ پی رہا تھا۔ لیکن اس بات پر ضرور تھوڑا سا حیران تھا کہ ایلس مجھ سے فاصلے پر کیوں بیٹھی تھی۔

ایلس نے کافی کی خالی پیالی میز پر رکھی اور میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں ابھی آئی۔"

سامنے باتھ روم کا دروازہ کھلا تھا جس پر انگریزی کا حرف B لکھا تھا۔ جب ایلس نے باتھ روم کا دروازہ اندر سے بولٹ لگا کر بند کر لیا تو خادمہ نے میرے قریب آ کر جھک کر کہا۔

"یہاں سے بھاگ جاؤ، ابھی وقت ہے۔"

قاتل حسینہ

میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا کہ یہ عورت مجھے اچانک بھاگ جانے کے لیے کیوں کہہ رہی ہے۔ میں بھی اس سے پوچھنے ہی والا تھا کہ تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو کہ باتھ روم کے بولٹ کھلنے کی آواز آئی۔ خادمہ جلدی سے پیچھے ہٹی اور میز پر خالی پیالی اٹھا کر ٹرے میں رکھنے لگی۔ ایلس مسکراتی ہوئی باتھ روم سے نکل کر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے جسم سے پرفیوم کی تازہ مہک سے کسی قیمتی تیز خوشبو آ رہی تھی۔ خادمہ نے مجھے ایک نظر دیکھا اور ٹرے لے کر کمرے سے نکل گئی۔

ایلس میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے محبت بھری باتیں کرنے لگی۔ میرے ذہن میں خادمہ کا جملہ گھوم رہا تھا۔ "یہاں سے بھاگ جاؤ، ابھی وقت ہے۔"

میں اس جملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر خادمہ نے یہ بات کیوں کہی تھی۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے، بیچاری یہ مسلمان عورت نہ چاہتی ہو کہ میں وہاں کوئی گناہ کر بیٹھوں یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایلس کے خلاف اس کے دل میں رقابت کا جذبہ ہو۔ میرا ذہن اس گتھی کو سلجھانے کی تگ و دو میں لگا ہوا تھا کہ ایلس نے اپنے نازک قرمزی ہونٹ میرے کان کے قریب لاتے ہوئے کہا۔

"اب ہمیں بیڈروم میں چل کر آرام کرنا چاہیے۔ رات بہت گزر چکی ہے لیکن ...."

میں نے اس کی طرف دیکھا اس نے اپنا منہ پیچھے ہٹا لیا اور جلدی سے ہنستے ہوئے بولی۔

"لیکن بیڈروم میں جانے سے پہلے وہسکی کی ایک ایک ڈرنک ضرور ہو جانی چاہیے۔"

میرا ذہن خاموشی کے مبہم سے اشتباہ کو بالکل ہی بھول گیا۔ میں نے ایلس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ضرور۔۔۔۔۔۔۔ضرور"

وہ تیز قدموں سے اپنے بار کاؤنٹر کے پیچھے چلی گئی اور گلاسوں میں مارٹینی کا مشروب ڈالنے لگی۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ کمرے کی روشنی میں مجھے اس کے سنہری بال سونے کی آبشار کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ایلس نے مشروب ڈالتے ہوئے تھوڑی دیر لگا دی۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"ڈارلنگ! اتنی دیر نہ کرو۔"

ایلس کاؤنٹر سے پلٹ کر میری طرف بڑھی۔ اس کے ہاتھوں میں مشروب کے بھرے دو گلاس تھے۔ ان میں سرخ مشروب صاف نظر آ رہا تھا۔

"تمہاری اور میری محبت کے نام"

اس نے ایک گلاس میرے ہاتھ میں دے دیا۔ دوسرا گلاس خود لے کر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اس کی جانب سے تھوڑی دیر پہلے جو ہلکی سی بے اعتنائی کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا تھا' وہ بھی مشروب کے پہلے گھونٹ کے ساتھ اڑ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مشروب کا ذائقہ پہلے کی نسبت کچھ کڑوا تھا۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ مشروب میں تھوڑا تھوڑا فرق تو ہوتا ہی ہے۔ ایلس مجھ سے پیار بھری باتیں بھی کر رہی تھی اور مشروب کے ہلکے ہلکے گھونٹ بھی لے رہی تھی۔ میں نے اپنا گلاس میز پر رکھ دیا تھا۔ ایلس نے گھڑی دیکھی اور میرا گلاس میز پر سے اٹھا کر میرے ہونٹوں کے ساتھ لگا دیا اور بولی۔

"ڈیئر جلدی ختم کرو' باقی باتیں بیڈ روم میں چل کر ہوں گی۔"

بیڈ روم کا نام سن کر جیسے میرے اندر ایک برقی رو سی دوڑ گئی۔ میں نے گلاس لے کر باقی مشروب بھی ختم کر دیا۔ ایلس کے گلاس میں ابھی مارٹینی باقی تھی۔ اس نے اپنا گلاس میز پر رکھ دیا اور صوفے پر مجھ سے ذرا پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔

"میرے قریب ہی رہو' ایلس!"

مجھے اپنی آواز پر کسی دوسرے مرد کی آواز کا گمان ہوا۔ میں نے اپنی ناک سکیڑ کر غور کیا کہ یہ آواز کس کی تھی۔ پھر خود ہی ہنس پڑا کہ یہ میں کس قسم کی باتیں سوچنے لگا ہوں۔ اس دوران ایلس نے کافی ٹیبل کے نیچے جو ٹیلی فون پڑا تھا' وہ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا تھا اور کوئی نمبر ملا رہی تھی۔ میں نے ایلس کے بازو کو پکڑ کر یہ کہنے کی کوشش کی کہ ڈارلنگ اس وقت کس کو فون کر رہی ہو۔۔۔۔۔۔۔ مگر مجھے محسوس ہوا کہ میرا بازو اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہل رہا۔ میں گھبرا سا گیا۔ ایلس کسی کو فون پر اطالوی زبان میں کچھ بتا رہی تھی اور تھوڑا تھوڑا مسکرا بھی رہی

تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ پھر اس کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ اب مجھے صرف اس کے ہونٹ ہی ہلتے نظر آ رہے تھے۔ میں نے جلدی سے صوفے سے اٹھنے کی کوشش کی۔ مجھے زبردست چکر آیا اور میرا سر اپنے آپ صوفے کی پشت سے جا لگا۔

ایلس نے فون بند کر کے میری طرف دیکھا۔

اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ اور سپاٹ تھا۔ اس نے ڈاکٹر کی طرح میری نبض پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ وہ ایک دم سے اجنبی عورت بن گئی تھی۔ مجھے اپنی کلائی پر ایلس کا ہاتھ بہت ہلکا سا احساس ہو رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میرا سارا جسم پتھر بن گیا ہے۔ سر بھاری ہو گیا تھا۔ کمرے کی ہر شے گھومتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ میرے دماغ میں مسماں حادمہ کا فقرہ گونج رہا تھا۔ "یہاں سے بھاگ جاؤ ابھی وقت ہے۔"

مگر اب وہاں سے بھاگنے کا وقت گزر چکا تھا۔ میری ٹانگیں سن ہو رہی تھیں۔ میں نے آخری منظر یہ دیکھا کہ وہ اطالوی حسینہ میرے گالوں پر دائیں بائیں زور زور سے طمانچے مار رہی ہے اور مجھے محسوس ہی نہیں ہو رہا۔ میں اپنی آنکھوں کے بوجھل پپوٹے اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر پپوٹے اتنے بھاری ہو گئے ہیں کہ اوپر نہیں اٹھ رہے۔

اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔

◆ ◆ ◆

موت کا ہسپتال

جب ہوش آیا تو سب سے پہلے مجھے آئیوڈوفارم کی ہسپتالوں والی تیز بو محسوس ہوئی۔ میرا سر ابھی چکرا رہا تھا پپوٹے بھاری تھے۔ میں نے کوشش کر کے پپوٹے الگ کیے تو مجھے اپنے اوپر چھت کے ساتھ لگا ہوا وہ بیضوی بڑا سا گلوب نظر پڑا جو آپریشن تھیٹروں میں آپریشن کرنے والی میز کے اوپر لگا ہوتا ہے۔ اس گلوب کی صرف ایک بتی روشن تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے چاہے تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میرا جسم آپریشن ٹیبل پر بندھا ہوا تھا۔ دہشت کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ خدا جانے یہاں میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ میرے حلق سے عجیب ڈراؤنی مگر بے حد کمزور آواز نکلی تو دو آدمی سٹریچر کے پاس آ کر مجھ پر جھک گئے۔ انہوں نے ڈاکٹروں والے سفید کوٹ پہن رکھے تھے۔ سرخ و سفید چہرے ساکت اور پتھر کی طرح سخت لگ رہے تھے۔ ان کے سروں پر بھی سفید ٹوپیاں تھیں۔ ایک چہرہ میری آنکھوں کے بالکل قریب جھک کر مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے انگلی سے میرے پپوٹوں کو اوپر نیچے کر کے دیکھا اور پیچھے ہٹ گیا۔ دوسرے ڈاکٹر نے شیشے کی ٹرے میں سے سرنج اٹھائی اور میرے بازو پر سے سفید چادر ہٹا کر انجکشن لگا دیا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا اور میں بے ہوش ہو گیا۔

دوسری بار مجھے ہوش آیا تو میرے سر کے چکر ختم ہو چکے تھے۔ میں پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں تھا مگر بے حد نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں اسی آپریشن تھیٹر ہی میں ہوں۔ میرے دونوں ہاتھ اور پاؤں چمڑے کی بیلٹ کے ساتھ سٹریچر کے کناروں پر بندھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا سر اٹھانے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ ایک بیلٹ نے میرے سر کو بھی اپنے شکنجے میں لے رکھا ہے۔ میں نے نگاہیں ادھر ادھر پھرا کر آپریشن تھیٹر کا جائزہ لیا۔ آپریشن تھیٹر کی اوپر والی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ صرف دیوار والا بلب روشن تھا۔ سامنے دیوار کے ساتھ الماری لگی تھی جس میں دوائیوں کی بوتلیں اور آپریشن کرنے والے اوزار نظر آ رہے تھے۔ الماری کے ساتھ ہی شیشے کی ٹرالی پر بھی آپریشن کے کچھ آلات اور سٹیل چینی کا ایک بیضوی برتن پڑا تھا۔

”یا اللہ! میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ یہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میرے گناہ بخش دے۔ میرے خدا۔۔۔۔۔۔
میری غلطیوں کو معاف فرما دے اور مجھے اس مشکل سے نکال دے۔ خدا جانے یہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔“

پولیس کا تو کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ مجھے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے آنکھیں گھما کر دیکھنے کی کوشش کی۔ دو آدمی کمرے

میں داخل ہوئے۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ دونوں میرے سٹریچر کے پاس آ گئے۔ انہوں نے بھی ڈاکٹروں والے سفید کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ایک نے میرے سینے پر سے سفید چادر میری ناف تک ہٹا دی۔ دوسرے نے میرے پیٹ اور سینے پر کوئی کریم لگائی اور پہلے والے نے استرے سے میرے سینے اور پیٹ کی شیو کرنی شروع کر دی۔ میں نے زور لگانا چاہا لیکن معلوم ہوا کہ میرے بدن میں تو پوری جان واپس آ گئی ہے لیکن آواز نہیں نکل رہی جیسے گلا بیٹھا ہوا ہو۔ میں نے پورا زور لگا کر بولنے کی کوشش کی مگر آواز حلق میں ہی دب کر رہ گئی۔ مجھ پر خوف طاری ہو رہا تھا۔ یہ لوگ میرے آپریشن کی تیاریاں کر رہے تھے مگر میرا کس چیز کا آپریشن کیا جا رہا تھا مجھے تو کچھ نہیں ہوا تھا۔ معاملہ مزید الجھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ روبوٹ مشینوں کی طرح اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے میرے سینے اور پیٹ کو استرے سے بالکل صاف کر کے وہاں گلابی رنگ کی دوائی لگائی۔ مجھ پر چادر ڈالی اور کمرے سے نکل گئے۔ جتنی دیر وہ میرے سٹریچر کے پاس رہے انہوں نے آپس میں بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے دروازہ باہر سے لاک کرنے کی آواز آئی۔

اب میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرے سامنے لاہور شہر کا اپنے محلے کا اور بہن بھائیوں کا نقشہ گھوم گیا۔ ان سب کی شکلیں میری آنکھوں کے سامنے آ گئیں۔ اب مجھ پر بجرازی مسعتنا خادمہ کی بات کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ اس نے مجھے کس لیے متنبہ کیا تھا کہ یہاں سے بھاگ جاؤ ابھی وقت ہے۔ . . . . . واقعی اگر اس وقت مجھے معلوم ہوتا کہ میرے ساتھ کیا حشر ہونے والا ہے تو میں اینس کے ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دیتا۔ اگر اینس تھوڑی دیر مزید باتھ روم میں رکتی تو ہو سکتا تھا کہ مسعتنا خادمہ مجھے سب کچھ بتا دیتی کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور اینس مجھے پھنسا کر وہاں کس لیے لائی ہے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ میری قسمت خراب تھی کہ اینس بہت جلد باتھ روم سے باہر آ گئی۔ اور مسعتنا خادمہ کو مزید تفصیل بتانے کی مہلت نہ مل سکی۔

وہاں مجھے وقت کا بھی کوئی احساس نہ تھا۔ کمرے میں کوئی گھڑی نہیں لگی تھی۔ صرف ایک بلب جل رہا تھا۔ مجھے محسوس ہو چکا تھا کہ میں سفید چادر کے نیچے سر سے پاؤں تک ننگا ہوں۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ رات ہے کہ دن ---------- اور میں وہاں کب سے پڑا ہوں اور یہ کون سی جگہ ہے۔ اگر ہسپتال ہے تو کون سا ہسپتال ہے اور مجھے وہاں کیوں لایا گیا ہے۔ یہ تلخ حقیقت مجھ پر واضح ہو چکی تھی کہ اینس ایک مکار عورت تھی جو مجھے ورغلا کر اپنے دام میں پھنسا کر یہاں چھوڑ گئی تھی۔ وہ کس مقصد کے لیے مجھے یہاں چھوڑ گئی تھی اور کیوں چھوڑ گئی تھی اور میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ یہ سوال ایک ایسا معمہ تھا کہ جس کی گتھیاں سلجھنے کی بجائے مزید الجھتی جا رہی تھیں۔ اب مجھے یاد آ رہا تھا کہ جب اس نے مارٹینی کے آخری گلاس میں کچھ ملا کر مجھے مشروب پلایا تھا اور میرا جسم سن ہونا شروع ہو گیا تھا تو وہ فون کیوں کر رہی تھی۔ جس شخص کی طرف سے وہ مجھے یا کسی بھی ٹورسٹ کو پھنسا کر وہاں اپنے ڈرائنگ روم میں لا کر بے ہوشی کی دوائی پلانے کے کام پر لگائی گئی تھی وہ اس کو ٹیلیفون پر اطلاع دے رہی تھی کہ میں نے اپنا کام انجام دے دیا ہے یہاں آ کر اپنا شکار لے جاؤ۔ پیسوں کے لیے میرے دل میں

نفرت، درانتقام کے جذبات کا ایک طوفان بار بار اٹھ رہا تھا مگر اب اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا' پانی سر سے گزر چکا تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ مجھے اپنے بدن میں طاقت واپس آتی ضرور محسوس ہو رہی تھی مگر حلق میں جیسے دھول سی اڑ رہی تھی۔ آواز کوشش کے باوجود نہیں نکل رہی تھی۔ سر بھاری تھا اور چونکہ چہرے کی پٹی میں جکڑا ہوا تھا' اس لیے میں اسے ہلا جلا بھی نہیں سکتا تھا۔ بس آنکھیں کھلی تھیں اور خالی کمرے میں بلب جل رہا تھا جس کی روشنی میں چھت اور سامنے دیوار کی طرف ہی دیکھ سکتا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور جتنی دعائیں مجھے یاد تھیں دل ہی دل میں پڑھنی شروع کر دیں۔ میں گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور جذبات کی شدت سے میرے ہونٹ کپکپانے لگے۔ یہ کیفیت نہ جانے کب تک مجھ پر طاری رہی۔ پھر مجھے نیند آ گئی یا میں نیم بے ہوش ہو گیا۔

آنکھ اس وقت کھلی جب کمرے میں مجھے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ میں نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ میرے پپوٹے اب بھاری نہیں تھے۔ میں نے تین آدمیوں کو اپنے اسٹریچر کے پاس کھڑے دیکھا۔ ان میں سے دو آدمیوں نے ڈاکٹروں والا سفید کوٹ پہن رکھا تھا۔ تیسرا آدمی ایک بوڑھا شخص تھا' جس کی فرنچ کٹ ڈاڑھی تھی۔ آنکھوں پر سنہری فریم والا چشمہ لگا تھا۔ سر کے بال اڑے ہوئے تھے۔ وہ بہترین تھری پیس سوٹ میں تھا اور اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ وہ چھڑی کے سہارے ایک طرف کو ذرا سا جھکا ڈاکٹروں سے اطالوی زبان میں کچھ باتیں کر رہا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے میری آنکھیں کھلی دیکھیں تو میری طرف اشارہ کیا۔ دونوں ڈاکٹر اور تیسرا آدمی میری طرف متوجہ ہو گئے۔ ایک ڈاکٹر نے میری نبض دیکھی۔ بوڑھا آدمی بڑی دلچسپی اور شوق کے ساتھ مجھے جھک کر دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی اور مجھے اس کے نقلی دانت نظر آ رہے تھے۔ میں نے سارا زور لگا کر کچھ بولنا چاہا' مگر آواز نے میرا ساتھ نہ دیا۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ لوگ میرے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ دوسرے ڈاکٹر نے مجھے ایک انجکشن لگا دیا جس سے میرے پپوٹے بھاری ہونا شروع ہو گئے۔ میری آنکھیں اپنے آپ بند ہو گئیں۔ میں نے آخری آواز جو سنی وہ کسی کے ہلکے سے ہنسنے کی آواز تھی۔ یہ وہ بوڑھا اطالوی ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد میری سماعت اور بینائی معطل ہو گئی۔

میری محسن ------- فاطمہ!

مجھے یوں لگا جیسے میرے بازو میں کوئی شے چبھی ہے۔ میں نے کوشش کی تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے دیکھا کہ میرے اسٹریچر کی بائیں جانب ایلس کی نرس خادمہ فاطمہ کھڑی تھی اور میرے بازو میں کوئی انجکشن لگا رہی تھی۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ یہ عورت نہ جانے کس دوائی کا انجکشن لگا رہی تھی۔ یہاں سب میرے دشمن تھے۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ انجکشن کی دوائی میرے خون میں حل ہو کر میرے حواس کو کچھ توانائی دے رہی تھی۔ میں نے بولنا چاہا مگر مجھ سے بولا نہ گیا۔ فاطمہ نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں دل

میں حیران ہوا کہ یہ ایسا اشارہ کیوں کر رہی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ فاطمہ بڑے تیز تیز قدموں سے آپریشن کے آلات کی الماری کے پاس گئی۔ الماری میں انجکشن کی سرنج رکھی۔ شیشے کا دروازہ بند کیا۔ تیز تیز قدموں سے میرے اسٹریچر کے پاس آئی اور جلدی جلدی چمڑے کی پٹیاں جس کے ساتھ میں اسٹریچر پر بندھا ہوا تھا کھولنے لگی۔ اس نے سہارا دے کر مجھے اسٹریچر پر بٹھا دیا اور آہستہ سے انگریزی میں پوچھا۔

"کیا تم چل سکتے ہو؟"

میں نے اشارے سے کہا۔ "ہاں" میں فاطمہ کے سہارے اسٹریچر سے اترا۔ میرے پاؤں ڈگمگا گئے۔ اس نے مجھے تھام لیا اور آہستہ سے کہا۔

"اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو تمہیں اپنے پاؤں پر جتنی جلدی چل سکو چلنا ہوگا۔"

میرے اندر یہ جملہ سن کر جیسے ایک نئی طاقت آ گئی۔ میرے جسم پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ میرے اوپر جو چادر پڑی تھی وہی میں نے جسم کے گرد لپیٹ لی اور فاطمہ کا ہاتھ تھام کر دروازے کی طرف بڑھا۔ ٹانگوں میں مجھے کمزوری ضرور محسوس ہو رہی تھی مگر میں چل سکتا تھا۔ فاطمہ نے آہستہ سے دروازے کو کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا۔ پھر مجھے لے کر باہر کوریڈور میں آ گئی۔ یہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کونے میں صرف ایک کمزور سا بلب روشن تھا۔ وہ تیز تیز چل رہی تھی اور مجھے بھی اپنے ساتھ تیز تیز چلا رہی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ فاطمہ میری ہمدرد ہے اور مجھے موت کے منہ سے نکالنے آئی ہے۔ زندہ بچ جانے کے احساس نے میرے اندر توانائی بھر دی تھی۔ میں اس کے ساتھ تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ کوریڈور بائیں جانب مڑ گیا تھا۔ یہاں ایک دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ بنا ہوا تھا جو بند تھا۔ فاطمہ نے اپنے ایپرن کی جیب میں سے ایک چابی نکال کر تالے میں گھمائی۔ دروازہ کھل گیا۔ وہ مجھے کھینچتی ہوئی دروازے کے اندر لے گئی اور اندر جاتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ دروازے کا تالا اپنے آپ لگ گیا تھا۔ میں ایک نیم روشن چھوٹے سے سٹور میں کھڑا تھا۔ فاطمہ لکڑی کی الماریوں کی جانب آئی۔ یہاں ایک زینہ نیچے جاتا تھا۔ زینے کے آخر میں نیچے ایک بلب جل رہا تھا۔

وہ مجھے ساتھ لے کر زینے سے اترنے لگی۔ وہ کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔ میں تو ویسے ہی بول نہیں سکتا تھا۔ مجھے نیچے کمرے میں آ کر ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ یہ دیکھ کر مجھ پر خوف سا طاری ہو گیا کہ اس کمرے میں دیواروں کے ساتھ مردہ لاشیں اسٹریچروں پر پڑی تھیں۔ فضا میں عجیب قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ فاطمہ مجھے یہاں سے نکال کر ایک تنگ سی راہداری میں سے گزرنے لگی۔ یہاں بھی زیادہ روشنی نہیں تھی۔ راہداری کے موڑ میں جا کر فاطمہ رک گئی۔ یہاں ایک بند دروازہ تھا۔ فاطمہ نے مجھے آہستہ سے کہا۔

"ٹھہرو۔"

اس دروازے کو بھی آٹومیٹک لاک لگا ہوا تھا اور صرف چابی سے ہی کھل سکتا تھا۔ فاطمہ اس کی چابی بھی اپنے ساتھ لائی تھی۔ اس نے دروازے کو آہستہ سے کھولا تو پہلی بار مجھے تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہوا۔ باہر اندھیرا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ سردی تھی اور میرے جسم پر کپکپی سی طاری ہونے لگی۔ فاطمہ نے جھک کر دھیمی آواز میں کہا۔

"سامنے درختوں کے جھنڈ میں ایک گاڑی کھڑی ہے اس کی پچھلی سیٹ کھول کر بیٹھ جانا۔ وہاں دو کمبل پڑے ہیں۔ ڈرائیور تمہیں ایک مکان میں پہنچا دے گا۔ میں تمہیں وہاں ملوں گی۔ جتنی تیز چل سکتے ہو چل کر گاڑی تک پہنچو۔"

فاطمہ نے مجھے باہر دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔ میں ہسپتالوں والی سفید چادر جسم پر لپیٹے ٹھٹھر رہا تھا۔ باہر اندھیرے میں اب مجھے کچھ کچھ نظر آنے لگا تھا۔ میں نے آسمان پر تارے چمکتے دیکھے۔ میں تقریباً دوڑ کر سامنے والے درختوں کے پاس چلا گیا۔ وہاں ایک طرف کار کھڑی تھی۔ کار میں اندھیرا تھا۔ فاطمہ نے مجھے جیسے کہا تھا اس کے مطابق میں نے جاتے ہی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور کار میں گھس گیا۔ سیٹ پر کمبل تھے۔ میں نے ایک کمبل اوپر لے لیا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی کار کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ درختوں میں سے نکل کر ایک طرف کو روانہ ہو گئی۔ مجھے اگلی سیٹ پر ڈرائیور کا ہیولا سا نظر آیا۔ میں کمبل اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر سیٹ پر لیٹ گیا اور خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ اس نے فاطمہ کو رحمت کا فرشتہ بنا کر میری مدد کو بھیج دیا۔

گاڑی کسی سڑک پر کافی تیز چل رہی تھی۔ پھر اس کی رفتار ہلکی ہو گئی اور ایک طرف مڑ گئی۔ جس سڑک پر وہ مڑی تھی وہ ناہموار تھی۔ گاڑی کو وہاں ہلکے ہلکے دھچکے لگ رہے تھے۔ اسی طرح چلتے ہوئے گاڑی نے کئی موڑ کاٹے۔ پھر وہ سڑک کی چڑھائی چڑھنے لگی۔ میں نے کھڑکی کے بند شیشے میں سے باہر دیکھا۔ باہر کسی طرف سے کوئی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے اپنا سر سیٹ کے ساتھ لگا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ڈرائیور بالکل خاموش تھا۔ اس نے اب تک مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں ذرا سا کھانسا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری آواز واپس آ رہی ہے۔ میں نے حلق سے ایسی آواز نکالی جیسے کوئی درد سے ہائے کرتا ہے۔

یہ دیکھ کر میری جان میں جان آ گئی کہ میں بول سکتا تھا۔ میری آواز واپس آ گئی تھی۔ میری ہائے کی آواز پر بھی ڈرائیور نے گھوم کر پیچھے نہ دیکھا۔ یہ کسی پہاڑی کی چڑھائی تھی۔ چڑھائی ختم ہوئی تو ڈھلان آ گئی۔ گاڑی اب نشیب پر اتر رہی تھی۔ پھر سڑک سیدھی ہو گئی۔ مگر سڑک غیر ہموار تھی اور تھوڑی دیر بعد دھچکا لگتا تھا۔ دونوں کمبلوں نے مجھے گرم کر دیا تھا۔

اچانک گاڑی نے ایک موڑ کاٹا۔ اس کی رفتار ہلکی ہونے لگی۔ پھر وہ ایک طرف گھوم کر کھڑی ہو گئی۔ میں پچھلی سیٹ پر ہی پڑا رہا۔ ڈرائیور اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ وہ میری طرف آنے کی بجائے ایک طرف چل دیا۔ میں نے سر اٹھا کر منہ شیشے کے ساتھ لگا کر باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ یہاں بھی باہر کہیں کوئی روشنی نہیں تھی۔ رات کے اندھیرے میں مجھے آس پاس درختوں کے سیاہ ہیولے ہی نظر آ رہے

تھے۔ ان درختوں میں ایک چھوٹا سا کاٹیج تھا جس کا دھندلا سا خاکہ دکھائی دے رہا تھا۔ ڈرائیور اس کاٹیج کے پاس جا کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ میں نے سر سیٹ کی پشت سے لگا دیا۔ مجھے بھوک اور پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ڈرائیور گاڑی کی طرف آیا۔ اس نے دروازہ کھول کر انگریزی میں صرف اتنا کہا۔ ''Come'' اور کاٹیج کی طرف چل پڑا۔ میں گاڑی سے نکلا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ کاٹیج کا پرانا دروازہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ اندر اندھیرا تھا۔ ڈرائیور نے ایک موم بتی جلا کر میز کے کونے سے لگا دی اور دروازے کے پاس جا کر بولا۔

''میں دروازے کو باہر سے تالا لگا کر جا رہا ہوں' میری بہن فاطمہ تھوڑی دیر میں آ جائے گی۔ اس کے پاس دوسری چابی ہے' کھڑکی کو بند ہی رکھنا۔''

یہ کہہ کر وہ دروازہ باہر سے لاک کر کے چلا گیا۔

میں نے موم بتی کی دھیمی روشنی میں کاٹیج کے کمرے کا جائزہ لیا۔ میں ابھی تک میز کے پاس کھڑا تھا۔ چھوٹا سا شکستہ کمرہ تھا۔ دیواروں کا پلستر اکھڑ رہا تھا۔ کونے میں ایک لوہے کا پلنگ بچھا تھا' اس قسم کے پلنگ ہسپتالوں میں ہوتے ہیں۔ پلنگ پر خاکی گدیلا اور دو کمبل تہہ کر کے رکھے ہوئے تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ یہ کمبل آج ہی کسی نے یہاں لگائے ہیں۔ ایک لکڑی کی پرانی کرسی میز کے پاس ہی پڑی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں کچھ نہیں تھا۔ عقبی دیوار میں مجھے ایک دروازہ نظر آیا۔ میں نے اسے آہستہ سے کھولا۔ یہ باتھ روم تھا۔ میں دروازہ بند کر کے پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں گاڑی سے بھی ایک کمبل جسم کے گرد لپیٹ کر یہاں آیا تھا۔ فضا میں کچھ ٹھنڈک تھی۔ میں نے پلنگ پر سے اور کمبل جسم کے گرد لپیٹا اور سمٹ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ مجھے سخت کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ پیاس لگی تو میں جلدی سے اٹھ کر باتھ روم گیا۔ سنک کا نلکا کھولا' پانی آ رہا تھا۔ میں نے تھوڑا سا پانی پیا اور واپس پلنگ پر آ کر لیٹ گیا۔

موم بتی کی دھیمی روشنی میں کمرے کی فضا آسیب زدہ لگ رہی تھی۔ باہر وحشت ناک خاموشی تھی۔ کوئی پتہ نہیں تھا کہ رات کتنی گزر گئی ہے۔ نقاہت کی وجہ سے ڈرائیور سے بھی میں نے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ فاطمہ کا بھائی تھا۔ اب میں فاطمہ کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ ہسپتال میں موت کے اسٹریچر پر پڑے پڑے میرا جسم پتھر کی طرح سخت ہو گیا ہوا تھا۔ اب میں چاہتا تھا کہ بیٹھا رہوں۔ چنانچہ میں پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ کمبلوں میں مجھے بڑا سکون مل رہا تھا۔ سردی کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد جلدی سے دوبارہ آنکھیں کھول لیتا اور کان لگا کر باہر کی آوازیں سننے کی کوشش کرنے لگتا۔ باہر کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ مگر یہ میرا خوف تھا۔ میں اپنے خیال میں ابھی تک خطرے سے باہر نہیں تھا۔ میری جان ابھی تک خطرے میں تھی۔ میں موت کے ہسپتال سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اگر فاطمہ کو وہاں سے

ڈاکٹروں نے پکڑ کر اس پر تشدد کیا اور انہیں میرے ٹھکانے کا پتہ چل گیا تو وہ ضرور یہاں آ کر مجھے پکڑ لیں گے۔ میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ میری کس چیز کا "آپریشن" کرنا چاہتے تھے۔ کیا وہ میرے جسم کے سارے اعضائے رئیسہ اندر سے نکال کر بوتلوں میں بند کر کے ہسپتال کی زینت بنانا چاہتے تھے؟ میں نے اکثر ہسپتالوں میں ایسے شیشے کے مرتبان دیکھے ہوئے تھے جن میں انسانی دل، گردے اور جگر رکھے ہوتے ہیں۔ پھر خیال آیا کہ یہ تپ دق کا ہسپتال تھا۔ ہو سکتا ہے یہ ڈاکٹر میرے صحت مند پھیپھڑے نکال کر مرتبان میں ڈال کر نمائش کے لیے رکھنا چاہتے ہوں کہ ڈاکٹری کے طالب علموں کو دکھائیں کہ دیکھو صحت مند پھیپھڑے ایسے ہوتے ہیں۔

یہی سوچتے سوچتے ایک بار پھر مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی اور میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ لیکن مجھے باہر کی فضا کا بھی احساس تھا۔ نہ جانے کتنا وقت گزر چکا تھا کہ مجھے باہر گاڑی کے رکنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے پلنگ پر سے اٹھا اور دروازے کے سوراخ میں سے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ دروازے میں کوئی سوراخ نہیں مل رہا تھا۔ میں نے جہاں تالا لگا تھا اس کے سوراخ میں سے باہر دیکھنے کی کوشش کی مگر باہر اندھیرا تھا، کچھ نظر نہ آیا۔ پھر انسانی قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ قدم دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں دوڑ کر پلنگ کے پیچھے چھپ گیا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا کہ اگر کوئی ہسپتال کا ڈاکٹر اندر داخل ہو تو اس کے سر پر ضرب لگا سکوں۔

تالے میں چابی لگنے کی آواز آئی۔ یہ میری محسن فاطمہ ہی ہو سکتی تھی۔ میں جلدی سے پلنگ پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ دروازہ کھلا اور جلدی سے بند ہو گیا۔ فاطمہ اندر آ چکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک تھیلا تھا۔ وہ میز کے پاس آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ موم بتی کی روشنی میں اس کا چہرہ مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ تھیلے میں سے اس نے ایک پیکٹ نکال کر میز پر رکھا۔ پھر ایک لفافہ نکالا اور کہنے لگی۔

"اس میں کچھ سینڈوچ ہیں، تھرماس میں کافی بھی ہے ـــــــ تمہیں ہم تین دن سے لیکوئڈ خوراک دے رہے تھے۔ شاید تمہیں زیادہ بھوک محسوس نہیں ہو رہی ہوگی۔"

اس نے لفافے میں سے سینڈوچ نکال کر کاغذی پلیٹ پر رکھ کر میری طرف بڑھائے۔ میں سینڈوچ کھانے لگا۔ میں نے پوچھا۔

"فاطمہ! میں تمہارا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا، مگر مجھے ایک بات تو بتاؤ ــــــــ یہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والے تھے؟"

فاطمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھرماس میں سے اس نے کافی کاغذ کے گلاس میں ڈالی اور میرے پاس رکھ دی۔ پھر پیکٹ کھولا۔ اس میں سے میرا بٹوہ نکالا۔ کہنے لگی۔

"اس میں تمہارا پاسپورٹ بھی ہے اور کچھ اطالوی لیرے بھی۔ تمہارے کپڑے میں نہیں لا سکی کیونکہ اس قسم کے کیس میں ڈاکٹر سب سے پہلے مریض کے کپڑے جلا ڈالتے ہیں۔"

میں نے فوراً پوچھا۔

”مگر مجھے کون سا مرض تھا۔ میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس مکار ہلن نے مجھے ڈرنک میں نہ جانے کیا پلا دیا کہ میں تو بالکل پتھر بن گیا تھا۔“

فاطمہ نے تھرماس کے ڈھکنے میں اپنے بیگ تھرماس میں سے کافی ڈالی اور اس کے دو تین گھونٹ بڑے اطمینان سے پی کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی حمایت تھی۔ چہرے پر ایک معصوم روشنی اور رحمت تھی جو کسی بہن کے چہرے پر اس وقت آجاتی ہے جب وہ اپنے بھائی کو کسی مصیبت سے بچا لے۔

میں نے کہا۔

”فاطمہ بہن! تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ یہ لوگ میرا کون سا آپریشن کرنے والے تھے؟“

فاطمہ نے بلیک کافی کا گھونٹ بھرا اور بولی۔

”تم جلدی جلدی کھانا ختم کرو۔ ہمیں دن نکلنے سے پہلے پہلے میرے بھائی کے ساتھ ایک دوسری جگہ نکل جانا ہے۔“

”کیا تمہارا بھائی تمہارے ساتھ آیا ہے؟“

”ہاں، مگر وہ واپس ہسپتال چلا گیا ہے، میں نے خود اسے بھیجا ہے۔ تمہیں ابھی معاملے کی سنگینی کا احساس نہیں ہے۔ میں نے وہ کام کیا ہے جو آج تک کوئی نہیں کر سکا۔ جانتے ہو کہ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ میں نے ہی تمہیں ہسپتال سے بھگا دیا ہے تو وہ میرے ساتھ اور میرے ڈرائیور بھائی کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ نہیں، تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔“

میں نے جلدی جلدی سینڈوچ کھا لیے، کافی بھی ساری ختم کر دی۔ فاطمہ نے اپنی جیکٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس نکال کر مجھے دی۔

”یہ سگریٹ اور ماچس بھی تمہاری پتلون کی جیب سے نکلی تھی۔ مگر یہاں سگریٹ مت پینا، تمباکو کی بو باہر جنگل میں چلی جائے گی۔“

سگریٹ پینے کو میرا بری طرح دل چاہ رہا تھا مگر یہ میری اور فاطمہ بہن کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ میں نے سگریٹ کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ میں نے کہا۔

”میرے پاس کپڑے نہیں فاطمہ بہن!“

اس نے خالی لنچ باکس اور کاغذوں کو لفافے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”میرا بھائی آتے ہوئے تمہارے لیے کپڑے بھی لیتا آئے گا۔ میرا خیال ہے تمہیں اس کے کپڑے پورے آجائیں گے۔ تم دونوں کا

جسم اور قد ایک جیسا ہی ہے۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے فاطمہ سے پھر وہی سوال کر دیا جس کا جواب دینے سے وہ گریز کر رہی تھی اور جس کا جواب سننے کے لیے میں بے تاب تھا۔

"فاطمہ بہن! یہ ڈاکٹر لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والے تھے؟"

فاطمہ اٹھ کر دروازے تک گئی۔

دلوں کی پیوند کاری

اس نے دروازے کو تھوڑا سا کھول کر باہر دیکھا۔ پھر دیوار میں جو کھڑکی بند تھی اس کے پاس جا کر کھڑکی کو ذرا سا کھول کر باہر جھانک کر دیکھا۔ کھڑکی کو بند کر دیا اور میرے پلنگ کے پاس کرسی پر آ کر اپنی گرم جیکٹ کو سمیٹ کر بیٹھ گئی۔ جیسی بھی ہمیں انگریزی آتی تھی' ہم اسی میں بات کر رہے تھے۔ کیونکہ فاطمہ بہن کو عربی' فرانسیسی اور اطالوی زبانوں کے علاوہ انگریزی بھی تھوڑی تھوڑی آتی تھی۔ میں اس کی باتوں کو صحیح اور پورے مفہوم کے ساتھ اردو میں یہاں آپ کے لیے لکھ رہا ہوں۔

فاطمہ نے کہا۔

"برادر! یہ ہسپتال ایک بڑے مشہور ٹرسٹ کا ہسپتال ہے۔ یہاں ایسے مریضوں کو لا کر رکھا جاتا ہے جن کی بیماری قبر سے دو درجے تک پہنچ گئی ہوتی ہے۔ یہی ٹوریم کے ڈاکٹر بڑے شفیق اور مریضوں کے ہمدرد ڈاکٹر ہیں۔ مگر پچھلے تین برسوں سے یہاں خفیہ طور پر ایک بڑا ہی گھناؤنا کاروبار ہو رہا ہے۔ یہ گھناؤنا کاروبار سینی ٹوریم کے لالچی اور بدکردار ڈاکٹر نے شروع کیا جو شہر کے ہسپتال سے تبدیل ہو کر یہاں آیا تھا۔ ضرور وہ شہر والے ہسپتال میں بھی یہی مکروہ دھندہ کرتا رہا ہوگا۔"

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ کاروبار کیا تھا؟"

فاطمہ کا چہرہ موم بتی کی روشنی میں بڑا پراسرار لگنے لگا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں دبا رکھے تھے اور کرسی پر سمٹ کر بیٹھی تھی' کہنے لگی۔

"اس بدکردار ڈاکٹر کا شہر کے ایک جرائم پیشہ گروہ سے تعلق ہے۔ اس گروہ کے آدمی اٹلی اور یورپ کے ایسے ارب پتی بوڑھوں سے رابطہ قائم کرتے ہیں جو دل کے مریض ہوتے ہیں اور جنہیں ڈاکٹروں نے کہہ دیا ہوتا ہے کہ ان کے دل کے مرض کا صرف ایک ہی علاج ہے کہ ان کا دل تبدیل کر دیا جائے مگر اس کے لیے کسی ایسے شخص کا دل لگایا جا سکتا ہے جسے مرے تھوڑی دیر ہوئی ہو۔ اس میں بھی گارنٹی نہیں

دل جا سکتی کہ مردہ دل ان کی بوڑھی شریانوں کے ساتھ جڑ کر دوبارہ دھڑکنے لگے گا یا نہیں۔"

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اور میں ہمہ تن گوش ہو کر فاطمہ کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے دل کا آپریشن ہونے والا ہے۔ فاطمہ کہہ رہی تھی۔

"یہ بدکردار ڈاکٹر ان ارب پتی بوڑھے دل کے مریضوں سے رابطہ کر کے ان سے بیس لاکھ ڈالروں میں سودا طے کرتا ہے کہ ہم کسی نوجوان کا تندرست و صحت مند دھڑکتا ہوا دل نکال کر تمہارے بوڑھے بیمار دل کی جگہ لگا دیں گے اور یوں تم باقی زندگی ہارٹ اٹیک سے بے خوف ہو کر مزے سے بسر کر سکو گے۔"

"میرے خدا۔۔۔۔۔۔۔" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

میں فاطمہ کے چہرے کو تک رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"یورپ اور خاص طور پر اٹلی میں ایسے ارب پتی بوڑھے صنعت کاروں کی کمی نہیں ہے جن کے بیمار دل ناکارہ ہو چکے ہیں اور جو کسی وقت بھی مر سکتے ہیں۔ ان بیمار ارب پتی بوڑھوں کے لیے بیس لاکھ ڈالر کی رقم کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ وہ اپنے ناکارہ بیمار اور ناقابل اعتبار دل کی جگہ کسی صحت مند نوجوان کا دل لگوانے پر فوراً راضی ہو جاتے ہیں اور بیس لاکھ ڈالر ادا کر دیتے ہیں۔"

"ایسے نوجوان کہاں سے پکڑے جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔کیا پولیس کو پتہ نہیں چلتا؟"

فاطمہ نے کہا۔

"جیسے تم پکڑے گئے ہو۔ باقی پولیس کیا کر سکتی ہے جب کہ جس نوجوان کا دل نکالا گیا ہوتا ہے اس کی لاش بھی نہیں ملتی۔ اس مقصد کے لیے عام طور پر اٹلی میں وارد ہونے والے غیر ملکی سیاح نوجوانوں کو پھانسا جاتا ہے۔ ایلس اس مکروہ گروہ کی آلۂ کار ہے۔ وہ رات کے وقت کسی نوجوان سیاح کو دیکھتی ہے اور پھر اسے لفٹ دے کر اس سے محبت کا اظہار کر کے ہسپتال کے ریسٹ ہاؤس میں لاتی ہے اور اس کے ساتھ وہی کچھ ہوتا ہے جو تمہارے ساتھ ہوا اور ہونے والا تھا۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا سینی ٹوریم میں بھی کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ یہاں اس قدر گھناؤنا کاروبار ہو رہا ہے؟"

"یہ کام بڑی رازداری کے ساتھ کیا جاتا ہے۔" فاطمہ کہنے لگی۔ "ہسپتال کے صرف تین ڈاکٹر اس مکروہ دھندے میں شامل ہیں۔"

"اور تم بھی اس گروہ میں شامل ہو گئی؟"

میرے سوال پر فاطمہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی پھر کہنے لگی۔

''اس گروہ کے بدکردار ڈاکٹر کو جو سرغنہ ہے ہم سب کی کمزوریوں کا علم ہے۔ دوسرے ڈاکٹروں کو وہ بھی دولت میں سے مناسب حصہ دیتا ہے۔ میں نے اس کام میں آلۂ کار بننے سے انکار کیا تو سنگ دل ڈاکٹر نے کہا کہ وہ میری اکلوتی بیٹی کو جو الجزائر میں ہے قتل کروا کر اس کی لاش میرے کمرے میں پھنکوا دے گا۔ میں جانتی ہوں وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اس کے قاتل ساتھی یورپ کے ہر ملک میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہسپتال میں ایک دوسری نرس نے اس گروہ کا کاروبار میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اس شیطان صفت ڈاکٹر نے پہلے اس کے ماں باپ کو قتل کروا دیا۔ نرس نے پولیس میں رپورٹ کرنے کی دھمکی دی تو دوسرے روز اس کی لاش اس کے کمرے میں خون میں لت پت پڑی تھی۔ اس کا قاتل آج تک نہیں مل سکا۔ برادر، میں ایک کمزور سی عورت ہوں۔ میری ایک ہی بیٹی ہے جو الجزائر میں رہ رہی ہے۔ اس کے دو بچے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ قتل ہو جائے۔ چنانچہ میں شیطان ڈاکٹر کے ساتھ مل گئی ہوں مگر میں نے آج تک اس سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا کہ شاید خدا اس کے بدلے میرے گناہوں کو معاف کر دے۔''

''آج تک اس ہسپتال میں کتنے سیاحوں کے دل نکال کر انہیں موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے؟''

میرے سوال پر فاطمہ نے ہلکی سی آہ بھر کر کہا۔

''تین برس میں صرف تین کیس اب تک ہوئے ہیں۔ تمہارا نمبر چوتھا تھا۔''

''اور ان تینوں نوجوانوں کی لاشوں کا کیا بنا؟''

''ڈاکٹروں اور خاص طور پر سرجن ڈاکٹروں کے لیے کسی لاش کو ٹھکانے لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ان تینوں نوجوان سیاحوں کی لاشوں کو تیزاب کے ٹب میں ڈال کر تحلیل کر دیا گیا تھا۔ سیاحوں کو یہ لوگ اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ ان کا کوئی یہاں ولی وارث نہیں ہوتا۔ ویسے شہر کے دوسرے آوارہ گرد عیاشی پسند نوجوانوں کو بھی پھانس لیا جاتا ہے۔''

میں نے فاطمہ سے پوچھا کہ اس نے مجھے کس لیے بچا لیا بلکہ اپنی اور اکلوتی بیٹی کی زندگی خطرے میں ڈال کر مجھے بچانے کی کوشش کیوں کی۔ اس کے جواب میں فاطمہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

''کیونکہ تم مسلمان ہو۔ جب معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایک مسلمان ملک کے مسلمان نوجوان سیاح کو قتل کرنے والے ہیں اور پولیس نے تمہارے سامنے مجھے بتایا کہ تم بھی مسلمان ہو تو میں نے اسی وقت تمہاری جان بچانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے ایک بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ خداوند کریم میرے اس عمل کے بدلے میرے گناہوں کو معاف کر دے گا۔''

فاطمہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس گئی۔ کھڑکی کا پٹ تھوڑا سا کھول کر اس نے باہر دیکھا۔ جلدی سے پٹ بند کر دیا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"یوں اس جگہ سے یہاں کوئی نہیں آتا۔ پھر بھی مجھے بے حد احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ صبح تمہارا آپریشن ہوگا۔"

اس نے اپنی کلائی پر لگی ہوئی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"اس وقت رات کے تین بج رہے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد تمہیں اس کمرے سے نکال کر جہاں سے میں تمہیں اٹھا کر لائی ہوں آپریشن تھیٹر میں لے جایا جائے گا۔ تھیٹر کا رب پتی تاجر کل رات سے ہسپتال میں ہی ہے۔ آپریشن ایک خفیہ آپریشن تھیٹر میں ہوتا ہے جو ریسٹ ہاؤس کے نیچے ایک خفیہ تہہ خانے میں بنایا گیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں نے آج دو ڈاکٹروں کے ساتھ ایک سنہری چشمے والے بوڑھے کو دیکھا تھا۔ اس نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔"

فاطمہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا دل اس کے سینے میں ٹرانس پلانٹ کیا جانا تھا۔"

میرے جسم میں دہشت کے مارے سنسنی سی دوڑ گئی۔ اگر فاطمہ مجھے بچا کر نہ لے آتی تو یہ رات میری زندگی کی آخری رات تھی اور صبح میری لاش تیزاب کے ٹب میں تحلیل ہو چکی ہوتی۔ فاطمہ نے ایک بار پھر گھڑی پر وقت دیکھا اور اٹھ کر دروازے کے پاس چلی گئی۔ دروازے میں چابی لگائی۔ پہلے ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ پھر سے بند کر دیا اور واپس آ کر بولی۔

"بھائی کو اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ مجھے واپس اپنے کوارٹر میں بھی جانا ہے۔ کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ میں کوارٹر سے رات کو غیر حاضر تھی۔ میں پکا بندوبست کر کے آئی ہوں اور غسل خانے کی کھڑکی سے باہر نکلی تھی۔"

میں نے کہا۔ "فاطمہ بہن! مجھے کسی طرح یہاں سے نکال کر اگلے شہر پہنچا دو۔"

فاطمہ نے کہا۔

"قاتلوں کے اس گروہ کے آدمی ہر شہر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر ایک بار تم وینس پہنچ گئے تو وہ اتنا بڑا شہر ہے کہ تم آسانی سے ان کے ہاتھ نہیں آؤ گے۔ ویسے بھی ان کے پاس تمہاری تصویر وغیرہ نہیں ہے اور پھر انہیں زیادہ تردد کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ بدخصلت اسی بہت جلد کسی دوسرے شکار کو پھانس لے گی۔ یہ بہار کا موسم ہے اس موسم میں اٹلی میں بڑے سیاح آتے ہیں لیکن آج کی رات اور کل کا دن تمہیں اسی جگہ چھپ کر رہنا ہوگا۔"

"وینس یہاں سے کتنی دور ہے؟ کیا میں کسی ٹرین میں نہیں جا سکتا؟ مگر میرے پاس تو وینس تک کا کرایہ بھی نہیں ہے۔"

فاطمہ کہنے لگی۔

''اس کی تم فکر نہ کرو، میں تمہیں کچھ رقم دے دوں گی۔ میرا بھائی تمہیں ایسے مقام پر چھوڑ آئے گا، جہاں سے تم آسانی سے وطن پہنچ سکو گے۔''

وہ باتیں کر رہی تھی کہ باہر گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ فاطمہ نے جلدی سے کہا۔

''بھائی آ گیا ہے۔''

میں اٹھنے لگا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھے رہنے کو کہا اور خود دروازے کا پٹ ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ باہر سے ایک مخصوص سیٹی کی آواز سنائی دی۔ فاطمہ نے آدھا دروازہ کھول دیا۔ فاطمہ کا بھائی اندر آ گیا تو دروازہ بند کر دیا گیا۔ وہ میرے لیے کپڑے لایا تھا۔ ان میں ایک فلالین کی پتلون، ایک قمیص اور ایک سویڈن کی گرم جیکٹ، بوٹ، جرابیں وغیرہ تھیں۔ کپڑے مجھے پورے آ گئے تھے۔ بوٹ اور جیکٹ کے سوا سارے کپڑے میں نے پہن لیے اور پلنگ پر فاطمہ کو عربی زبان میں اپنے بھائی سے باتیں کرتا سنتا اور دیکھتا رہا۔ فاطمہ نے اپنی بات ختم کر کے میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

''میرے بھائی سعد نے بتایا ہے کہ ریسٹ ہاؤس کی عمارت میں اس نے دو ڈاکٹر داخل ہوتے دیکھے ہیں۔ اس کا مطلب ہے آپریشن کی تیاریاں شروع ہو رہی ہیں۔ اب مجھے جلدی اپنے کوارٹر میں واپس پہنچنا ہوگا۔ کیونکہ مجھے کسی وقت بھی بلایا جا سکتا ہے۔ اور ہاں تم ہمارے جانے کے بعد اندر سے دروازے کی چٹخنی لگا دینا۔ مگر ہیرو سگریٹ سلگانے کی غلطی مت کرنا۔ تمباکو کی بو جنگل کے کسی بھی چوکیدار کو اس کاٹیج کی طرف لا سکتی ہے۔ دوپہر کو تمہیں میرا بھائی کھانا لا کر دے گا۔ اگلا پروگرام تمہیں میرا بھائی سعد بتا دے گا۔ او کے ۔۔۔۔۔ فی امان اللہ۔''

فاطمہ نے عربی میں مجھے خدا حافظ کہا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اللہ کے پاک نام نے مجھے بچایا تھا اور فاطمہ کو میری زندگی بچانے کا ایک سبب بنا کر میرے پاس بھیجا تھا۔ جب فاطمہ اور اس کا بھائی کاٹیج کے کمرے سے نکل گئے تو میں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی اور پلنگ پر سجدے میں گر گیا۔ میں خداوند کریم کا شکر ادا کر رہا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میں نے اللہ کے حضور وعدہ کیا کہ آئندہ کسی لڑکی کے بارے میں دل میں برے خیال نہیں لاؤں گا۔ یا اللہ میرے گناہ معاف کر دینا۔ یا اللہ میرے گناہ معاف کر دینا۔

سجدے میں سے سر اٹھانے کو میرا دل نہیں چاہتا تھا۔ میں وہیں ایک طرف پہلو میں ہو کر لیٹ گیا اور پھر مجھے نیند آ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو بند کھڑکی کی درزوں میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ موم بتی لوہے کی میز پر لگی لگی نہ جانے رات کے کس وقت پگھل کر بجھ گئی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا اسے ذرا سا کھول کر باہر جھانک کر دیکھا۔

باہر موسم بہار کی چمکیلی دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ صنوبر اور یوکلپٹس کے درختوں کے جھنڈ اور پہاڑیوں کی ڈھلانوں تک

چلے گئے تھے۔ بخار کے اتر جانے نے مجھے تازہ دم کر دیا۔ غسل خانے میں جا کر میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ فاطمہ کے بھائی سعد کے کپڑے میں رات کو پہن کر ہی سویا تھا۔ اب میں نے اس کے جوتے بھی پہن لیے تھے۔ یہ اطالین جوگر شوز تھے جو کافی آرام دہ تھے۔ مجھے وہاں کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ میرا دل سگریٹ پینے کو بے تاب ہو رہا تھا مگر میں یہ غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ کھڑکی بند کر کے میں پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور حالات پر غور کرنے لگا۔ میں ابھی تک خطرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ ایک دھڑکا سا دل کو لگا ہوا تھا۔ دن کافی نکل آیا تھا اور اس وقت تک میرے فرار کا علم متعلقہ ڈاکٹروں کو ہو چکا ہوگا اور ہو سکتا تھا کہ ان کے آدمی میری تلاش میں نکل بھی چکے ہوں۔ مجھے اٹلی میں داخل ہونے سے پہلے اور بعد میں بہت سے لوگوں نے خبردار کیا تھا کہ میں چوکس رہوں اور خاص طور پر رات کو سفر نہ کروں۔ مگر میں نے اس پر عمل نہ کیا اور جوانی کے جوش میں ان لوگوں کی ہدایات اور نصیحتوں کو فراموش کر دیا۔

میں ان نوجوانوں کو جو اٹلی کی سیاحت کرنے کے خواہش مند ہوں' نصیحت کروں گا کہ وہ یورپ کے کسی ملک میں بھی اور خاص طور پر اٹلی میں رات کو سفر کرنے کی غلطی ہرگز نہ کریں۔ میرے ساتھ جو خوفناک واقعہ گزرا ہے اس سے سبق حاصل کریں۔ میری قسمت اچھی تھی اور اللہ نے مجھے بچانا تھا سو میں بچ گیا ورنہ بظاہر میرے زندہ بچ جانے کی کوئی امید نہیں تھی۔

دوپہر کے وقت فاطمہ کا بھائی میرے لیے لنچ باکس میں بھنی ہوئی مچھلی اور ڈبل روٹی لے کر آیا۔ اس نے مجھے ایک لفافہ دیا اور کہنے لگا۔

"یہ میری بہن فاطمہ نے دیا ہے۔"

میں نے لفافہ کھولا تو اس میں دو ہزار لیرے کے نوٹ تھے۔ اس کا بھائی کہنے لگا۔

"یہ رقم تمہارے لیے ہے۔ تمہیں آگے اس کی ضرورت ہوگی۔"

میری آنکھوں میں ایک بہن کے اس ایثار پر آنسو آ گئے۔ سعد کہنے لگا۔ "اب میں جاتا ہوں' شام کو تم تیار رہنا میں اندھیرا ہوتے ہی آ جاؤں گا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ "پیچھے فاطمہ بہن پر تو کسی نے شک وشبہ نہیں کیا؟"

سعد نے نفی میں سر ہلا دیا اور دروازہ اندر سے بند رکھنے کی ہدایت کر کے چلا گیا۔ اس وقت اٹلی میں تین لیرے کی روٹی ملتی تھی جو ایک جوان آدمی مشکل سے کھا سکتا تھا۔ اس حساب سے آپ اندازہ لگا لیں کہ دو ہزار لیرے کی رقم جو فاطمہ بہن نے میرے لیے بھیجی تھی اس کی مالیت کتنی ہوگی۔ میں نے نوٹوں کے لفافے کو بٹوے میں رکھنے کی بجائے جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ کھانا کھا کر میں پلنگ پر لیٹ گیا۔ دروازے کی چٹخنی میں نے لگا دی تھی۔ میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ دل میں ڈر سا لگا تھا کہ کیا معلوم اس شیطانی گروہ کا کوئی آدمی میری تلاش میں اس کاٹیج کی طرف آ نکلے اور میں سوتے میں پکڑا جاؤں۔ مگر کھانا کھانے کے بعد مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے نیند کا

کافی مقابلہ کیا لیکن آخر ہار گیا اور نیند نے میری آنکھیں بند کر دیں۔

مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میں کب تک سویا رہا۔ جب آنکھ کھلی تو اٹھ کر کھڑکی کا پٹ کھول کر دیکھا۔ باہر سورج غروب ہو چکا تھا اور گلی کی پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر شام کے سائے اترنا شروع ہو گئے تھے۔ اب میں بے چینی سے فاطمہ کے بھائی کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ شیطانی گروہ کا کوئی آدمی اس طرف نہیں آیا تھا۔ آہستہ آہستہ شام گہری ہوتی گئی۔ پھر چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ ایک موم بتی مجھے سعد دے گیا تھا۔ میں نے اسے روشن کر کے میز پر لگا دیا۔ باہر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے پرندوں کی جو ایک آدھ آواز آ جاتی تھی اب وہ بھی نہیں آتی تھی۔ رات گزرتی چلی گئی۔ میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ آخر مجھے دور سے گاڑی کے انجن کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دی۔ میں نے لپک کر کھڑکی تھوڑی سی کھول دی اور باہر دیکھنے لگا۔

گاڑی کی آواز آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ پھر ایک گاڑی کچھ فاصلے پر آ کر رک گئی۔ انجن کی آواز آنا بند ہو گئی۔ میں آنکھیں پھاڑے باہر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک خوف یہ بھی تھا کہ کہیں یہ کوئی دشمن کا آدمی نہ ہو۔ اندھیرے میں مجھے ایک انسانی ہیولا کاٹیج کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ میں غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جب ہیولا قریب آیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ فاطمہ کا بھائی سعد تھا۔

میں کھڑکی بند کر کے جلدی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ سعد نے چابی لگا کر دروازہ کھولا اور میرے پاس آتے ہی بولا

"جلدی سے میرے ساتھ آ جاؤ۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

میں پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ کمرے میں میرا کچھ نہیں تھا۔ اسی وقت سعد کے ساتھ ہو لیا۔ گاڑی وہی تھی جس پر پہلے بھی وہ میرے کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے مجھے آگے اپنے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے سے روک دیا اور کہا۔

"پچھلی سیٹ پر بیٹھو وہاں کمبل پڑے ہیں۔ راستے میں کہیں روشنیاں نظر آئیں تو کمبل اوپر کر کے سیٹ پر لیٹ جانا۔۔۔۔۔۔۔ جلدی کرو۔"

موت کی وادی سے روانگی

اس نے انجن اسٹارٹ کر رکھا تھا۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ فوراً ہی گاڑی نے چھوٹا سا چکر کاٹا اور واپس روانہ ہو گئی۔ گاڑی کی بتیاں اس وقت بجھی ہوئی تھیں۔ جب گاڑی پہاڑی جنگل سے نکل کر چھوٹی سڑک پر آئی تو سعد نے ہیڈ لائٹس روشن کر دیں اور گردن ذرا سی موڑ کر مجھے کہا۔

"آگے جہاں روشنی آئے کمبل اوپر کر لینا۔"

میں نے سوچا کہ بار بار کمبل کون اوڑھے بہتر ہے کہ میں سیٹ پر لیٹ جاتا ہوں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ سیٹ پر دراز ہو کر میں

نے مکمل گردن تک کر لیا۔ میں نے سعد سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ اتنا ضرور پتہ تھا کہ وہ مجھے آگے وینس شہر کی طرف لے جا رہا ہے۔ گاڑی پہاڑی سڑکوں پر مختلف چکر کاٹتی ہوئی سڑک پر نکل آئی۔ اب مجھے دوسری گاڑیوں کی بھی آوازیں سنائی دیں جو تھوڑی تھوڑی دیر بعد گزر جاتی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ہائی وے ہے۔ بجلی کے کھمبوں کی روشنیاں بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد گاڑی کے اندر چمک جاتی تھیں۔ سعد گاڑی کافی تیز چلا رہا تھا۔ ویسے بھی یورپ کی ہائی وے پر گاڑی تیز ہی چلانی پڑتی ہے۔ میں کبھی سو جاتا اور کبھی جاگ پڑتا۔ کافی لمبے سفر کے بعد گاڑی کو سعد نے ایک دوسری سڑک پر موڑ دیا۔ میں نے ذرا سا سر اٹھا کر باہر دیکھا۔ سامنے کافی روشنیاں ہو رہی تھیں۔

سعد نے ان روشنیوں سے دور گاڑی کھڑی کر دی اور میری طرف گردن موڑ کر بولا۔

"سامنے ریستوران ہے۔ میں کافی پینے جا رہا ہوں۔ تمہیں اگر باتھ روم جانا ہے تو میرے ساتھ آ جاؤ۔"

میں نے کہا۔

"اگر کوئی خطرہ نہ ہو تو میں بھی ذرا ہاتھ پیر کھولنا چاہوں گا۔"

سعد نے جھک کر کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ پھر کھڑکی کھولتے ہوئے بولا۔

"آ جاؤ.......میرا خیال ہے ہم خطرے کے مقام سے کافی دور نکل آئے ہیں۔"

ہم ریستوران میں آ کر بیٹھ گئے۔ اکا دکا لوگ بیٹھے رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ کچھ کافی پی رہے تھے۔ سنہری بالوں والی عورتیں بھی بیٹھی اپنے ساتھیوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ مگر میں نے ان کو صرف ایک نظر ہی دیکھنے پر اکتفا کیا۔

اب میں سنہری بالوں والی عورتوں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کام سے توبہ کر لی تھی۔ ہم نے وہاں کافی پی۔ تھوڑے سے ویفر اور فرنچ فرائز بھی کھائے۔

میں نے اوپر تلے دو سگریٹ پیے۔

یہاں سے فارغ ہو کر ہم گاڑی میں آ گئے۔ سعد نے مجھے بتا دیا تھا کہ وینس یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے اور ہم ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وینس پہنچ جائیں گے۔ وینس کا نام سنتے ہی میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں اپنے خوابوں کے شہر کے قریب پہنچ چکا تھا۔

◆ ◆ ◆

خوابوں کا شہر......وینس

جب ہماری گاڑی وینس شہر کے مضافات میں داخل ہوئی تو میں نے کمبل پرے رکھا۔ اور خود کھڑکی کے شیشے سے لگا آس پاس کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر جگمگاتی نیلی پیلی روشنیوں کو بڑے اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔ سعد نے ایک طرف گاڑی روک دی اور کہا۔

"اب تم بے شک اگلی سیٹ پر آ جاؤ۔"

میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ جلدی سے اگلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی ابھی تک بڑی سڑک پر ہی تھی جس پر رات کے وقت بھی گاڑیاں ایک دوسری کے پیچھے آ جا رہی تھیں۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ اتار دیا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے میرے چہرے سے ٹکرائے تو میں نے وینس شہر کی خوشبو کو محسوس کیا۔ ہوا میں سمندری نمی بھی تھی۔ راستے میں کئی جگہوں پر دریاؤں کے پل بھی آئے۔ سعد نے بتایا کہ یہ دریا نہیں ہیں بلکہ سمندری کھاڑیاں ہیں اور چھوٹی چھوٹی جھیلیں ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وینس کا وہ علاقہ کہاں ہے جہاں گلیوں میں نہریں بہتی ہیں۔ سعد نے مسکرا کر کہا۔

"یہ علاقہ شہر کے مشرق اور جنوب میں ہے۔ ہم اس وقت شمال مغربی علاقے میں سے گزر رہے ہیں۔"

وینس کی تاریخ و تہذیب

وینس کا شہر چھوٹے چھوٹے جزیروں پر آباد ہے جن کے درمیان ایڈریاٹک سمندر کا پانی بہتا ہے۔ اس شہر کی تاریخ تقریباً ایک ہزار برس پرانی ہے۔ اٹلی کے تاریک دور میں جب وحشی صفت قبائل نے یورپ پر یلغار کی تو انہوں نے اٹلی میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ اٹلی کے شہر پاڈوا اور دوسرے قریبی شہروں کے لوگ اپنی جانیں بچا کر مشرق کی جانب سمندری جھیلوں کے درمیان بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدرتی جزیروں کے جھرمٹ کی طرف بھاگ کر آ گئے۔ ان جزیروں میں وہ وحشی قبائل کے قتل عام سے محفوظ تھے۔ کیونکہ جزیروں کے ارد گرد پانی گہرا تھا اور کچھ جزیرے ایسے تھے کہ جہاں پانی کم گہرا ہونے کی وجہ سے جہاز داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ پاڈوا اور دوسرے قریبی شہروں اور پہاڑی قصبوں سے بھاگ کر آئے ہوئے لوگوں نے یہاں پناہ حاصل کی اور وحشیوں سے جانیں بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان جزیروں میں تاریخ کے ابتدائی دور ہی سے ماہی گیر آباد تھے۔ نئے شہریوں نے ان کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے کا کام شروع کر دیا۔ شروع شروع میں یہ لوگ سمندری نمک بناتے۔ مچھلیاں پکڑ کر دوسرے شہروں میں کشتیوں پر جا کر فروخت کرتے۔ ان کا کاروبار سمندری

رہتے سے ہی جڑا تھا۔ چنانچہ ضرورت نے انہیں کامیاب ملاح بنا دیا۔ ان جزیروں پر جو زمین تھی انہوں نے اس پر کھیتی باڑی بھی شروع کر دی۔ ان جزیروں سے اپنے کاروبار کو مزید وسعت دی اور لمبے لمبے بحری سفر کرنے شروع کر دیئے۔ قسطنطنیہ کی بندرگاہوں پر انہوں نے جہاز رانی کا ہنر سیکھا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ ایڈریاٹک سمندر میں جو بحری قزاق لوٹ مار کرتے تھے انہوں نے ان پر بھی قابو پا لیا۔ اب یہ وینس شہر کے باشندے تھے۔ انہوں نے شام، مصر اور چین کے تاجروں سے کاروباری روابط بڑھائے۔ شروع شروع میں اہل وینس غلاموں اور صنوبری لکڑی کے عوض ان ممالک سے ریشمی کپڑا اور مصالحے خریدتے تھے۔ اس کے بعد وینس کے ان باشندوں نے فرنیچر سازی، شیشے کی صنعت، زرہ بکتر اور اونی کپڑے تیار کرنے کا کام شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ وینس شہر کے عیسائی پوپ اور اپنے دوسرے مرحوم راہبوں کے مزاروں پر حاضری دینے ہر سال ہجوم کی شکل میں آیا کرتے تھے۔ وینس والوں نے سینٹ مارک کے مقدس مزار کا میلہ شروع کر دیا۔ وینس کے تجارتی بحری بیڑے سارے یورپ کے سمندروں میں دیکھے جانے لگے۔ دشمنوں کے بعد اہل وینس کی تجارتی عظمت سے تمام سمندری تجارتی راستوں پر اجارہ داری قائم ہو گئی۔ وینس کے سوداگروں نے یورپ کے تقریباً ہر شہر میں اپنی تجارتی منڈیاں قائم کر لیں۔ اسی طرح وینس تاریخ کے صفحات پر ایک خوش حال ترقی یافتہ اور حسین ترین شہر بن کر نمودار ہوا۔ مشہور سیاح مارکو پولو بھی اسی شہر کا رہنے والا تھا جس نے وینس کے اس زمانے کے ملک چین سے تجارتی روابط قائم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ چنانچہ آج وینس کو بجا طور پر اٹلی کا عروس البلاد کہا جاتا ہے۔ مجھے وینس کی پراسرار رنگینیاں جن میں نہریں بہتی ہیں دور لاہور سے کھینچ کر یہاں لے آئی تھیں۔

ہماری گاڑی اب وینس شہر کی جگمگ کرتی سڑکوں پر آ گئی تھی۔ اس وقت رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ مگر شہر کی سڑکوں پر اسی طرح رونق تھی جیسے ابھی شام ہی ہوئی ہو۔ میں وینس کی روشنیاں اور رونق دیکھ کر واقعی ایک بار تو دنگ رہ گیا۔ حالانکہ اس سے پہلے میں مشرق بعید اور یورپ کے کئی ایک ممالک کی سیاحت کر چکا تھا۔ باروں، ریستورانوں اور کلبوں میں زبردست چہل پہل تھی۔ اونچی اونچی عمارتوں پر رنگ برنگی نیون سائن کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

سعد نے ایک اطالوی ریستوران کی پارکنگ میں گاڑی پارک کر دی اور انجن بند کر کے مجھ سے کہنے لگا۔

”یہاں کچھ تھوڑا بہت کھاتے پیتے ہیں اور باتیں بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ یہاں میں تم سے جدا ہو جاؤں گا۔ مجھے صبح ہونے تک واپس سینی ٹوریم بھی پہنچنا ہے۔“

ریستوران میں بڑی رونق تھی۔ کافی، کوکو اور سگار وغیرہ کی خوشبوئیں اڑ رہی تھیں۔ ہم ایک زرد رنگ کی گول میز کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سعد نے برگر اور کافی کا آرڈر دیا اور مجھ سے باتیں کرنے لگا۔

”یہاں تم ابھی حیران ہو یہ تو تمام سیاح جو پہلی بار وینس آتے ہیں ابھی ہی ہوتے ہیں مگر تمہارے ساتھ ایک خطرناک واقعہ ہو گزرا ہے

کہ جس کی وجہ سے تمہیں اس شہر میں کچھ زیادہ محتاط ہو کر رہنا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "وہ تو ٹھیک ہے مگر میں اپنا حلیہ تو نہیں بدل سکتا۔"

سعد بولا۔ "تم چھوٹی چھوٹی مونچھیں رکھ سکتے ہو۔ تمہارے بال چھوٹے ہیں ان کو بڑھا کر لمبا کر لو۔ میں صرف احتیاط کے طور پر کہہ رہا ہوں ویسے تمہیں اتنے بڑے شہر میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے سگریٹ سلگایا اور سعد سے پوچھا۔

"کیا یہاں کوئی وائی ایم سی اے ہے۔ میرا خیال ہے میں وہاں کوئی کمرہ لینے کی کوشش کروں گا۔ ان جگہوں پر کمرے سستے مل جاتے ہیں۔"

ٹھکانہ مل گیا

سعد کافی پی رہا تھا۔ وہ کچھ سوچنے لگا۔ پھر پیالی میز کی شفاف سطح پر رکھتے ہوئے بولا۔

"تمہارا وینس میں کب تک ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟"

میں نے کہا۔

"میں تو اٹلی آیا ہی وینس شہر کو دیکھنے کے لیے ہوں۔۔۔۔۔۔ ظاہر ہے اسی شہر کے لیے اتنی مصیبت اٹھائی ہے تو اب ایک ہفتہ تو ضرور ٹھہروں گا۔"

سعد نے ایش ٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے ویٹرس کو اشارہ کیا۔ ویٹرس بڑی خوش جمال اطالوی حسینہ تھی جو ریستوران کی نیم عریاں وردی میں تھی اور اس کے چہرے پر قیامت خیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ وہ قریب آ کر ہماری میز پر جھک گئی۔ اس نے اطالوی میں پوچھا کہ میں کیا خدمت کر سکتی ہوں۔ میں نے اس پر بھی اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالنی چاہی کیونکہ میں پردیس میں عشق و عاشقی سے توبہ کر چکا تھا مگر میری گنہگار نگاہ اس کے ہونٹوں سے پھسل کر اس کی گردن پر آ کر رک گئی۔

سعد نے ویٹرس سے مزید کافی لانے کو کہا۔ اطالوی حسینہ جاتے ہوئے میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میں نے جلدی سے نگاہیں دوسری طرف کر لیں۔ سعد کہنے لگا۔

"یہاں وینس میں الجزائر کی ایک تبلیغی جماعت کام کرتی ہے۔ سان مارکو کے علاقے میں ان کا ہیڈ آفس ہے۔ اس جماعت کے ایک رکن سے میری اچھی خاصی واقفیت ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہارے لیے وہاں ٹھہرنے کا انتظام کرا سکتا ہوں۔"

مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"ضرور کرا دو۔ وہ جتنا کرایہ کہیں گے میں ادا کر دوں گا۔"

سعد نے کہا۔

"وہ تم سے کرایہ شاید نہیں لیں گے اگر لیا بھی تو واجبی سا ہو گا۔ مگر تمہیں وہاں ہوٹل ایسی سہولیات میسر نہیں ہوں گی۔"

میں نے کہا۔ "مجھے اس کی پروا نہیں سعد بھائی! مجھے تو صرف فرش پر تھوڑی سی جگہ رات بسر کرنے کے لیے چاہیے۔ دن کے وقت تو میں شہر کی سیاحت میں مصروف رہوں گا۔"

"تو پھر آؤ میرے ساتھ۔"

سعد نے ویٹرس کو بلا کر بل ادا کیا اور مجھے گاڑی میں ساتھ لے کر وینس کے علاقے سان مراکو کی طرف چل پڑا۔ سان مراکو کا علاقہ وینس کے ڈاؤن ٹاؤن میں واقع ہے۔ یہاں چھوٹی بڑی بے شمار دکانوں پر دنیا بھر کی چیزیں اور قدیم نوادرات کی نقلیں فروخت ہوتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی سڑکیں گلیوں کی طرف نکل جاتی ہیں اور گلیاں ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی گزرتی ہیں۔ اس علاقے میں قدیم رومن عہد کی سنگ مرمر کے ستونوں والی بڑی بڑی عمارتیں بھی ہیں اور گیلریوں والے مکان بھی ہیں جن میں رنگ برنگ پھولوں والے گملے رکھے ہوتے ہیں۔ یہ علاقہ اطالوی نوادرات کی خرید و فروخت کا مرکز ہے۔ آدھی رات گئے بھی وہاں بڑی رونق تھی۔ بڑی دکانیں بند ہو چکی تھیں مگر چھوٹی چھوٹی دکانیں، ریستوران، بار، کیفے اور شراب خانے کھلے تھے۔ گاڑی ہم نے ایک جگہ پیچھے کھڑی کر دی تھی۔ ہم ایک شراب خانے کے قریب سے گزرے تو اندر سے بلند قہقہوں اور اطالوی گانے کی تیز آوازیں آئیں۔

سعد مجھے ایک نیم تاریک گلی میں سے گزار کر گلی کے آخر میں ایک پرانی حویلی کے دروازے پر لے آیا۔ صدر محرابی دروازے کے اوپر عربی رسم الخط میں تبلیغی جماعت کا نام لکھا تھا۔ یہ الجزائر کے مسلمانوں کی تبلیغی جماعت تھی جو وینس میں اسلام کی تبلیغ کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔ چونکہ رات زیادہ گزر چکی تھی اس لیے حویلی کا دروازہ بند تھا۔ لگتا تھا کہ سعد پہلے بھی وہاں کئی بار آ چکا تھا۔ اس نے دیوار میں لگا ایک بٹن دبایا۔ بٹن کے ساتھ چھوٹا سا سپیکر لگا ہوا تھا، ساتھ ہی مائیکروفون بھی تھا۔ سپیکر میں سے کسی نے عربی میں کچھ کہا۔

"سعد نے عربی زبان میں ہی کچھ جواب دیا۔ پھر اپنا نام بتایا۔ دوسری طرف سے کسی نے کوئی لفظ کہا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ سعد نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

"میرا دوست یہیں رات کو سوتا ہے۔ میں نے اس کو بلانے کے لیے کہا ہے۔"

تھوڑی دیر میں مین دروازے کا چھوٹا دروازہ جو بیچ بنا ہوا تھا، کھل گیا اور ایک خوش شکل ادھیڑ عمر کا آدمی نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر سفید اور سیاہ بالوں والی چھوٹی سی ڈاڑھی تھی۔ اس نے سعد کی طرف بازو پھیلا دیے۔ دونوں بغل گیر ہو گئے۔ سعد نے اس سے میر

تعارف کرایا۔

اس الجزائری کا نام قدومی تھا۔ وہ ہمیں اندر لے گیا۔ اندر ایک چھوٹا سا دفتر تھا۔ سعد نے عربی میں ساری بات سے بیان کر دی۔ قدومی نے میری طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اور اس کی مسکراہٹ بڑی دلکش تھی۔ وہ انگریزی میں بولا۔

"میرے مسلم بھائی تم جب تک چاہو ہمارے ہاں ٹھہر سکتے ہو۔ ہال کمرے میں تمہیں ایک بستر مل جائے گا۔ ہم پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔ تم پاکستانی ہو۔ الحمدللہ مسلمان ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم دونوں اسلامی بھائی ہیں۔"

سعد کو جانے کی جلدی تھی۔ وہ مجھے قدومی کے حوالے کر کے مجھ سے بغل گیر ہو کر اور عربوں کے خاص انداز میں میرے دونوں رخساروں کے ساتھ اپنے رخسار ملا کر واپس چلا گیا۔

میں نے قدومی سے تکلفاً پوچھا کہ مجھے کتنے پیسے کرایہ ادا کرنا ہو گا۔ قدومی نے میرے کندھے پر دوستی سے ہاتھ مار کر کہا۔

"تم ہمارے پاکستانی مسلمان بھائی ہو۔ تم سے کچھ نہیں لیں گے۔ تمہاری میزبانی ہمارا فرض ہے۔"

قدومی مجھے ایک چھوٹے سے ہال نما کمرے میں لے گیا جہاں فرش پر پہلے ہی سے دس پندرہ آدمی بستر بچھائے سو رہے تھے۔ چھت کے ساتھ مدھم سا بلب روشن تھا۔ قدومی نے میری طرف جھک کر شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں یہ جگہ پسند نہیں آئی۔ تم بھی نوجوان ہو۔ میرے ساتھ آؤ میں تمہیں دوسری جگہ دکھاتا ہوں وہ تمہیں ضرور پسند آئے گی۔"

ہال کمرے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو کتابوں کی الماریوں سے تقریباً لبریز تھا۔ ایک جانب اونچی کھڑکی تھی۔ کھڑکی کے ساتھ ہی ہسپتال کے سٹریچر ٹائپ کی ایک کیمپ کارٹ بچھی ہوئی تھی۔ قدومی نے کیمپ کارٹ کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"آج سے یہ کیمپ کارٹ تمہاری ہے۔ میں تمہیں بستر بھجوا دیتا ہوں۔ غسل خانہ کمرے کے باہر کاریڈور کے کونے میں ہے۔ اگر تم پسند کرو تو یہاں صبح شام کھانا بھی کھا سکتے ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ کچھ مزید کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم کھانے کا کچھ نہیں لیتے۔ یہاں تو لنگر کا کھانا ہوتا ہے۔ اب تم آرام کرو۔ میرا نوکر بستر لے کر ابھی آ جائے گا۔"

قدومی سلام علیک کر کے چلا گیا۔ میں کیمپ کارٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر اٹھ کر کھڑکی کھولی۔ دوسری طرف گردن آگے کر کے دیکھا۔ ادھر ایک تنگ و تاریک گلی تھی۔ گلی میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کچھ فاصلے پر کسی مکان کے باہر روشنی ہو رہی تھی۔ گلی میں اونچے اونچے اطالوی طرز کے چھجوں والے مکان تھے۔ کھڑکی میں سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ میں سگریٹ سلگا کر گلی میں دیکھنے لگا۔

اتنے میں قدومی کا الجزائری ملازم لڑکا بستر لے کر آ گیا۔ اس نے کیمپ کارٹ پر بستر بچھا دیا۔ میں نے سگریٹ گلی میں پھینکا جوتے

اور جیکٹ اتار کر سرہانے رکھ دی۔ جیکٹ کی جیب میں سے پاسپورٹ والا بٹوہ اور نقدی کا لفافہ نکال کر سرہانے کے نیچے رکھ دیا اور بتی بجھا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میری بند آنکھوں کے سامنے گزرے ہوئے سارے واقعات فلم کی طرح چلنے لگے۔ کتنی بڑی مصیبت تھی جس میں سے خدا نے مجھے صحیح سلامت نکال دیا تھا۔ اگر فاطمہ اور اس کا بھائی سعد میری مدد نہ کرتے تو اس وقت میری لاش کا بھی کسی کو علم نہ ہوتا۔ اس قسم کی باتیں سوچتے اور گزرے ہوئے مناظر کی فلم دیکھتے ہوئے مجھے نیند آ گئی اور میں سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو ساتھ والی گلی میں ایک کتا زور زور سے بھونک رہا تھا اور کوئی عورت بڑی تیز اور کرخت آواز میں اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ عورت کے لہجے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ کتے کو گالیاں دے رہی ہے۔ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ کھڑکی میں سے دن کی روشنی اندر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ٹوتھ برش اور شیونگ کا سامان لے کر کمرے سے نکل کر کاریڈور میں سے ہوتا ہوا غسل خانے میں بلکہ غسل خانوں میں پہنچ گیا۔ یہ بڑے صاف ستھرے یورپی سٹائل کے غسل خانے تھے۔ میں نے ایک آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر شیو بنائی۔ مونچھوں پر ریزر چلانے لگا تو سعد کی بات یاد آ گئی۔ اس نے کہا تھا کہ تم مونچھیں بڑھا لو اس طرح تمہارا تھوڑا سا حلیہ بدل جائے گا۔ میرا ہاتھ رکا ہوا تھا مگر پولیس کی پہنچ سے دور اپنے الجزائری مسلمان بھائیوں کے درمیان آ جانے سے میرے سارے خوف دور ہو گئے تھے۔ میں نے مونچھوں پر بھی ریزر چلا دیا۔

ایک الجزائری نوجوان میرے قریب سے گزرتے ہوئے رک گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے عربی میں میرے وطن کے بارے میں پوچھا۔ میں نے انگریزی میں کہا۔ "میں سمجھ نہیں سکا۔"

وہ ہنس پڑا۔ پھر انگریزی میں اپنا سوال دہرایا۔ میں نے کہا۔

"میں پاکستان سے آیا ہوں اور مسلمان ہوں۔"

اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر زور زور سے ہلاتے ہوئے انگریزی میں کہنے لگا۔

"تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ پاکستان ہمارا بھی وطن ہے۔ تم مسلمانوں نے کافر ہندوؤں سے جنگ کر کے ایک اسلامی ملک بنایا ہے۔ تم بہادر مسلمان ہو۔"

وہ اصرار کرنے لگا کہ ناشتہ میرے ساتھ کرنا۔ معلوم ہوا کہ ہال میں ناشتے کا کوئی خاص انتظام نہیں ہے اور ناشتہ جماعت کے اراکین باہر ایک ہسپانوی مسلمان کے ریستوران میں کرتے ہیں۔ میں نے وعدہ کر لیا کہ میں ناشتہ اسی کے ساتھ کروں گا۔ غسل خانے سے نہا دھو کر میں نے اپنے ڈارمیٹری والے کمرے میں آ کر بال اچھی طرح سے بنائے۔ میں نے چھوٹا سا آئینہ کھڑکی میں رکھ لیا تھا۔ جیکٹ پہن کر نقدی والا لفافہ اور پاسپورٹ والا بٹوہ جیبوں میں سنبھال کر رکھا اور تبلیغی مشن کی عمارت سے نکل کر گلی میں آ گیا۔ یہاں میرا الجزائری دوست

موجود تھا۔ ہم دونوں نے گلی کے باہر چھوٹی سڑک کے چوک میں ہسپانوی ریستوران میں جا کر ناشتہ کیا اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ وہ مجھ سے پاکستان کے بارے میں پوچھتا رہا۔ کہنے لگا۔

"مجھے پاکستان دیکھنے کا بڑا شوق ہے مگر تبلیغی کام میں اس قدر مصروف ہوں کہ وقت ہی نہیں مل رہا۔"

میرا ارادہ وہاں سے وینس کی نہروں والی گلیوں کی طرف نکل جانے کا تھا۔ میں نے اپنے الجزائری دوست سے ان گلیوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے ایک خاص نمبر کی ٹرام پکڑنے کے لیے کہا۔ "یہ ٹرام تمہیں جب ریلٹو تک لے جائے تو تم بھی اتر جانا۔ وہاں سے پندرہ نمبر کی بس تمہیں بس سٹاپ پر ہی ملے گی۔ یہ بس سیدھی وینس کے اس علاقے میں جاتی ہے جہاں گلیوں میں نہریں بہتی ہیں۔"

وہ مسکرا رہا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جانے لگا تو اس نے کہا۔

"وینس کے جزیروں میں سب سے بڑا جزیرہ ریالٹو ہے۔ نہریں اسی جزیرے کی گلیوں میں بہتی ہیں۔ مگر بہتر ہوتا کہ تم شام کے وقت وہاں جاتے۔ اس وقت بلڈنگوں کی روشنیوں کا عکس پانی میں بڑا خوبصورت منظر پیش کرتا ہے۔"

یہ بات میرے دل کو لگی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ دن کے وقت میں شہر کے دوسرے علاقوں کی سیاحت کروں گا، جب شام ہو جائے گی تب گلیوں میں بہتی نہریں دیکھنے جاؤں گا۔ میں نے ٹرام پر بیٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور فٹ پاتھ پر پیدل ہی ایک طرف چل پڑا۔

وینس ایک تجارتی مرکز

میری کوئی خاص منزل تو تھی نہیں .... شہر کی آوارہ گردی کے لیے میں آیا تھا۔ اس شہر کی محبت مجھے اتنی دور یعنی لاہور سے کھینچ کر یہاں لے آئی تھی بلکہ اس شہر کے لیے تو میں نے جان کی بازی بھی لگا دی تھی بلکہ لگانی پڑ گئی تھی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ وینس شہر کی سڑکیں بڑی پررونق تھیں۔ یہ ایک تاریخی اور عالمی شہرت یافتہ شہر تھا۔ تاریخ کی بات ابھی تک سوائے تنگ و تاریک گلیوں کی پرانی رومن طرز کی حویلیوں کے مجھے اس شہر میں اور کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ میں جس زمین پر چل رہا ہوں اسی زمین پر کبھی مارکو پولو کا سیاح باپ، اس کا سیاح چچا اور خود مارکو پولو چلا پھرا کرتا تھا۔ مجھے سینکڑوں برس پہلے کے وہ آباد کار یاد آ گئے جو وحشی ہن قوم کے حملوں سے جانیں بچا کر دوسرے شہروں سے بھاگ کر یہاں آئے تھے اور پھر انہوں نے اپنی جفاکشی، شبانہ روز محنت اور دل سوزی سے اس شہر کو اس وقت کی دنیا کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بنا دیا۔ یہاں تک کہ وینس کے آئینے، فرنیچر اور زرگری اور تانبے پر نقش کاری کا آج بھی دنیا بھی دنیا میں کہیں جواب نہیں ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جو قومیں مصائب کی چکی میں پستی ہیں وہی زمانے میں سرخرو ہوتی ہیں۔ مگر اس کے لیے شرط صرف یہ ہے کہ وہ قوم غلام نہ ہو آزاد ہو۔ وہ زندہ قوم ہو ذہنی جسمانی ہر لحاظ سے آزاد۔

فلاوری نوز والی لڑکی

میں ایک بہت بڑی فرنیچر کی دکان کے قریب سے گزرتے ہوئے رک گیا۔ قدِ آدم شیشے کے پیچھے نہایت اعلیٰ قسم کا فرنیچر نمائش کے لیے رکھا ہوا تھا۔ میں دکان میں داخل ہو گیا۔ ایک سنہری بالوں والی لڑکی نے آگے بڑھ کر میرا خیر مقدم کیا۔ اس وقت میرے کاندھوں پر سیاحوں والا تھیلا نہیں تھا۔ اگر تھیلا ہوتا تو شاید وہ لڑکی میری طرف رجوع نہ کرتی۔ میں جیکٹ اور پتلون میں تھا۔ اس نے اطالوی میں مجھ سے کہا کہ میرے دیکھنے کے لیے دکان میں بہترین چیزیں موجود ہیں۔ اس نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ کیا چاہیے۔ جیسا کہ ہمارے ملک میں لوگ پوچھتے ہیں۔ لڑکی کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے بالوں کا رنگ سونے کے رنگ کی طرح ہلکا زرد تھا۔ بال بالکل سیدھے آبشار کی طرح اس کے شانوں پر گرتے تھے۔ شکل سے بہت شوخ لگتی تھی۔ آنکھوں میں ہلکی سی نیلاہٹ کی جھلک تھی مگر اس کی ناک رومن ناک یعنی ستواں نہیں تھی بلکہ نتھنے ذرا سے فراخ تھے۔ ایسی ناک کو انگریزی میں فلاوری نوز یعنی ’پھول سی ناک‘ کہتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ اس قسم کی ناک میری بڑی کمزوری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ میں نے بچپن میں جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کی بہت سیر و سیاحت کی ہے اور وہاں عورتوں کی ناک فلاوری ہی ہوتی ہے۔ لڑکی مسکرا رہی تھی۔ میں اب تھوڑی تھوڑی اطالوی بولنے بھی لگا تھا۔ میں نے اطالوی زبان میں کوشش کرتے ہوئے اس سے پوچھا کہ وہ کس ملک کی رہنے والی ہے۔ اس نے مسکراہٹ کی بجلیاں گراتے ہوئے کہا۔

”میں وینس کی رہنے والی ہوں۔ یہیں پیدا ہوئی تھی۔“

میں نے کہا ”مگر تمہاری ناک اطالوی نہیں ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟“

وہ کچھ تعجب سے میری طرف دیکھنے لگی شاید اسے اس قسم کے جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ ہنس پڑی۔

”تمہارا قیاس بالکل درست ہے۔ میرے دادا فلپائن سے آ کر یہاں آباد ہو گئے تھے۔ شاید تمہیں میری ناک میں فلپینو کٹ دکھائی دے رہا ہے۔“

پھر اس نے فوراً موضوع بدلا اور دکان کے ایک حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اطالوی زبان میں تیز تیز بولنے لگی۔ میں نے اسے انگریزی میں کہا۔

”سینوریتا! اتنی زیادہ اطالوی زبان ابھی مجھے نہیں آتی۔“

وہ برابر مسکرا رہی تھی۔ اس کے دانت بڑے خوبصورت سفید موتیوں کی طرح تھے۔ میری تباہی کے سارے آثار موجود تھے۔ مگر میں نے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ یہاں کسی بھی لڑکی کے ساتھ بے تکلف نہیں ہوں گا خواہ وہ مونا لیزا ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے انگریزی میں کہا۔

اس سیکشن میں کیبنٹ، لکھنے کی میزیں، اور اسی قسم کا دوسرا فرنیچر بھی ہے جو تمہیں یقیناً پسند آئے گا۔ بس صرف ایک نظر اسے دیکھ لو۔"

میں اس لڑکی کے ساتھ لکڑی کے کام کی چھوٹی چیزوں والے سیکشن کی طرف بڑھا۔ میرا ارادہ کوئی چیز خریدنے کا نہیں تھا۔ میں تو محض وینس کے ہنرمندوں کے ہنر کی داد دینے اور خوبصورت نفیس اور اعلیٰ قسم کے فرنیچر کے دیدار کے لیے وہاں آ گیا تھا۔ اس لڑکی نے موسم بہار کا پھولدار فراک پہن رکھا تھا جو اس کے گھٹنوں تک آتا تھا۔ فراک کے اوپر کریم کلر کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی جس کے کناروں پر سبز رنگ کی مغزی لگی تھی۔ شاید یہ فرنیچر کے سٹور کے ملازموں کی وردی تھی۔ کیونکہ میں نے قد آدم شیشے کے پیچھے ایک دوسری سیلز گرل کو اسی لباس میں دیکھا جو کسی گاہک کو صوفہ سیٹ دکھا رہی تھی۔

میں وہاں لگا ہوا لکڑی کا منقش سامان دیکھنے لگا۔ وہ لڑکی میرے قریب ہی کھڑی تھی اور جس چیز کو میں دیکھتا وہ اس کے بارے میں مجھے بتاتی جاتی کہ یہ ڈیزائن انہوں نے کس رومن بادشاہ یا کس رومن فلسفی کے قلمدان کو دیکھ کر نقل کیا ہے۔ اس سیلز گرل کے کپڑوں سے بہار کے پھولوں کی ہلکی ہلکی مہک آ رہی تھی جو میری توجہ کو توڑ ڈالنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی۔ میں بھی اپنی جگہ چٹان کی طرح قائم تھا اور لڑکی کی طرف زیادہ نہیں دیکھتا تھا۔ جب لڑکی نے محسوس کیا کہ دکان کی چیزوں میں میری دلچسپی صرف چیزوں کے دیکھنے کی حد تک ہی ہے تو اس کا ذوق و شوق ماند پڑ گیا۔ ایک بار جو میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہی سیلز گرل ایک دوسرے گاہک کو لے کر دوسرے سیکشن میں داخل ہو رہی تھی۔

مجھے ہنسی آ گئی۔

میں دکان سے باہر نکلا اور آگے روانہ ہو گیا۔

وینس کی عورتیں

سڑک کے درمیان میں سائپرس کے درخت سرو کے درختوں کی طرح سر اوپر کو اٹھائے کھڑے تھے۔ یہ درخت بحیرہ روم کے بازنطینی علاقے کی خاص علامت سمجھے جاتے ہیں۔ یہیں سے یہ درخت اونٹوں کے ساتھ جنوبی فرانس میں گئے جنہیں تیسویں صدی میں ہالینڈ کے ماسٹر پینٹر وان گوگ نے پینٹ کر کے کینوس پر لازوال بنا دیا۔

چلتے چلتے ایک چوراہا آ گیا۔ یہاں ایک اطالوی ریستوران میں سے مصالحے دار کھانوں کی تیز خوشبو آ رہی تھی۔ میں ریستوران میں داخل ہو کر ایک میز کے سامنے بیٹھ گیا اور کافی کا آرڈر دے دیا۔ بھوک ابھی مجھے نہیں لگی تھی۔ میں سگریٹ سلگا کر ریستوران کا جائزہ لینے لگا۔ اطالوی ملازم تیز آوازوں سے بول رہے تھے۔ اطالوی لوگ خاص طور پر یہاں کی عورتیں بڑا شور مچاتی ہیں۔ بڑی تیز تیز باتیں کرتی ہیں اور ساتھ ساتھ کندھے اور ہاتھ بھی ہلاتی جاتی ہیں۔ اونچے طبقے کی جو عورتیں بڑی باوقار اور سنجیدہ بننے کی کوشش کرتی ہیں مگر جونہی انہیں موقع

ملتا ہے وہ بھی ایسی ہی حرکتیں کرنے لگتی ہیں۔ نچلے طبقے کے گھروں میں اطالوی عورتوں نے چیزیں ادھر ادھر بکھیری ہوتی ہیں۔ کچن تو خاص طور پر بڑے گندے رکھتی ہیں۔ کوئی کوئی نچلے طبقے کی اطالوی عورت گھر کا کچن صاف رکھتی ہے۔ پیاز لہسن کا ان عورتوں کو بڑا شوق ہے۔ یہ شوق انہیں رومن ایمپائر کے زمانے کی خوشحال عورتوں سے وراثت میں ملا ہے۔ اطالین کھانے جیسا کہ سب جانتے ہیں بڑے مزیدار اور مصالحے دار ہوتے ہیں یہ کھانے ہمارے مزاج کے لیے بڑے موزوں ہیں۔

میں کچھ دیر ریسٹورنٹ میں بیٹھا شیشوں میں سے باہر سڑک پر آتے جاتے لوگوں اور چمکتی کاروں اور بسوں کو گزرتے دیکھتا رہا۔ واشنگٹن میں سڑکوں پر دن کے وقت بھی بڑی خاموشی ہوتی ہے مگر اطالوی شہروں کی سڑکوں پر سوائے دور افتادہ سڑکوں اور ہائی وے کے ٹریفک کا بڑا شور ہوتا ہے۔ چھوٹے ریسٹورانوں میں بھی یہ لوگ بڑا شور مچاتے ہیں۔ جب ریسٹورنٹ کا بیرا بار بار میری طرف دیکھنے لگا تو میں نے کافی کا بل ادا کیا اور ریسٹورنٹ سے نکل آیا۔ یہاں ریسٹورانوں میں خواہ وہ کتنے ہی چھوٹے کیوں نہ ہوں گاہک ہمارے ہوٹلوں کی طرح زیادہ دیر نہیں بیٹھتے۔ ایک تو ان لوگوں کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہوتا دوسرے ریسٹورنٹ کے مالک بھی زیادہ دیر نہیں بیٹھنے دیتے۔ میں نے کسی طرح دن گزارنا تھا کیا کرتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیونکہ میں وینس کی نہروں والی گلیوں کو رات کی روشنی میں دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ سوائے سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کے مجھے اور کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے اپنے آپ کو وینس شہر کی بارونق زندگی اور سنہری دھوپ میں چمکتی سڑکوں کے حوالے کر دیا تھا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ میں جس سڑک پر چلا جا رہا ہوں وہ کہاں جاتی ہے۔ ایک سڑک ختم ہوتی تو میں چوک کراس کر کے دوسری سڑک پر آ جاتا۔ درمیان میں کوئی چھوٹی سڑک کسی گلی کی طرف جاتی نظر آتی تو اس گلی میں نکل جاتا۔ اسی طرح کچھوے کی چال چلتے چلتے اور شہر کی سیر کرتے کرتے دوپہر ہو گئی۔ میں نے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد پھر آوارہ گردی کرنے نکل کھڑا ہوا۔

اطالوی فلمیں

اب میں جس علاقے سے گزر رہا تھا وہاں مجھے کچھ سائن بورڈ لگے ہوئے نظر آئے جن پر فلم ایکٹرسوں اور فلموں کے مناظر کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں تین سینما گھر ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ کسی سینما ہاؤس میں بیٹھ کر اطالوی فلم دیکھی جائے۔ میں نے سائن بورڈ کو غور سے دیکھا۔ یہاں امریکی اور برطانوی فلمیں دکھائی جا رہی تھیں۔ اطالوی فلم کا بورڈ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ جس سڑک پر میں چل رہا تھا وہ تھوڑی سی ڈھلان اتر کر ایک چھوٹی سڑک کے ساتھ جا ملتی تھی۔ یہاں میں ایک بلڈنگ کے قریب سے گزر رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ بلڈنگ کی ڈیوڑھی کے اندر لگے ایک بورڈ پر پڑی جس پر اطالوی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اوپر کسی عورت کی نیم عریاں تصویر بنی ہوئی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ ضرور یہاں اطالوی فلمیں دکھائی جاتی ہوں گی۔ اطالوی فلموں میں حقیقت نگاری کو زیادہ

اہمیت دی جاتی ہے اور ایک زمانے میں لاہور میں بھی ایک فلم "سائیکل تھیف" (یعنی سائیکل چور) بڑی چلی تھی۔ میں لابی میں آ گیا اور بورڈ کے اطالوی سائن کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اتنے میں ایک نوجوان میرے پاس آیا اور انگریزی میں مجھ سے کہنے لگا۔

"سینور! ٹکٹ اس طرف ملتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ اوپر جاتی سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ چلو اطالوی فلم ہی دیکھتے ہیں، جب تک شام ہو جائے گی۔ میں اس طرف گیا جس طرف نوجوان نے اشارہ کیا تھا۔ ٹکٹ ونڈو کے اندر شیشے کے پیچھے ایک موٹی عورت بیٹھی تھی۔ میں نے ٹکٹ خریدا جو پانچ لیرے کا تھا۔ عورت نے اوپر جاتی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وہاں ایک دروازے پر سرخ مخمل کا بھاری پردہ گرا ہوا تھا اور ایک باوردی آدمی کھڑا تھا۔ میں نے اسے ٹکٹ دیا۔ اس نے ٹکٹ کو چیک کیا اور ذرا سا پردہ اٹھا دیا۔ میں سینما ہال میں داخل ہو گیا۔ ہال میں کوئی فلم پہلے ہی سے چل رہی تھی۔ میں نے فلم کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور سکرین پر جو روشنی تھی اس کی دھیمی چمک میں سیٹوں پر نگاہ ڈالی۔ کئی سیٹیں خالی پڑی تھیں۔ یہ گیلری تھی۔ اگلی سیٹوں پر ادھر ادھر لوگ بیٹھے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ میں ایک خالی قطار کی پچھلی آرام دہ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اب میں نے اطمینان سے سکرین کی طرف دیکھا تو حیران رہ گیا۔ سکرین پر بالکل عریاں اور انتہائی فحش فلم چل رہی تھی۔ مجھے بڑی شرم محسوس ہوئی۔ میں نے جلدی سے آنکھیں دوسری طرف کر لیں۔ جی میں آیا کہ اٹھ کر چلا جاؤں مگر میں خواہش اور کوشش کے باوجود ایسا نہ کر سکا۔ میں نے شروع میں ہی آپ کو کہہ دیا تھا کہ میں یہ سفرنامہ لکھتے وقت جھوٹ بالکل نہیں بولوں گا اور ہر بات سچ سچ بیان کر دوں گا تو سچی بات یہ ہے کہ میرے اندر جو ایک واہیات آدمی چھپا ہوا ہے اس نے مجھے سینما ہال سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ شروع شروع میں میرے اندر کے شریف آدمی اور واہیات آدمی کی آپس میں تھوڑی دیر کے لیے تو تو میں میں ہوئی پھر شریف آدمی ایک طرف منہ چھپا کر بیٹھ گیا اور واہیات آدمی میرے ساتھ فلم دیکھنے لگا۔ فلم واقعی بے حد واہیات تھی یعنی میرے اندر کے واہیات آدمی سے بھی زیادہ واہیات تھی۔

سینما ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ اب مجھے نظر آنے لگے تھے۔ وہاں عورتیں بھی مردوں کے ساتھ لگ کر بیٹھی تھیں۔ میں نے ایک طرف جا کر گیلری سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ آدھا ہال بھرا ہوا تھا۔ ہال میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں واپس اپنی سیٹ کی طرف آیا تو اگلی قطار میں مجھے ایک جوڑا ایک دوسرے کے بالکل ساتھ لگا ہوا دکھائی دیا۔ وہ بڑی واہیات حرکتیں کر رہے تھے۔ میں نے دل میں کہا۔

"جو کچھ سکرین پر ہو رہا ہے اس کی گرد کو بھی تم لوگ نہیں پہنچ سکتے۔"

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس قسم کے سینما ہال جہاں فحش فلمیں دکھائی جاتی ہیں سارا دن ساری رات چلتے رہتے ہیں۔ ہفتے میں ایک

دن صرف ہال کی مشین کی صفائی کے لیے سینما بند ہوتا ہے۔ لوگ جب اور جس وقت چاہیں ٹکٹ لے کر آتے ہیں، وہ ہال میں بیٹھ جاتے ہیں۔ جتنا دل چاہتا ہے فلم دیکھتے ہیں اور جب دل چاہتا ہے اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں عورتوں کو ٹکٹ میں خاص رعایت دی جاتی تھی۔ میں نے واشنگٹن میں بھی اس قسم کے ایک سینما ہال میں، ایک واہیات فلم دیکھی تھی۔ وہاں ٹکٹ پانچ ڈالر تھا لیکن ایک خاص رعایت یہ تھی کہ اگر آپ کسی عورت کو ساتھ لاتے ہیں تو عورت بغیر ٹکٹ کے آپ کے ساتھ بیٹھ سکتی تھی۔ اس کی مجھے آج تک وجہ سمجھ نہیں آسکی۔

بہر حال میں گیلری میں بیٹھا بڑی توجہ اور مزے سے واہیات فلم دیکھتا رہا۔ وہاں بیٹھنے کی بھی کوئی قید نہیں تھی۔ جتنی دیر چاہے آپ بیٹھے رہیں۔ لیکن وہ لوگ اس معاملے میں بھی وقت کے بڑے پابند تھے۔ جتنا جس کسی نے بیٹھنا ہوتا وہ اتنی دیر ہی بیٹھتا اس کے بعد اٹھ کر باہر نکل جاتا۔ یوں اس قسم کے سینما گھروں میں عورتوں اور مردوں کی آمد و رفت لگی رہتی تھی۔ میں کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ جب فلم دیکھتے دیکھتے میرے اندر کا واہیات آدمی بھی بیزار ہو گیا تو میں اٹھ کر چلا آیا۔ باہر آیا تو واقعی شام ہو چکی تھی اور سڑکیں سٹریٹ لیمپوں اور نیون سائنز کی روشنیوں میں جگمگانے لگی تھیں۔

نہروں والی گلیاں

اب وینس کی نہروں والی گلیوں کی سیر کا وقت ہو گیا تھا۔ بڑی سڑک پر آ کر میں نے ٹریفک کے ایک سپاہی سے ان گلیوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے سارا راستہ ذہن نشین کرا دیا۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق پہلے ایک بس میں سوار ہوا۔ اس کے بعد ایک خاص مقام پر پہنچ کر دوسری بس پکڑی اور اس بس نے مجھے شہر کے سب سے بڑے جزیرے ریالٹو کے سٹاپ پر پہنچا دیا۔ یہیں مجھے اترنے کے لیے کہا گیا تھا۔ نیچے اترتے ہی مجھے ہوا میں سمندر کے پانی کی مرطوب بو محسوس ہوئی۔ میں بڑا خوش ہوا۔ پوچھتا پوچھتا آخر میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں مجھے اونچی اونچی روشن عمارتوں کے درمیان پانی جھلملاتا نظر آیا۔

ایک جگہ چھوٹا سا ڈاکیارڈ تھا۔ یہاں موٹر کی شکل کی کشتیاں جنہیں گنڈولا کہا جاتا تھا' پانی میں کھڑی اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ سیاح اور سیر و تفریح کے شوقین مرد اور عورتیں ٹکٹ لے کر ان کشتیوں میں سوار ہو رہے تھے۔ میں بھی ایک کشتی میں بیٹھ گیا۔ کشتی کا ملاح سانولے رنگ کا گھنگھریالے بالوں والا آدمی تھا۔ جب کشتی بھر گئی تو وہ چپو چلاتا کشتی کو ڈیک سے نکال کر وینس کی نہروں والی گلیوں کی طرف چل پڑا۔ میں زندگی میں پہلی بار ایسی گلیاں دیکھ رہا تھا جن میں نہریں بہہ رہی تھیں۔ پانی کا رنگ رات کے وقت سبزی مائل گہرا تھا۔ ان میں ارد گرد کی عمارتوں کی روشنیوں کا عکس بڑا دلفریب لگ رہا تھا۔ گنڈولا آبی گلیوں میں بڑی ہلکی رفتار کے ساتھ گزر رہا تھا۔ مجھے مکانوں کے اندر بیٹھے لوگ اور پہلی منزلوں کے دالان اور پرانی حویلیوں کی ڈیوڑھیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ایک عورت ڈیوڑھی میں سے باہر نکلی۔ اس کے ہاتھ

میں پانی کا تسلا تھا۔ اس نے سیڑھی کے پاس آ کر تسلے کا پانی گلی کی نہر میں انڈیلا اور ہماری طرف نگاہ ڈالے بغیر واپس چلی گئی۔

ہماری کشتی جس گلی میں سے گزرتی اس کے اوپر پل ضرور بنا ہوا ہوتا تھا۔ یہ پل پیدل چلنے والوں کے لیے تھا اور ایک گلی کو دوسری گلی بلکہ ایک علاقے کے مکانوں کو دوسرے علاقے کے مکانوں سے ملاتا تھا۔ سمندر کا پانی مکانوں کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آ جاتا تھا۔ اصل میں یہ مکان سمندر میں نہیں بنے تھے بلکہ سمندر کے نیچے سے جو پہاڑیاں اوپر ابھری ہوئی تھیں یہ عمارتیں ان پہاڑیوں پر بنائی گئی تھیں۔ چنانچہ گلیوں کا پانی انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاتا تھا۔ ایک گائیڈ بھی کشتی میں بیٹھا تھا جو کبھی فرانسیسی کبھی اطالوی اور کبھی شکستہ انگریزی میں ساتھ ساتھ کمنٹری کرتا جا رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وینس میں اس قسم کی ایک سو ستتر (۱۷۷) نہریں ہیں اور ان پر چار سو پچاس پل بنے ہوئے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ نہریں ایک دوسری کے ساتھ اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ اگر کوئی سیاح گائیڈ کی مدد کے بغیر کیلا نہروں کی سیر کو نکلے تو وہ راستہ بھول بھی سکتا ہے۔ آس پاس کے مکانوں میں سے عورتوں بچوں مردوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ کئی مکانوں میں سے تیز میوزک کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ دو ایک فرلانگ کے بعد نہر کے اوپر بنا ہوا رنگین پل آ جاتا تھا جس پر روشنی ہو رہی ہوتی تھی۔

میں نے لاہور میں پڑھ رکھا تھا کہ وینس کی ان آبی گلیوں میں ایک بہت بڑی قدیم حویلی ہے جس کے درمیان میں نہر بہتی ہے اور حویلی کے دونوں حصوں کو ایک پل کے ذریعے ملا دیا گیا ہے۔ یہ پل دونوں طرف سے اوپر سے ڈھکا ہوا ہے اور ایک روایت کے مطابق جب راتیں اندھیری ہوتی ہیں تو کسی ایک رات کو جب فضا میں گہرا سکوت طاری ہوتا ہے اس پل کی لکڑی کی جالیوں کے پیچھے کسی عورت کی آہیں بھرنے کی آواز آتی ہے۔ چنانچہ اس مناسبت سے اس پل کا نام ہی ”آہوں والا پل“ پڑ گیا ہے۔ جب میں نے گائیڈ سے اس بارے میں بات کی تو اس نے خالص کمرشل انداز میں کندھے جھٹکاتے ہوئے کہا۔

”نو سینور نو۔۔۔۔۔۔۔ ادھر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ کسی اندھیری رات کو میں اکیلا یہاں آؤں گا اور ”آہوں والا پل“ کی پراسرار آہوں کا راز معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔

میں چونکہ کشتی میں دوسرے مسافروں کے ساتھ بیٹھا تھا اس لیے گائیڈ کو یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مجھے کم از کم آہوں والا پل دکھا دے۔ کشتی میں بیٹھے ہوئے مسافروں اور سیاحوں نے بھی اس پراسرار پل کے متعلق کسی قسم کے اشتیاق کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کشتی بعض تنگ و تاریک گلیوں کی نہروں پر ہلکے ہلکے ہچکولے کھاتی چلتی رہی۔ یہ خالص کمرشل قسم کا سفر تھا۔ میری تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کسی جگہ رک کر کنارے کے فرش پر یا پتھر کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ارد گرد کے مکانوں اور ان کی روشنیوں کو دیکھوں۔ کچھ حویلیاں ایسی بھی گزریں کہ جن کے

وللاں ویران پڑے تھے۔ گائیڈ نے بتایا کہ یہ بے آباد حویلیاں ہیں۔ اور یہاں کسی زمانے میں روم کے سرداروں کی رہائش تھی۔ سرداروں سے مراد کاؤنٹ تھی۔ میں ان ویران بے آباد حویلیوں کو اندر سے دیکھنا چاہتا تھا۔

مگر کشتی کی بندھی رفتار سے آبی گلیوں میں بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ کسی گلی میں کسی بھی جگہ نہیں رکی تھی۔ ایک سائیڈ کیفے بھی آیا جہاں لوگ دالان میں کرسیاں ڈالے بیٹھے کافی اور مارٹینی وائن وغیرہ پی رہے تھے۔ کشتی وہاں بھی نہ رکی۔ اس طرح میں نے وینس کی آبی گلیوں کی ساری سیر کی اور کشتی کے دوسرے مسافروں کے ساتھ چھوٹی سی جیٹی یا گھاٹ پر آ کر اتر گیا۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ میں پتہ کرنا چاہتا تھا کہ آسمان پر کہیں چاند تو نہیں نکلا ہوا۔ چاند کیا مجھے تارے بھی نظر نہ آئے۔ وہاں اتنی روشنیاں ہو رہی تھیں کہ آسمان کسی مٹیالے گرد آلود صحرا کی طرح لگ رہا تھا۔ حالانکہ اٹلی میں یہ بہار کا موسم تھا اور اٹلی کے مضافات میں آسمان بڑا شفاف ہوتا ہے اور تارے بھی چمکتے نظر آ جاتے ہیں۔ لیکن شہر میں روشنیوں اور دھوئیں کی آلودگی کی وجہ سے رات کو آسمان پر کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ بہر حال چاند آسمان پر نہیں تھا۔ کیونکہ اگر چاند ہوتا تو وہ ضرور نظر آ جاتا۔ میں اصل میں اندھیری رات کا منتظر تھا تاکہ میں آہوں والے پل کا دیدار کر سکوں اور اگر وہاں واقعی آدھی رات کو کسی لڑکی کے آہیں بھرنے کی آواز آتی ہے تو معلوم کروں کہ یہ معمہ کیا ہے۔ لیکن اس رات میں اس مہم پر روانہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ مجھے صحیح طور پر علم نہیں تھا کہ یہ راتیں اماوس کی ہیں یا آدھی رات کے بعد چاند نظر آ جائے گا۔

میرا دل خوش بھی تھا کیونکہ بہر حال میں نے وینس کی آبی گلیوں کی کافی سیر کر لی تھی۔ وہاں بے شمار ہوٹل، کیفے اور ریستوران تھے۔ ایک کیفے میں میں نے کھانا کھایا۔ کافی پی اور واپس شہر کے اندرونی علاقے یعنی ڈاؤن ٹاؤن میں اپنے تبلیغی جماعت والے ٹھکانے پر آ گیا۔ مجھے قدوسی دروازے پر ہی مل گیا۔ وہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر رک گیا۔ انگریزی میں پوچھا۔

”برادر! لگتا ہے تم بڑی لمبی سیر کر کے آ رہے ہو، کیونکہ میں نے صبح سے تمہیں نہیں دیکھا۔“

میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں وہ گلیاں دیکھنے گیا ہوا تھا جہاں نہریں بہتی ہیں۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔

”بہت خوب ۔۔۔۔۔۔۔ وینس میں یہ بھی ایک عجوبہ چیز ہے۔ بڑی دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں۔“

وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھے میرے ساتھ ہی اس کمرے میں آ گیا۔

”تم نے کھانا کھا لیا ہے کہ نہیں؟“

میں نے کہا "میں نے کھانا کھا لیا ہے برادر"

وہ ناراض ہو گیا۔

"کھانے کو تو یہاں لنگر چلتا ہے تم نے پیسے کیوں خرچ کیے ۔۔۔۔۔۔۔ سیاح کو تو پیسے بچا بچا کر رکھنے چاہئیں۔"

میں مسکرانے لگا۔

"اچھا آؤ میرے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھو۔"

وہ مجھے ہال کے آفس میں لے گیا۔ یہاں ایک اور عالم دین بیٹھے تھے۔ قدوسی نے میرا ان سے تعارف کرایا اور کہا کہ یہ صاحب پاکستان سے آئے ہیں۔ اس عالم دین نے میرے ساتھ بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور پاکستان کے ساتھ اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کرنے لگا۔ وہ صاحب چلے گئے تو قدوسی مجھے عربی کتابوں کے کچھ تراجم دکھانے لگے۔ ان کتابوں کی چھپائی بہت اعلیٰ تھی۔ یہ انگریزی میں ترجمہ کی گئی تھیں۔ ان میں کچھ حدیث پاک کی کتابیں تھیں اور کچھ بنیادی دینی علوم کے بارے میں تھیں۔ وہ مجھ سے رہائش کے بارے میں پوچھنے لگا کہ لائبریری میں مجھے رات کو سونے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ میں نے کہا۔

"نہیں بلکہ میں تو بڑے مزے سے سوتا ہوں قدوسی برادر ۔۔۔۔۔۔ اور پھر میں تو حالت سفر میں ہوں۔ اتنے بڑے شہر میں اتنی اچھی اور پھر مفت جگہ مل گئی ہے میں آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔"

وہ بڑے اخلاق کے ساتھ کہنے لگا۔

"تم ہمارے پاکستانی مسلم بھائی ہو تمہاری میزبانی ہمارا فرض ہے۔"

اس کے بعد وہ کھانا کھانے ہال کمرے کے لنگر خانے کی طرف چل دیا اور میں اپنی لائبریری والی چھوٹی سی خواب گاہ میں آ گیا۔ اس وقت وینس میں رات کے دس بجے کا وقت تھا۔ لائبریری کی جو چھوٹی کھڑکی عقبی گلی کی طرف کھلتی تھی وہ بند تھی مگر بند کھڑکی میں سے بھی دوسری طرف کے مکانوں میں سے ٹیلی ویژن پر خبروں اور گانے وغیرہ کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے بتی بجھا دی اور کمبل اوپر لے کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ سارے دن کا تھکا ہوا تھا۔ مجھے فوراً نیند آ گئی۔

پراسرار لڑکی

معلوم نہیں رات کتنی گزر چکی تھی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے خواب کی طرح احساس ہو رہا تھا کہ عقبی گلی میں سے کوئی تیز تیز دوڑتا ہوا گزر گیا ہے۔ اس کے قدموں کی دھمک سے میری آنکھ کھل گئی۔ اب گلی میں سناٹا تھا۔ رات ضرور آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی کیونکہ گلی کے مکانوں میں سے کسی مکان میں سے بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے کوئی آدمی بھاگتا ہوا گزرا ہو۔ یہ کوئی عجیب بات

نہیں گی۔ میں نے پہلو بدلا اور آنکھیں بند کر کے دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔

ابھی میں نیند کی آغوش میں واپس جا ہی رہا تھا کہ گلی میں اچانک کسی عورت کی چیخ کی آواز بلند ہوئی۔ پھر ساتھ ہی دوڑتے کوئی انسان بھاگتا ہوا آیا اور زور زور سے گلی کے فرش پر پاؤں مارتا ہوا میری کھڑکی کے نیچے سے گزر گیا۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ مجھے تشویش ہوئی کہ دیکھنا چاہیے گلی میں کیا ہو رہا ہے۔ شاید کسی عورت پر کوئی تشدد کر رہا ہے۔ میں نے کھڑکی کی چٹخنی کھول کر گلی میں دیکھا۔ گلی میں اندھیرا تھا۔ پیچھے گلی کے موڑ پر سٹریٹ لیمپ کی دھیمی روشنی میں گلی خالی نظر آ رہی تھی۔ ابھی میں کچھ سمجھ نہیں پایا تھا کہ دوسری جانب سے اس عورت کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ اب مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے جوتے پہنے اور کھڑکی میں سے گلی میں اتر گیا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ اس طرف چلنے لگا جدھر سے عورت کی چیخ کی آواز سنائی دی تھی۔ گلی سنسان تھی۔ مکانوں کی روشنیاں بجھی بجھی ہوئی تھیں۔ گلی آگے جا کر ایک طرف مڑ گئی۔ چند قدم چلنے کے بعد سامنے ایک ویران جگہ آ گئی جہاں ستاروں کی دھیمی دھیمی روشنی میں اونچے اونچے درختوں کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔ میں نے آگے جانے کا خیال ترک کر دیا۔ کیونکہ وہاں جا کر گلی اور گلی کے پرانے طرز کے مکانوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا تھا۔ ابھی میں واپس مڑنے ہی والا تھا کہ وہی چیخ پھر سنائی دی۔ اس بار عورت نے اطالوی زبان میں مدد کے لیے بھی پکارا تھا۔

میں بے اختیار ہو کر درختوں کی طرف دوڑ پڑا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں جوانی کے جوش میں یہ کیا حماقت کر رہا ہوں۔ اس ملک میں تو ایسے جرائم ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کہیں مصیبت نہ پڑ جائے۔ مگر اس دوران میں دوڑتے ہوئے ویران جگہ پر درختوں کے قریب آ چکا تھا۔ میں وہیں رک گیا اور اندھیرے میں چاروں طرف دیکھنے لگا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور وہ عورت کہاں چلی گئی جس نے تیسری بار چیخ کر مدد کے لیے آواز دی تھی۔ بہت جلد مجھ پر یہ حقیقت کھل گئی کہ میں ایک ویران سے قبرستان میں آ گیا ہوں۔ میں نے یورپ اور امریکہ کے شہروں میں بڑے بڑے خوبصورت کرسچن قبرستان دیکھے ہیں جہاں بڑے سلیقے اور قرینے سے قبریں ساتھ ساتھ بنی ہوئی ہوتی ہیں اور وہاں رات کو خوب روشنی بھی ہوا کرتی ہے مگر یہاں بالکل اندھیرا تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں قبروں کے ٹیڑھے میڑھے کتبے نظر آ رہے تھے۔ صلیب کے نشان بھی ایک طرف جھک گئے تھے۔ کئی قبروں کے اردگرد گھاس اگی ہوئی تھی۔ ایک بات میرے اندر شروع ہی سے ہے کہ قبرستان سے مجھے کبھی ڈر نہیں لگا۔ قبرستان مجھے بڑی رومانٹک جگہ لگتی ہے۔ مجھے قبرستان میں آ کر ہمیشہ یہی احساس ہوا ہے کہ یہاں روحیں زندگی کے جھمیلوں اور پریشانیوں سے آزاد ہونے کے بعد آرام کر رہی ہیں۔ اور عیسائیوں کے قبرستان تو مجھے اپنے سنگ مرمر کے چھوٹے چھوٹے گلدانوں، فرشتوں کے مجسموں اور بچوں کی قبروں پر بنے ہوئے معصوم پریوں کے مجسموں کی وجہ سے ہمیشہ بڑے پیارے لگتے ہیں۔ ان قبرستانوں سے گزرتے ہوئے مجھے ایک عجیب قسم کی بے ضرر اور پاکیزہ افسردگی کا احساس ہوتا ہے۔

چنانچہ جب مجھے معلوم ہوا کہ میں مسیحیوں کے قبرستان میں کھڑا ہوں تو مجھے ذرا بھی ڈر نہ لگا۔ بلکہ میں نے دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا

آلودہ روحوں کی مغفرت کے لیے دعا بھی کی۔ مگر میں اس بات پر ضرور حیران تھا کہ وہ عورت مجھے کہیں نظر نہیں آ رہی تھی جس کے چیخنے کی آواز میں نے تین دفعہ سنی تھی اور تیسری بات تو اس نے کسی کو مدد کے لیے بھی پکارا تھا۔ میں نے اس عورت کے خیال کو دل سے نکال دیا اور واپس جانے کے ارادے سے مڑنے لگا تو اچانک مجھے کسی کے تیز دوڑنے کی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ قبرستان کے دھندلے اندھیرے میں ایک عورت میری طرف دوڑتی ہوئی آ رہی تھی۔ تب میں واقعی ڈر گیا کہ ضرور یہ کوئی چڑیل یا بھوت پریت ہے۔ میں بھاگنے ہی لگا تھا کہ اس عورت نے ہاتھ بلند کر کے کہا۔

"میں بھوت نہیں ہوں، میں انسان ہوں۔"

میں ہکا بکا سا ہو کر وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ سب سے زیادہ حیرانی مجھے اس بات کی تھی کہ یہ جملہ اس عورت نے اردو زبان میں کہا تھا۔ میرے قدم وہیں رک گئے۔ وہ میرے پاس آ کر میرے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"وہ میرے پیچھے لگا ہے۔ وہ مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔"

یہ ایک گوری چٹی لڑکی تھی۔ اس کے بال سنہری تھے اور عمر زیادہ سے زیادہ بیس اکیس برس کی ہوگی۔ میں نے قبروں کے پیچھے جو درخت تھے اس طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو وہاں کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔"

وہ لڑکی میرے ساتھ چپکی ہوئی تھی اس کا بدن کانپ رہا تھا اور ٹھنڈا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تم کون ہو۔۔۔۔۔۔۔ تم اردو بولتی ہو، تم ہندوستان کی رہنے والی ہو یا پاکستان کی؟"

لڑکی نے لمبا سانس اور بال ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"یہ باتیں میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی، پلیز مجھے اس ظالم سے بچاؤ۔"

میں نے کہا۔

"تم کس کی بات کر رہی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ ادھر تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

لڑکی نے میرے پیچھے درختوں کی طرف دیکھا اور پھر گہرا سانس بھر کر بولی۔

"وہ بھاگ گیا ہوگا، خدا کا شکر ہے۔"

"کیا تم مسلمان ہو؟"

"ہاں" اس نے اپنے لباس کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں آدھی رات کو اس قبرستان میں کیسے آ گئی ہو؟ تم کہاں رہتی ہو؟ کیا اس سے پہلے بھی تم گلی میں سے چیخ مارتی ہوئی گزری تھیں؟"

"ہاں۔۔۔۔۔۔ کیا کروں میں گھر میں اکیلی تھی۔ میرے ماں باپ پاکستان میں رہتے ہیں۔ میں یہاں اپنی خالہ کے گھر کے پاس آئی ہوں۔ آج گھر پر اکیلی تھی۔ خالہ شیلار گئی ہوئی ہیں۔ یہ آدمی مجھے اکیلا دیکھ کر گھر میں گھس آیا۔ اس نے میری عزت پر حملہ کرنا چاہا۔ میں نے مزاحمت کی تو اس نے خنجر نکال لیا۔ میں نے کھڑکی میں سے گلی میں چھلانگ لگا دی اور قبرستان کی طرف بھاگ اٹھی۔"

اس نے جلدی جلدی مجھے ساری داستان سنا دی۔ ستاروں کی دھندلی روشنی میں اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے کسی نے ہیرے کوٹ کر بھر دیئے ہوں۔ ایسی طلسم خیز آنکھیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ وہ بڑی روانی سے اردو بول رہی تھی اور بار بار ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھتی اور خدا کا شکر ادا کرتی۔ مجھے اس پر شک پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں نے کہا۔

"چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔ کیا تم ان گلیوں میں کسی مکان میں رہتی ہو؟"

"ہاں" اس نے اپنے فراک کو نیچے کرتے ہوئے کہا۔

وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ اس نے ابھی تک میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ ٹھنڈا تھا۔ ظاہر ہے وہ سخت خوفزدہ تھی اور خوف کی وجہ سے ہی اس کا ہاتھ بھی ٹھنڈا تھا۔ ہم قبرستان سے نکل کر گلی میں آئے تو اس لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔

"تم بھی بڑی اچھی اردو بولتے ہو۔ تم مسلمان ہو؟ کیا تم بھی پاکستان کے رہنے والے ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"ہاں میں بھی پاکستان سے آیا ہوں۔ میں ٹورسٹ ہوں۔ وادی کشمیر کی سیاحت کرنے یہاں آیا ہوں اور مسلمان ہوں۔"

پھر میں نے اسے اپنا نام بتایا۔ چلتے چلتے میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک پراسراریت تھی۔ میں نے اسے کہا۔

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

وہ بولی۔ "میرا نام گلنار ہے۔ یہ نام میری نانی نے رکھا ہے۔ میری پیدائش راولپنڈی کی ہے۔ میری نانی کو اناروں کے پھولوں سے بڑا پیار تھا۔ ماں کہتی ہے کہ اسی لیے نانی نے میرا نام گلنار رکھا۔"

تب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ اس لڑکی کی آنکھوں میں زمرد کی سی چمک کیوں تھی۔ پشاور کے علاقے میں اکثر لوگوں کی آنکھوں کا رنگ ایسا ہوتا ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تم یہاں کہاں رہتے ہو؟"

میں نے گلی میں گزرتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"وہ سامنے جو کھڑکی تمہیں نظر آ رہی ہے اس کے پیچھے ایک چھوٹی سی پرانی لائبریری ہے۔ اس لائبریری میں کھڑکی کے ساتھ ایک کیمپ کارٹ بچھی ہے۔ میں اس پر سوتا ہوں اور اسی پر رہتا بھی ہوں۔"

وہ ہنس پڑی۔ اس بار اس کی ہنسی کی کھنک سی بھی سنائی دی تھی۔

"تم نے میری آواز کہاں سنی تھی؟"

"تم جس وقت گلی میں سے گزرتے ہوئے چیخی تھیں تو میں جاگ رہا تھا۔ پھر میں نے کسی کی بھاری قدموں کی آواز سنی۔ اس کے بعد دوبارہ تمہاری چیخ کی آواز آئی تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ اور میں تمہاری مدد کرنے کھڑکی سے کود کر اسی طرف دوڑا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ میں ایک قبرستان میں آ گیا ہوں۔"

گلنار نے پیچھے پلٹ کر دیکھا اور میرے ساتھ لگ گئی۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے وہ درندہ ضرور پیچھے پیچھے آ رہا ہوگا۔"

پھر میرا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام کر التجا کے انداز میں بولی۔

"کیا تم مجھے رات کی رات اپنے پاس نہیں رکھ سکتے؟ میں صبح ہوتے ہی چلی جاؤں گی۔ میں گھر میں اکیلی ہوں۔ اس درندے کو میرے گھر کا علم ہے وہ ضرور وہاں آئے گا اور مجھے قتل کر دے گا۔"

میں نے کہا۔

"چلو میں تمہیں پولیس سٹیشن لیے چلتا ہوں۔"

اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"نہیں نہیں۔۔۔۔۔۔ پولیس کا نام نہ لو۔ میں یہاں کی پولیس کو جانتی ہوں۔ اس طرح میری حالت کی بدنامی بھی ہوگی۔ چلو تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ تھوڑی سی رات باقی رہ گئی ہے۔ میں زمین پر بیٹھ کر گزار دوں گی۔"

اس کے لہجے میں بے حد عاجزی تھی مگر میں اسے اپنے ساتھ لائبریری میں کیسے لے جاتا۔ اس قسم کی حماقت میں بھول کر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس لڑکی کو میں تبلیغی جماعت کے اپنے دوست قدوسی کے پاس لے جاتا ہوں۔ اس کی فیملی بھی وہیں رہتی ہے۔ میں نے اسے کہا۔

''اگر تم واقعی اپنے گھر واپس جانے سے ڈرتی ہو تو چلو میں تمہیں اپنے دوست کے گھر لے چلتا ہوں۔''

جب میں نے اسے تبلیغی جماعت کے سربراہ قدوسی اور اس کی فیملی کے بارے میں بتایا تو وہ گھبرا گئی۔

''خدا کے لیے انہیں میرا مت بتانا' انہیں پتہ چل گیا تو میرے خاندان کی محلے میں بڑی بدنامی ہوگی۔ تبلیغی جماعت والے میرے خالو سے واقف ہیں۔''

میں نے کہا۔

''اس میں بدنامی کی کون سی بات ہے۔ تم کہہ دینا رات کو تم گھر میں اکیلی تھیں' کوئی بدمعاش گھس آیا۔ میں کھڑکی سے چھلانگ لگا کر بھاگی اور تبلیغی جماعت کے ہال میں پناہ لینے آ گئی۔''

گلنار سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''نہیں نہیں ------ پلیز مجھے ان لوگوں کے پاس نہ لے جاؤ۔ تم نہیں سمجھتے کوئی میرے بیان پر اعتبار نہیں کرے گا۔ سب کہیں گے کہ میں ہی بدمعاش لڑکی ہوں۔''

میں عجیب کشمکش میں پڑ گیا تھا۔ اگر میں اس لائبریری والے اپنے کمرے میں لے بھی جاؤں تو اگر قدوسی کو کسی طرح پتہ چل گیا تو وہ میرے بارے میں کیا سوچے گا کہ میں آدھی رات کو ان کی لائبریری میں ایک لڑکی کو لے کر آ گیا تھا۔ دوسری طرف گلنار تھی جو گھڑی گھڑی زیادہ پریشان ہو رہی تھی۔ پھر اس نے رونا شروع کر دیا۔

''پلیز! تھوڑی سی رات رہ گئی ہے مجھے اپنے کمرے میں لے چلو۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ صبح ہوتے ہی میں اپنے گھر چلی جاؤں گی۔ رات کے وقت مجھے اپنے اکیلے گھر میں جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ وہ ضرور آ کر مجھے قتل کر دے گا۔ تم یہاں کے غنڈوں کو نہیں جانتے' یہ ایک منٹ میں قتل کر دیتے ہیں۔''

میں بے بس ہو گیا۔ میں نے ہتھیار پھینک دیئے اور گلنار سے کہا۔

''اچھا میرے ساتھ آؤ۔''

یہ میری حماقت تھی۔ مجھے اس اجنبی لڑکی کو رات کے وقت اپنے کمرے میں نہیں لانا چاہیے تھا۔ کیونکہ میں کسی ہوٹل میں نہیں رہ رہا تھا' ایک باوقار تبلیغی جماعت کی عمارت میں رہ رہا تھا۔ میں گلنار کو کھڑکی کے ذریعے لائبریری میں لے آیا۔ اسے اپنی کیمپ کارٹ پر سونے کو کہا اور خود اپنی جیکٹ میں سمٹ کر وہیں کمرے میں ایک طرف پڑ رہا۔ گلنار نے مجھے بہت کہا کہ تم بھی چارپائی پر ایک طرف لیٹ جاؤ' لیکن میں یہ خطرناک غلطی کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اٹلی میں داخل ہونے کے بعد اس کا جو تلخ تجربہ ہو چکا تھا' میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا

تھا۔ تھوڑی سی رات باقی رہ گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ باقی رات میں جاگ کر گزاروں گا۔ مگر مجھے نیند آ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو سب سے پہلے میں نے چارپائی کی طرف دیکھا۔ چارپائی خالی تھی' گلنار جا چکی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ مجھے سردی لگ رہی تھی چارپائی پر میرا کمبل پڑا تھا۔ میں کمبل میں گھس گیا۔ کمبل کی گرماہٹ نے مجھے بڑی جلدی نیند کی آغوش میں دے دیا۔

دوسری بار میری آنکھ اس وقت کھلی جب دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے میرا دوست قدوسی کھڑا تھا اس نے انگریزی میں کہا۔

''کیا آج سارا دن سونے کا پروگرام ہے؟''

میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''رات دیر سے سویا تھا۔''

قدوسی میرے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ خاموش ہے۔ اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''رات تمہارے پاس کوئی لڑکی آئی ہوئی تھی؟''

میں اس کا منہ تکنے لگا۔ میں شرمندہ تھا۔ قدوسی کے آگے اب میں جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ اسے کسی ذریعے سے معلوم ہو چکا تھا کہ گلنار رات میرے کمرے میں تھی۔ میں نے اسے شروع سے لے کر آخر تک ساری داستان سنا دی اور اسے بتایا کہ کس طرح رات کو مجھے باہر گلی میں کسی کے دوڑنے بھاگنے کی آوازیں اور پھر کسی لڑکی کی چیخ کی آواز سنائی دی اور پھر کس طرح میں اس کی مدد کے لیے گلی میں اترا تھا اور پھر قبرستان میں گلنار کو دیکھا جو سخت گھبرائی ہوئی تھی اور ایک غنڈہ اسے قتل کرنے کے لیے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

''گلنار پاکستانی لڑکی ہے اس کے ماں باپ پاکستان سے آ کر یہاں آباد ہو گئے تھے اور وہ وینس میں ہی پیدا ہوئی تھی۔''

قدوسی بڑے غور سے میرا بیان سن رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ گلنار کا گلی میں ذرا آگے جا کر مکان ہے وہاں اس کے ماں باپ گھر میں نہیں تھے اس لیے اس کے اصرار پر میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔ میں نے قدوسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے لڑکی کے ساتھ کوئی گناہ نہیں کیا۔''

قدوسی بولا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ پچھلی گلی میں شروع سے آخر تک کوئی پاکستانی فیملی نہیں رہتی۔ یہاں سب اطالوی خاندان آباد ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جماعت خانے کے چوکیدار نے لڑکی کو تمہارے اس کمرے سے باہر نکلتے دیکھا ہے۔ اگرچہ میں نے اسے منع کر دیا ہے کہ وہ

اس بات کا ذکر کسی تیسرے آدمی سے نہ کرے لیکن مجھے اس پر اعتبار نہیں ہے۔"

میں نے قدوسی سے کہا۔

"میرے دوست! یقین کرو میں بے گناہ ہوں۔ ہاں مجھ سے یہ غلطی ضرور ہو گئی تھی کہ میں لڑکی پر ترس کھا کر اس کی زندگی بچانے کے واسطے اسے اس کمرے میں لے آیا۔"

قدوسی کچھ دیر خاموش رہا جیسے وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر کہنے لگا۔

"دوست! میرا خیال ہے کہ اب تمہیں یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ چوکیدار کے منہ سے ضرور بات نکل جائے گی اور اس طرح میری بدنامی ہونے کا ڈر ہے۔ کیونکہ میں ہی تمہیں یہاں لایا تھا۔"

میرے لیے قدوسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا۔ میں کسی حالت میں بھی اپنے دوست اور محسن قدوسی کے لیے بدنامی کا باعث نہیں بننا چاہتا تھا۔ میں تو ایک سیلانی تھا' وہاں نہیں تو کسی دوسری جگہ بسیرا کر سکتا تھا۔ میں نے قدوسی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور کہا۔

"قدوسی بھائی! میں آج ہی یہاں سے چلا جاتا ہوں' مجھے تمہاری عزت بے حد عزیز ہے۔"

قدوسی جذباتی ہو گیا' کہنے لگا۔

"میں مجبور ہوں دوست! اگرچہ ہم لوگ یورپ کے ایک مادر پدر آزاد معاشرے میں رہ رہے ہیں' مگر ہماری تبلیغی جماعت کا ایک ضابطہ اخلاق ہے۔ یہ یہاں اسلام کی تبلیغ کے مقدس مشن پر آئے ہوئے ہیں۔ ہم دوسروں کے لیے اعلیٰ کردار کا نمونہ بن کر یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ مجھے تم معاف کر دینا۔ میں جانتا ہوں تم سچ کہہ رہے ہو لیکن آدھی رات کو کسی لڑکی کا تمہارے کمرے میں آ جانا ہمارے مشن کو بدنام کرنے کے لیے کافی ہے۔"

میں اٹھ کر جیکٹ پہننے اور اپنے تھیلے کو ٹھیک کرنے لگا۔ قدوسی بھی کھڑا ہوا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"لیکن میں تمہیں ناشتہ کروائے بغیر یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔ آؤ' میرے کمرے میں آؤ۔"

وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ وہاں میں نے غسل کیا۔ قدوسی نے کمرے میں ہی میرے اور اپنے لیے ناشتہ منگوا رکھا تھا۔ ناشتے پر وہ کہنے لگا۔

"میں جانتا ہوں تم اس شہر میں اجنبی ہو تمہارے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ تم کسی ہوٹل کے اخراجات برداشت کر سکو۔"

میں نے کہا۔

"میں وائی ایم سی اے ہوسٹل میں کوئی جگہ حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

قدوسی کچھ سوچ رہا تھا۔ میری پیالی میں کافی انڈیلتے ہوئے بولا۔

"ایک ترکیب ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے قدوسی کی طرف پر امید نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ یہ کہ سینٹ پال کے علاقے میں میرا ایک مراکشی مسلمان دوست سلیمان رہتا ہے وہ شہر میں ٹیکسی چلاتا ہے۔ اس کے پاس ایک کمرے کا فلیٹ ہے۔ میں اسے فون کرتا ہوں۔ اس وقت وہ گھر پر ہی ہوگا۔ اگر وہ راضی ہو جائے تو تم اس کے فلیٹ میں جتنے روز چاہو رہ سکتے ہو مگر دو ایک دن بعد اپنے کھانے پینے کا انتظام تمہیں خود کرنا ہوگا۔ مطلب یہ کہ تم کسی جگہ جاب کر لینا اور کرایہ داری کی کچھ رقم سلیمان کو ادا کر دینا۔"

قدوسی نے ٹیلی فون اٹھا کر گود میں رکھ لیا اور نمبر ملانے لگا۔ دوسری طرف سے آواز آئی تو قدوسی نے مسکرا کر عربی زبان میں اپنے مراکشی دوست سلیمان سے باتیں شروع کر دیں۔ وہ کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ پھر ٹیلیفون بند کر کے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور بولا۔

"دوست! تمہارا کام بن گیا ہے۔ سلیمان تمہیں اپنے ساتھ رکھنے پر راضی ہو گیا ہے۔ وہ تمہیں کسی جگہ چھوٹی موٹی نوکری بھی دلوا دے گا۔"

ناشتے کے بعد قدوسی نے مجھے سلیمان کا ایڈریس لکھ کر دیا اور مجھے چھوڑنے باہر تک آیا۔ وہ مجھ سے گلے لگ کر ملا اور بولا۔

"مجھے معاف کر دینا دوست! میں مجبور تھا۔"

میں نے قدوسی کے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ اس کا شکریہ ادا کیا اور جہاں سے اس نے بس پکڑنے کے لیے کہا تھا وہاں سے بس پکڑی اور سینٹ پال کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ سارے راستے میں یہی سوچتا رہا کہ قدوسی نے یہ کیسے کہہ دیا کہ تبلیغی جماعت کی پچھلی گلی میں کوئی پاکستانی فیملی نہیں رہتی۔۔۔۔۔۔۔۔ تو پھر گلنار کہاں سے آ گئی تھی؟ کیا وہ کوئی چھلاوہ تھا؟ کیا وہ کوئی بھوت تھا؟ مگر وہ تو زندہ لڑکی تھی۔ میں عجیب شش و پنج میں پڑ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

بس ونٹر کی دھوپ میں چمکتے ہوئے کشادہ بازاروں میں سے گزر رہی تھی۔ اس علاقے میں میں پہلے بھی آ چکا تھا۔ یعنی اس علاقے سے گزر چکا تھا۔ بس نے مجھے سینٹ پال کے مین بس سٹاپ پر اتار دیا۔ میں قدوسی کے دیے ہوئے ایڈریس پر پوچھتا پوچھتا سلیمان کے فلیٹ والی عمارت کے سامنے آ گیا۔ یہ ایک بوسیدہ سی پرانے رومن طرز کی بڑے بڑے ستونوں والی عمارت تھی۔ نچلی منزل رومن طرز کی تھی جبکہ اس کی دوسری اور تیسری منزل پر بعد میں چھوٹے چھوٹے کمرشل فلیٹ بنا دیے گئے تھے۔ میں بوسیدہ سیڑھیاں چڑھ کر قدوسی کے مراکشی دوست سلیمان کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔

فلیٹ کا دروازہ بند تھا۔ ایک اطالوی دوشیزہ اوپر سے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ گریبان کافی کھلا تھا۔ ٹوئیڈ کا پرانا لیڈیز کوٹ اس نے کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ وہ میرے قریب سے گزرتے ہوئے رک گئی۔ میری طرف ایک عاشقانہ سی نگاہ ڈالی اور اطالوی زبان میں کہا۔

"تم انڈین۔۔۔۔۔۔۔؟"

میں نے مسکرا کر اطالوی زبان میں ہی کہا۔

"نہیں۔۔۔۔۔۔۔ میں پاکستانی ہوں۔"

بس مجھے اتنی اطالوی زبان آتی تھی۔ اس نے اپنے سرخ ہونٹوں کو اس طرح سکیڑا جیسے بوسہ دے رہی ہو اور پھر ہاتھ اوپر کر کے پھونک مار کر اطالوی میں کہا۔

"خدا حافظ۔۔۔۔۔۔۔ یہ میری طرف سے تمہیں ایک تحفہ ہے۔"

اور وہ مسکراتی ہوئی سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی۔

سلیمان کا فلیٹ دوسری منزل پر تھا۔ میں نے کال بیل کا بٹن پہلے ہی دبا دیا تھا۔ وہ خوش مزاج اطالوی دوشیزہ مجھے ہوائی بوسہ دے کر جا چکی تھی اور میں ابھی تک سیڑھیوں میں اسے جاتا دیکھ رہا تھا کہ فلیٹ کا دروازہ کھلا اور ایک گہرے سانولے رنگ اور گھنگھریالے سیاہ بالوں والے نوجوان نے دروازہ کھول کر میری طرف دیکھا اور مسکرا کر میرا نام لیا۔ میں نے انگریزی میں کہا۔

"ہاں۔۔۔۔۔۔ مجھے قدوسی نے بھیجا ہے۔"

اس نوجوان نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے انگریزی میں ہی کہا۔

"میرا نام سلیمان ہے۔ اندر آ جاؤ۔"

اندر ایک چھوٹا سا ڈبہ نما کمرہ تھا جو دنیا جہان کی الم غلم چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ سلیمان نے ایک کرسی پر پڑے ہوئے کپڑے کو ہٹاتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔۔۔۔۔۔۔ تم کافی پیو گے؟"

میں نے کہا کہ میں ناشتہ کر کے آ رہا ہوں۔

گیس کا چولہا کمرے کے اندر ہی کونے میں لگا ہوا تھا۔ سلیمان کافی بنانے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ مجھ سے باتیں بھی کر رہا تھا۔

"تم پاکستانی ٹورسٹ ہو۔ مجھے خوشی ہوئی ہے۔ پاکستان سے ہم مراکشی لوگ بڑی محبت کرتے ہیں۔ میں یہاں پانچ سال سے ٹیکسی چلا رہا

ہوں۔ قدوسی نے مجھے بتایا تھا کہ تمہیں وینس دیکھنے کا شوق یہاں لے آیا ہے۔ وینس بڑا خطرناک شہر ہے۔ اٹلی کے سارے شہر خطرناک ہیں۔ یہاں کے لوگ جیب کترے، اٹھائی گیرے اور غنڈے ہیں۔ تم بچ کر رہنا۔"

پھر میری طرف اس نے پلٹ کر پوچھا۔

"ابھی تک تمہاری جیب نہیں کٹی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ حیران ہو کر کہنے لگا۔

"بڑے تعجب کی بات ہے۔"

وہ کافی کا مگ لے کر لوہے کے پرانے پلنگ پر کپڑے ایک طرف ہٹا کر بیٹھ گیا۔

"بس میں ٹیکسی لے کر نکلنے ہی والا ہوں۔ آج میں ایئرپورٹ پر جا رہا ہوں۔ میلان سے جو فلائیٹ آ رہی ہے اس کی سواریاں لوں گا۔ دن کی فلائیٹ میں میلان سے کاروباری لوگ آتے ہیں۔ وہ ہمیں بڑے تگڑے ٹپ دے جاتے ہیں۔"

اس نے سگریٹ سلگایا اور کمرے کی فضا میں تمباکو کی بو پھیل گئی۔

"تم ہمارے پاکستانی مسلمان بھائی ہو تم جب تک چاہو میرے فلیٹ میں رہو۔ میں تم سے ایک پیسہ بھی کرائے کا نہیں لوں گا۔ تم دو سامنے والے صوفے پر سو سکتے ہو۔ دو گرم کمبل میرے پاس فالتو ہیں۔ وہ تم رات کو لے لیا کرنا۔"

پھر اس نے گھڑی پر وقت دیکھا، جلدی سے کافی کا مگ میز پر رکھا، اور سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میلان کی فلائیٹ میں تھوڑی دیر رہ گئی ہے میں جاتا ہوں۔ تم اگر کہیں جانا چاہو تو میں راستے میں تمہیں اتار دیتا ہوں۔"

میرا ارادہ رات کو وینس کی نہروں والی گلیوں کی سیر کرنے کا تھا۔ میں نے کہا۔

"نہیں دوست میں یہاں آرام کروں گا۔"

سلیمان نے اپنی میلی کچیلی جینز کی جیب میں سے چابیوں کا گچھا نکال کر اس کے چھلے میں سے ایک چابی نکال کر مجھے دی اور کہا۔

"تم میرے دینی پاکستانی بھائی ہو میں تم پر دل سے بھروسہ کرتا ہوں۔ یہ چابی اپنے پاس رکھو۔ اگر تم یہاں سے کچھ اٹھا کر لے بھی جاؤ گے تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ ویسے یہاں سے لے جانے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ میں دوپہر کے بعد آؤں گا یا شاید شام کو آؤں .... خدا حافظ!"

یہ کہہ کر سلیمان جیکٹ کاندھے پر ڈال کر فلیٹ سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں پلنگ کی ریلنگ سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا اور خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ مجھے وینس شہر میں سر چھپانے کو جگہ مل گئی۔ مجھے ایک بار پھر گلنار کا خیال آ گیا۔ اگر قدوسی کا بیان حقیقت پر مبنی

ہے کہ اس علاقے میں کوئی پاکستانی فیملی نہیں رہتی تو پھر گلنار کون تھی؟ پھر میں نے اس کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور یہ سوچنے لگا کہ مجھے جاب کہاں مل سکتی ہے اور میں کس قسم کی نوکری یہاں کر سکتا ہوں۔ میں نے سوچا سلیمان آئے گا تو اس سے بات کروں گا۔ میری جیب میں اطالوی کرنسی ابھی اتنی موجود تھی کہ میں پندرہ بیس روز تک گزر کر سکتا تھا۔

سینٹ پال کا علاقہ

میں نے فلیٹ کے دروازے پر اندر سے چٹخنی لگا دی تھی۔ میں نے سونے کی کوشش کی مگر مجھے اجنبی جگہ پر نیند نہ آئی۔ ویسے بھی سلیمان کا کمرہ بڑا گندہ تھا۔ سوچا کیوں نہ سینٹ پال کے علاقے کی سیر کی جائے۔ میں دروازے کو مقفل کر کے سڑک پر آ گیا۔ یہ علاقہ شہر کا گنجان علاقہ تھا۔ دکانیں مختلف اشیاء سے بھری پڑی تھیں۔ یورپ کی ٹورسٹ عورتیں اور مرد جگہ جگہ دکانوں کے شوکیسوں میں جھانکتے نظر آ رہے تھے۔ ان دکانوں میں اٹلی کے سوینیئر بک رہے تھے۔ ریستوران بھی تھے۔ ان ریستوران کے قریب سے گزرتے ہوئے خمیری روٹیوں اور گرم مسالوں کی خوشبو آتی۔ ہر عمر کی اطالوی عورتیں ایک دوسری سے اونچی آواز میں باتیں کرتی فٹ پاتھ پر گزر رہی تھیں۔

میں نے سلیمان کے فلیٹ والے چوک کی نشانی ذہن میں رکھ لی تھی۔ آوارہ گردی کرتے کرتے میں ایک پارک میں آ گیا۔ یہاں ایک بڑی نہر بہہ رہی تھی۔ نہر کی دونوں جانب سائپرس اور یوکلپٹس کے درختوں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ خدا جانے یہ کوئی نہر تھی یا دریا تھا۔ میں نے کنارے پر جا کر جھک کر دیکھا۔ پانی سبزی مائل تھا۔ یہ سمندر کا پانی تھا۔ وینس واقعی پانی کا شہر تھا کہ کسی سڑک کے آخر میں کوئی نہ کوئی نہر بہتی نظر آ جاتی ہے۔ کنارے پر بنچ پڑے تھے۔ میں ایک خالی بنچ پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ ایک عورت بچوں والی گاڑی چلاتی آئی۔ گاڑی یعنی پرام میں ایک گول مٹول سا بچہ گرم کمبل میں دبکا ہوا لیٹا تھا۔ عورت میرے قریب سے گزر گئی۔ میں نے بچے کی طرف دیکھ کر مسخروں کی طرح منہ چڑایا۔ بچہ ہنس پڑا۔ عورت نے مجھے نہ دیکھا۔ پارک میں لڑکے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ درختوں کے پیچھے ایک گرجے کی عمارت نظر آ رہی تھی۔ اس کے مخروطی مینار کے اوپر ایک صلیب دھوپ میں چمک رہی تھی۔

رومن کلیسا کی تاریخ

مجھے رومن کلیسا کی قدیم تاریخ کا خیال آ گیا۔ قدیم دور میں روم یعنی روما کو یورپ کا دل کہا جاتا تھا۔ اس شہر کے آس پاس پہاڑیوں میں وحشی قوم کے قبائل آباد تھے۔ یہ قبائل اکثر روم پر حملہ آور ہوتے۔ کبھی ایک قبیلے کا روم پر قبضہ ہو جاتا، کبھی دوسرا قبیلہ اسے شکست دے کر خود قبضہ کر کے بیٹھ جاتا۔ لیکن روم کی اصل تاریخ ایک سو سال قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے جب سیزر نے روم پر قبضہ کر کے رومن ایمپائر کی بنیاد رکھی۔ ان دنوں رومن قوم نے یورپ اور مغربی ایشیا کے بیشتر شہروں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ شمالی افریقہ کے بھی کئی ملک روم کے زیر نگیں آ

گئے تھے۔ رومن ایمپائر کے شہنشاہ سیزر کہلاتے تھے۔ چوتھی صدی عیسوی میں سیزر تھیوڈوشیس کے عہد میں روم سلطنت مغربی اور مشرقی حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ اس تقسیم کی وجہ سے رومن سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ مشرقی رومن سلطنت ایک مدت تک قائم رہی۔ اس سلطنت کے حکمران کانسٹنٹائن نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ اس دور میں کلیسا ایک بہت بڑی طاقت بن گیا۔ شہنشاہ اور کلیسائی طاقت ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے۔ آخر ایک معاہدے کی رو سے بادشاہ اور کلیسا اپنی اپنی جگہ پر آزاد ہو گئے۔ یہاں سے پوپ کی خود مختاری کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے میں گلیلیو ایسے نامور سائنس دان پر مذہبی عدالت میں مقدمہ چلا۔ آزاد خیال رومن فلاسفر اور ہیئت دان برونو کو زندہ جلا دیا گیا۔ اسی زمانے میں مارکو پولو کو جینوا کی جیل میں قید و بند کی صعوبتیں اٹھانا پڑیں۔

جینوا کی جیل میں ہی مارکو پولو نے اپنا شہرۂ آفاق سفرنامہ لکھا جس نے مشرق بعید کے ملکوں کی تجارتی راہیں کھول دیں اور یورپ کے سمس ممالک دنیا کے امیر ترین ملک بن بیٹھے۔ ایک فٹ بال زور سے میرے بنچ سے ٹکرایا اور میں رومن تاریخ کے ہزاروں سال پرانے دور سے نکل کر واپس بیسویں صدی کے وینس شہر میں آ گیا۔ ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور فٹ بال اٹھا کر بھاگ گیا۔ کافی دیر میں پارک میں سمندر کی سبز نہر کے کنارے بنچ پر بیٹھا سگریٹ پھونکتا کبھی گلنار کی پراسرار شخصیت کے بارے میں سوچتا اور کبھی لاہور کے بھاٹی دروازے، موچی دروازے اور انارکلی کی رعنائیوں کو یاد کرتا رہا۔ جب بھوک محسوس ہونے لگی تو اٹھ کر نہر کے پل پر سے گزرتا ہوا دوسری طرف ایک چھوٹے سے پرشور اور گندے مندے ریستوران میں آ کر کھانا کھایا۔ کھانا کیا تھا بس ایک بڑا سا بند تھا جس کے اندر گوشت کا ایک قتلہ، دہی، سلاد اور کالی مرچ کا مسالہ ڈالا ہوا تھا۔ ویسے اطالوی کھانے خواہ بند برگر ہی ہوں، بڑے مزے دار ہوتے ہیں۔ وینس میں خاص طور پر لوگ گرم مسالوں کا استعمال بڑے شوق سے کرتے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ شروع شروع میں وینس کے جہاز ران ہی اپنے بادبانی جہاز لے کر بحیرۂ روم اور بحر ہند اور بحر اوقیانوس کے سمندروں کو چیرتے ہوئے چین، انڈیا اور کارومنڈل کے ساحل پر پہنچے تھے۔

شام ہو چکی تھی اور وینس شہر روشن ہو رہا تھا کہ میں سلیمان بٹ کے فلیٹ پر پہنچا۔ سلیمان واپس آ چکا تھا۔ چھوٹے سے کابک ایسے کمرے میں مچھلی اور مرچوں کی تیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے اندر داخل ہوتے ہی چھینکیں آنے لگیں۔ سلیمان نے میری طرف ہاتھ ہلا کر کہا۔

"ابھی تھوڑی دیر باہر ہی رہو۔"

میں فلیٹ کے سامنے کاریڈور میں سیڑھیوں کے ستون کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک موٹی اطالوی عورت سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی اور میرے قریب سے ہو کر اوپر کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ جب وہ میرے قریب سے گزری تو مجھے ایسا لگا جیسے مچھلیوں کی کوئی پیٹی کھل

بھینس گزر گئی ہو۔

رات کو میرا پروگرام وینس کی نہروں والی گلیوں میں جانے کا تھا۔

سلیمان نے پیشکش کی کہ وہ مجھے اپنی ٹیکسی پر ریالٹو جزیرے کی گھاٹ تک چھوڑ دے گا۔ اسے آگے شہر کی جنوبی علاقے کی طرف جانا تھا جہاں ساری رات کسینو اور ننگے ڈانس والے کلب کھلے رہتے تھے۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے سلیمان بھائی! تم مجھے ریالٹو جزیرے کی پورٹ پر اتار دینا۔"

سلیمان کہنے لگا۔

"تم زیادہ دیر اس علاقے میں نہ رہنا، وہاں رات کو بڑے جرائم ہوتے ہیں۔ تمہیں وینس کی سمندروں، نہروں والی گلیوں کی سیر کا بہت شوق ہے تو کسی روز میں تمہیں ساتھ لے چلوں گا۔"

میں نے اسے بتایا کہ میں اس سے پہلے بھی اس علاقے کی آوارہ گردی کر چکا ہوں۔ رات کو میں نے اور سلیمان نے فلیٹ میں ہی تلی ہوئی مچھلی اطالوی روٹیوں کے ساتھ کھائی۔ وہ ساتھ ساتھ مارٹینی وائن کے گلاس بھی چڑھاتا رہا۔ میں نے مارٹینی کا صرف ایک گلاس پیا۔ کیونکہ میرا پروگرام ریالٹو جزیرے کے کسی ریستوران میں بھی بیٹھ کر مارٹینی سے شغل کرنے کا تھا۔

سلیمان نے مچھلی کھاتے ہوئے میری طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور پوچھا۔

"تم اتنے دنوں سے وینس میں ہو تم نے یہاں ننگے ڈانس بھی دیکھے ہیں کہ نہیں؟"

میں نے جھوٹ بولا اور کہا۔

"نہیں! میں اس قسم کے ڈانس دیکھنے یہاں نہیں آیا سلیمان بھائی میرا مقصد اس شہر کی سیر و سیاحت اور اس تاریخی ملک کی عظمت رفتہ کا مطالعہ کرنا ہے۔"

"واہ واہ" سلیمان مذاق کے موڈ میں ہنس پڑا۔

اس نے کھانا کھانے کے بعد پتلی جینز سے رگڑ کر ہاتھ پونچھے۔ بہت ہی سستا قسم کا اطالوی سگریٹ سلگا کر کش لیا اور مجھے ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔ اس کی ٹیکسی عمارت کے صدر دروازے کی ایک جانب کھڑی تھی۔ اطالوی لڑکے اس کے بند شیشوں پر انگلیوں سے کچھ لکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سلیمان نے انہیں جھڑک کر ایک طرف ہٹایا بڑبڑایا ہوا آگے نکل گیا۔ مجھے ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا۔

"آجاؤ۔"

سینٹ پال کے علاقے سے ریالٹو کافی دور تھا سلیمان کہہ رہا تھا۔

"اگر مجھے آج رات عربیا گلیوں اور کینالو کی طرف گشت کرنے نہ جانا ہوتا تو میں تمہیں تی ورنکل جا سکتا تھا۔ آج میں جلدی نکل آیا ہوں۔ ایک بجے رات تک واپس فلیٹ پر آ جاؤں گا۔ تم کس وقت آؤ گے؟ کیا تمہیں معلوم ہے یہاں سے سینٹ پال کے لیے کون سے نمبر کی بس چلتی ہے؟"

پھر اس نے مجھے ساری بسوں کے روٹ سمجھائے اور کہا۔

"زیادہ دیر اس علاقے میں نہ ٹھہرنا۔ کہیں لوٹ جاؤ گے، ورکوئی پتہ نہیں کوئی پیچھے سے آ کر تمہیں چاقو گھونپ دے اور بعد میں تمہاری تلاشی لے کر بھاگ جائے۔"

سیمون تیزی سے گاڑی آگے نکال کر چل دیا۔ ریالٹو جزیرے کی چھوٹی سی پورٹ روشنیوں میں جگمگا رہی تھی۔ سمندر کے پانیوں میں وینس کی پلی گلیوں والی عمارتوں کی روشنیوں کا عکس جھلملا رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے ہر طرف چراغاں ہو رہا ہے۔ پورٹ پر گنڈولے مسافروں کو لے کر آ جا رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر غیر ملکی سیاح تھے۔ اس وقت رات کے دس بجنے والے تھے۔ سردی کافی تھی۔ میں نے اونی ٹوپی سے سر ڈھانپ رکھا تھا۔ جسم پر گرم جیکٹ تھی۔ ٹورسٹ تھیلا میں فلیٹ پر ہی چھوڑ آیا تھا۔ بٹوہ جس میں میرا پاسپورٹ تھا وہ بھی میں نے فلیٹ پر ہی تھیلے میں رکھا ہوا تھا۔ میری جیب میں کوئی ساٹھ کے قریب لیرے تھے جتنی اطالوی کرنسی کر لی تھی۔ ایک سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس تھی اور ایک چھوٹا سا چاقو تھا جو میں نے سیب کاٹنے کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔

ایک گنڈولا یعنی کشتی جیٹی کے ساتھ آ کر رکی۔ اس میں سے سارے مسافر اتر گئے۔ دو اطالوی مزدور ٹائپ کے آدمی نشے میں تھے اور جھومتے جھامتے کوئی اطالوی گانا ڈیٹ کی شکل میں گاتے کشتی سے اترے اور ایک طرف چل دیے۔ میں بھی دوسرے سیاحوں کے ساتھ اس کشتی میں سوار ہو گیا۔

آہوں والا پل

کشتی کا ملاح سانولے چہرے والا کوئی مراکشی تھا۔ اس نے سر پر پھول دار سرخ رومال باندھا ہوا تھا اور اس نے کانوں میں بحری قزاقوں والی سنہری بالیاں پہن رکھی تھیں۔ وہ کشتی کی پچھلی سائیڈ پر کھڑا دونوں ہاتھوں سے ایک ہی چپو کو کبھی بائیں اور کبھی دائیں چلا رہا تھا۔ کشتی ایک چھوٹے سے سمندری نالے سے گزر کر وینس کی آبی یعنی نہروں والی گلیوں میں داخل ہو گئی۔ یہاں کشتیاں بڑی آہستہ آہستہ چلتی تھیں۔ سیاح فلیش گن چلا چلا کر آس پاس کی تاریخی حویلیوں اور مکانوں کی تصویریں بنانے لگے۔ راستے میں ایک فٹ پاتھ کا ریستوران بھی آیا۔ کئی سیاح یہاں ڈرنک وغیرہ کرنے اور سنیکس کھانے کے لیے اتر گئے۔ میں کشتی میں ہی بیٹھا رہا۔ شروع میں میرا ارادہ بھی تھا کہ میں کسی آبی گلی کے ریستوران میں بیٹھ کر نظارگی سے لطف اندوز ہوں گا مگر وینس کی نہروں والی پراسرار نیم روشن گلیوں میں سے گزرتے

ہو سے میرا موڈ بالکل بدل گیا۔ اب میرا دل چاہتا تھا کہ رستے میں کوئی کافی شاپ آئے تو وہاں بیٹھ کر کافی پیوں۔ کشتی دیر تک آبی گلیوں میں بہتی رہی۔ کبھی ایک موڑ گھوم جاتی۔ کبھی دوسرا موڑ گھوم کر تیسری گلی کی تنگ مرمری نیم روشن حویلیوں کے درمیان آ جاتی۔ اب ایسا ہوا کہ ایک ایک کر کے کشتی کے سارے سیاح رستے کے ریستورانوں اور بعض تاریخی مقامات پر اتر گئے۔ میں اکیلا کشتی میں بیٹھا رہ گیا۔ ملاح نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں جاؤں گا۔ میں نے کہا۔

"مجھے برج آف سائیجز لے چلو۔ میں اس انتظار میں تھا کہ کشتی خالی ہو تو ادھر جاؤں۔"

ملاح نے میرے ساتھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بات کی تھی۔ میں نے بھی اس کو شکستہ انگریزی میں ہی جواب دیا تھا۔ ملاح آہستہ آہستہ چپو چلا رہا تھا۔ کشتی غیر محسوس انداز میں گلیوں کے سمندری پانی پر تیر رہی تھی۔ ملاح نے برج آف سائیجز یعنی 'آہوں والے پل' کے بارے میں سنا تو کہنے لگا۔

"وہ پل آسیبی ہے تم وہاں کیوں جانا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں نے سن رکھا ہے کہ وہاں آدھی رات کو کسی عورت کی آہیں بھرنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ عورت کون ہے۔"

ملاح نے مجھے آنکھیں سکیڑ کر غور سے دیکھا۔ اس کے منہ میں بجھا ہوا سگار تھا۔ کہنے لگا۔

"کیا تم کوئی جادوگر ہو؟"

میں نے کہا۔

"نہیں میں پاکستان سے آیا ہوں میں ٹورسٹ ہوں۔"

ملاح پھر بولا۔

"پھر اس پل کی طرف مت جاؤ۔ وہاں رات کو کوئی ٹورسٹ نہیں جاتا۔"

میں نے کہا۔

"تم مجھے وہاں لے چلو میں تمہیں دس یورو دوں گا۔"

ملاح نے سگار منہ سے نکال کر اپنی رنگین جیکٹ کی جیب میں ڈال دیا اور بولا۔

"میں ایک شرط پر لے جا سکتا ہوں کہ تمہیں وہاں چھوڑ کر فوراً واپس آ جاؤں گا۔ اگر تمہیں یہ شرط منظور ہے تو میں تیار ہوں۔"

میں نے کہا کہ مجھے اس کی شرط منظور ہے۔ اس نے چپو بائیں ہاتھ میں لے کر پانی میں ڈال کر پیچھے کو چلایا۔ اور کشتی کا رخ دوسری طرف مڑ گیا۔ وہ مختلف آبی گلیوں میں سے کشتی کو نکالتا ہوا، ایک ایسی گلی میں آ گیا جو دوسری گلیوں کی نسبت تنگ تھی۔ اس گلی میں اکثر مکان خالی تھے، دور تک تاریک دالان سنسان تھے۔ سمندر کا پانی مکانوں کی دیواروں کے درمیان بالکل ساکن تھا۔ دو جگہوں پر بجلی کے ٹیوب روشن تھے۔ میں نے اس گلی کو پہچان لیا۔ میں نے سامنے کی طرف دیکھا جہاں دوسری ٹیوب لائیٹ لگی تھی، اس سے کوئی دو بلاک چھوڑ کر اندھیرے میں مجھے آہوں کا پل نظر آ گیا جو دو مکانوں کے درمیان ایک محراب کی طرح تنا ہوا تھا۔ میں دن کے وقت اس پل کے نیچے سے ایک بار گزرا تھا۔

ملاح نے کشتی ایک خالی مکان کے سنسان دالان کی پتھریلی سیڑھیوں کے پاس روک دی اور بولا۔

"بس میں یہاں سے آگے نہیں جاؤں گا۔"

میں نے کہا۔

"میں تیر کر پل تک نہیں جا سکتا۔ مجھے تیرنا نہیں آتا۔ تم کم از کم مجھے پل کے قریب تو لے چلو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا تم نے دس لیرے نہیں لینے؟"

ملاح اپنی زبان میں بڑبڑاتا ہوا چپو چلانے لگا۔ آہوں والے پل سے تھوڑے فاصلے پر پیچھے ایک ویران حویلی تھی۔

ملاح نے اس حویلی کے دالان کی سیڑھیوں کے ساتھ کشتی لگا دی اور کہا۔

"بس اس سے آگے میں کسی صورت میں نہیں جا سکتا۔ اب تم جانو تمہارا کام۔"

میں نے اسے جیب سے دس لیرے نکال کر دیئے۔ ملاح کی شکل بتا رہی تھی کہ وہ کافی ڈرا ہوا ہے۔ اس نے لیرے لے کر جیب میں ٹھونسے بڑی تیزی سے کشتی کو پیچھے کو گھمایا اور تیز تیز چپو چلاتا گلی کا موڑ گھوم گیا۔

اب میں نے پل کی طرف دیکھا۔ پل اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک پل تو مجھے بھی کچھ خوف سا محسوس ہونے لگا۔ لیکن یہ خیال مجھے حوصلہ دے رہا تھا کہ وہاں کوئی چڑیل وغیرہ نہیں ہے بلکہ ایک عورت کی آہیں بھرنے کی آواز آتی ہے۔ میرا تجسس تھا جو مجھے وہاں تک لے آیا تھا اور آگے لے جا رہا تھا۔ پل حویلی کے دالان سے بمشکل کوئی دس قدم پر ہوگا۔ گلی میں اگر فرش ہوتا تو میں دس قدم چل کر پل تک پہنچ جاتا۔ مگر گلی میں ایڈریاٹک سمندر کا پانی بہہ رہا تھا۔ جس خالی حویلی کے دالان کی سیڑھیوں میں میں کھڑا تھا وہاں بھی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ سوچتے سوچتے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے اس حویلی کے اندر ہی سے کوئی راہداری یا راستہ پل تک جاتا ہو۔ گلی کی دوسری جانب کسی اونچی حویلی کی قلعہ نما دیوار تھی۔ کسی مکان کی کھڑکی وغیرہ بھی کھلی تھی۔ میں نے اللہ کو یاد کیا اور دالان میں سے

گزرتا ہوا حویلی کے بڑے دروازے پر آ گیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ اندر سے مرطوب ہوا آ رہی تھی۔ میں نے جھانک کر اندر دیکھا مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا۔

میں نے جیب سے ماچس نکال کر تیلی روشن کی۔

ماچس کی روشنی میں مجھے ایک طرف تنگ سا زینہ اوپر جاتا نظر آ گیا۔ ضرور یہ زینہ آہوں والے پل کو جاتا ہو گا۔ تیلی بجھ گئی۔ میں نے زینہ دیکھ لیا تھا۔ اندازے سے اس کی طرف بڑھا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

یہ میری بیوقوفی ہی آپ سمجھیں، مگر جوانی میں انسان کو اس قسم کی بیوقوفیاں ضرور کرنی چاہئیں۔ دوسروں کا تو مجھے پتہ نہیں، لیکن میں نے ایسی بہت سی بیوقوفیاں کی ہیں اور کبھی کبھی آج بھی کرتا ہوں۔ اس سے مجھے نقصان کم پہنچا ہے مگر علم بہت حاصل ہوا ہے، کئی سربستہ راز افشا ہوئے ہیں۔ میں آہوں والے پل کا سربستہ راز بھی کھولنا چاہتا تھا۔

زینے میں بڑا اندھیرا تھا۔ میں ماچس جلا جلا کر اس کی روشنی میں زینہ چڑھ رہا تھا۔ زینہ ایک طرف گھوم گیا۔ پھر چکر کھا کر سیدھا ہو گیا۔ آگے ایک دروازہ آ گیا جو بند تھا۔ میں نے ماچس کی تیلی جلا کر دیکھا۔ دروازے پر کوئی تالا نہیں تھا۔ میں نے اسے ذرا سا دبا کر اندر کو دھکیلا۔ دروازہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ اندر سے جو ہوا آئی اس میں مشک کافور کی بو تھی۔ میں پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ مجھے خوف محسوس ہوا کہ اندر واقعی کوئی چڑیل ہی نہ رہتی ہو۔ ایک بات کی وضاحت یہاں میں ضرور کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ مجھے بچپن ہی سے چڑیلوں کو دیکھنے کا شوق رہا ہے۔ ٹھیک ہے مجھے ان سے ڈر ضرور لگتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ میری آرزو ہوتی تھی کہ کبھی کوئی چڑیل مجھے نظر آئے اور میں اسے دیکھوں، اس کی آواز سنوں۔ اسی خواہش نے میرے اندر چڑیل کا آدھا خوف ختم کر دیا تھا۔ اس وقت بھی مجھے ڈر ضرور لگ رہا تھا لیکن دل میں شوق اور تجسس بھی تھا کہ اگر واقعی اندر کوئی چڑیل ہے تو میں اسے دیکھوں کہ وہ کیسی ہے۔

میں نے بچپن میں یہ بھی سنا تھا کہ چڑیل کبھی پری اور کبھی نہایت حسین عورت کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر چڑیل کسی حسین عورت کے روپ میں سامنے آئی تو میں اس سے التجا کروں گا کہ اب اسی روپ میں رہنا۔

چنانچہ تھوڑی دیر تک میں زینے کی دیوار کے ساتھ خاموش کھڑا رہا۔ پھر اللہ کا نام لے کر دروازے میں سے اندر داخل ہو گیا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ میں دروازے کے پاس ہی ایک طرف خاموش کھڑا ہو گیا اور آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی تک مجھے کسی عورت کے آہیں بھرنے کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

ایک سناٹا سا فضا پر طاری تھا۔ میں نے بھی فیصلہ کر رکھا تھا کہ آہوں کے پل کا راز معلوم کر کے رہوں گا۔ میں ہمت کر کے دیوار کا سہارا لیے قدم قدم بڑھنے لگا۔ میں دیوار کو ہاتھ سے ٹٹولتا ہوا جا رہا تھا۔ کیونکہ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد میرا ہاتھ

کسی ستون سے جا کر لگا۔ میں ستون پر ہاتھ اوپر تک لے گیا۔ یہ ستون دیوار کے ساتھ ساتھ شاید چھت تک چلا گیا تھا۔ میں نے ایک پاؤں آگے بڑھا کر فرش کو ٹٹولا کر آگے کیا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ آگے بھی کوئی زینہ ہے جو نیچے جاتا ہے۔ اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں میں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ مجھے واپس چلے جانا چاہیے۔ لیکن منزل کے قریب آ کر واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر زینہ اترنے لگا۔ یہ زینہ تنگ تھا اور ذرا نیچے جا کر گھوم گیا۔ جیسے ہی میں زینے کا موڑ گھوما مجھے ہلکی ہلکی روشنی نظر آئی۔ یہ روشنی نیچے سے آ رہی تھی۔

ساتھ ہی مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں وہیں دم سادھے کھڑا ہو گیا۔ ایسے جیسے کوئی فرش پر چل رہا ہے۔ پھر یہ آواز دور ہو کر غائب ہو گئی۔ میں ہمت کر کے زینے کی آخری سیڑھی تک آ گیا۔ آگے پھر ایک دروازہ تھا۔ دروازے کے اوپر ایک محرابی روشن دان تھا۔ روشنی اس روشن دان میں سے آ رہی تھی۔ یہ بجلی کی روشنی لگ رہی تھی۔ میں نے دروازے میں دوسری طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر وہاں کوئی سوراخ وغیرہ نہ تھا۔ روشن دان کافی اونچا تھا۔ مشک کافور کی بو میں اب عجیب و غریب پرفیوم کی خوشبو بھی شامل ہو گئی تھی۔ میں نے دروازے کے ساتھ کان لگا دیے۔ دوسری طرف جیسے کوئی فرش پر چل پھر رہا ہو۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر اس حویلی میں کوئی شریف آدمی رہتا ہے تو وہ تو مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دے گا کہ میں چوری کی نیت سے اس کی حویلی میں داخل ہوا تھا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی دروازے کے قریب سے گزر رہا ہو۔ میں نے کان اس آواز پر لگا دیے۔ قدموں کی آواز غائب ہو گئی۔ پھر مجھے وہ آواز سنائی دی جس کی جستجو مجھے وہاں کھینچ کر لے آئی تھی۔ یہ کسی عورت کے آہیں بھرنے کی آواز تھی۔ ایک بار تو میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آواز دروازے کے بالکل قریب سے آ رہی تھی۔

چند سیکنڈ کے بعد یہ آواز بھی ختم ہو گئی۔

میں اس آواز کا معمہ حل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے قدرتی خوف پر بڑی مشکل سے قابو پایا اور دروازے کو ذرا سا دھکیلا۔ دروازہ کھل گیا۔ دوسری طرف جھانک کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ سامنے ایک کشادہ کمرہ تھا۔ فرش پر قالین بچھا تھا۔ دیواروں پر سرخ رنگ کے بوسیدہ پردے پڑے ہوئے تھے۔ سنگ مرمر کے دو ستونوں کے درمیان ایک دیوان بچھا تھا۔ کمرہ خالی تھا۔ میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ فضا میں بڑی پراسرار خوابناک سی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ میں خالی دیوان تک جاؤں۔۔۔ اتنے میں ستونوں کے عقب میں سرخ پردہ ایک طرف کو ہٹا اور میں نے ایک سرخ اور سفید عورت کو دیکھا جس نے قدیم رومن طرز کا سرخ لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اس کا ایک کندھا ننگا تھا۔ سر پر رومن شہزادیوں کی طرح سفید پھولوں کی ڈالی کا تاج پہن رکھا تھا۔ چھت کے ساتھ موم بتیوں والا فانوس روشن تھا۔ اس کی روشنی میں عورت کے سنہری بال طلوع ہوتے سورج کی کرنوں کی طرح چمک رہے تھے۔ بال آبشار کی طرح اس کے عریاں شانے پر گر

رہے تھے۔

رومن شہزادی

مجھے یقین سا ہونے لگا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں یا پھر حقیقت کی دنیا سے نکل کر خواب کی دنیا میں آ گیا ہوں۔ وہ عورت جو رومن شہزادی لگ رہی تھی ابھی تک ستونوں کے پاس کھڑی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر انگریزی میں کہا۔

"سوری! میں غلطی سے یہاں آ گیا ہوں۔ دراصل میں ٹورسٹ ہوں اس پرانی حویلی کی سیر کرنا چاہتا تھا۔"

عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بڑے شاہانہ انداز میں چلتی ہوئی دیوان پر آ کر بیٹھ گئی۔ میں ابھی تک دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کے پاس آ گیا۔ اب میں نے دیکھا کہ وہ عورت واقعی کوئی رومن شہزادی لگ رہی تھی جو ہزار سال پرانی تاریخ کے ورقوں میں سے نکل کر بیسویں صدی میں آ گئی ہو۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ مجھے حوصلہ ہوا کہ یہ چڑیل نہیں ہے اور اگر چڑیل بھی ہے تو میں اس سے التجا کروں گا کہ وہ اسی رومن شہزادی والے روپ میں ہی رہے۔

دیوان کے پاس ہی ایک پرانی طرز کی کرسی پڑی تھی۔ عورت نے خواب آلود آواز میں انگریزی میں کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔"

میں رومن طرز کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تب میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ دیواروں پر تیر کمان نیزے اور پرانا اسلحہ سجا ہوا تھا۔ یہ کسی ساتویں آٹھویں صدی عیسوی کے قلعے کا دیوان خانہ معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کیا تم اس حویلی میں رہتی ہو؟ تم نے رومن کاسٹیوم کیوں پہن رکھا ہے؟"

عورت کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ ایک باوقار سنجیدگی اور جلال سا چہرے پر آ گیا۔ اس نے چہرہ ذرا سا اوپر اٹھا کر کہا۔

"میں روم کے چوتھے سیزر دکتانیاس شہنشاہ روم کی بیٹی شہزادی دریانہ ہوں۔ یہ میرا محل ہے۔ میں ہر مہینے اماوس کی رات کو یہاں آتی ہوں۔"

تب مجھے یاد آ گیا کہ آہوں کے پل کے بارے میں ایک ملاح نے مجھے بتایا تھا کہ اماوس کی رات کو جب آسمان پر چاند نظر نہیں آتا اور گہری تاریکی ہوتی ہے تو اس پل کی جالیوں میں سے کسی آسیب کی آہیں بھرنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اماوس کی رات کے سوا یہ آواز کبھی سنائی نہیں دیتی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی آسیبی عورت ہے۔ مگر کمرے میں ماحول روشن تھا اور عورت پورے شاہانہ لباس کے ساتھ دیوان پر نیم

درندگی۔ وہاں خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ لیکن میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ یہ عورت کون ہے اور قدیم رومن طرز کا ماحول بنا کر یہاں کیا کر رہی ہے۔ آخر میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"ماریانہ! میں بیسویں صدی کا رہنے والا ہوں اور یہ صدی سائنس اور ٹیکنالوجی کے عروج کی صدی ہے۔ میں کیسے یقین کروں کہ تم آج سے ایک ہزار برس پہلے کے کسی رومن بادشاہ کی بیٹی ہو اور اب تک زندہ ہو؟"

ماریانہ کے چہرے پر کچھ اداسی سی چھا گئی۔ جیسے ایک سایہ سا گزر گیا ہو۔ ایک لمحے کے لیے وہ قالین پر نظریں جمائے کچھ دیکھتی رہی۔ پھر میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

"میں جانتی ہوں تم ضرور مجھے کوئی چڑیل یا بدروح سمجھ رہے ہو گے۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے میں بھی تمہاری طرح زندہ ہوں اور انسان ہوں۔"

میں نے کہا۔ "لیکن کوئی انسان ایک ہزار برس تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ میرا تو خیال ہے کہ تم وینس کی کوئی ایکٹرس ہو اور تمہیں قدیم زمانے کا لباس پہننے کا شوق ہے۔"

ماریانہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ گہری آواز میں بولی۔

"ایک ہزار سال میں تم پہلے شخص ہو جو کسی خوف اور دہشت کے بغیر یہاں تک آئے ہو۔ تم سے پہلے بھی کچھ لوگوں نے حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر وہ میری آہوں کی آواز اور قدموں کی آہٹیں سن کر خوف کے مارے بھاگ گئے یا بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑے۔ تم نے یہاں آ کر ثابت کر دیا ہے کہ تم ہی وہ بہادر آدمی ہو جس کو میرے ہم راز ہونے کا حق حاصل ہے۔"

میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ یہ عورت وینس ٹی وی یا کسی اسٹیج کی اداکارہ ہے، اور رومن ایمپائر کے ماضی کا بھوت اس پر سوار ہو گیا ہے، اور اب یہ رات کو رومن شہزادیوں والا لباس پہن کر اپنا شوق پورا کرتی ہے۔ میں بغیر کسی ڈر خوف کے اس سے باتیں کرنے لگا تھا۔ میں نے سوچا معلوم کرنا چاہیے کہ یہ کون سا راز مجھے بتانا چاہتی ہے۔ جب میں نے اس کے خاص راز کے بارے میں پوچھا تو اس نے ایک گہرا سانس لیا اور کہنے لگی۔

"میں دو ہزار سال سے ہر تاریک رات کو یہاں آتی ہوں، مجھے کسی ایسے انسان کی تلاش ہوتی تھی کہ جس کو میں بتا سکوں کہ قدیم رومن سلطنت کا جاہ و جلال کیسا تھا۔ اسے یہ بتا سکوں کہ رومن شہنشاہ صرف ظالم حکمران ہی نہیں تھے وہ فلسفی، آرٹسٹ اور شاعر بھی تھے۔ رومن ایمپائر نے اگر ایک ظالم بادشاہ نیرو پیدا کیا تو مارکس اوریلیس بھی رومن سلطنت کا بادشاہ ہی تھا جس کی دانشمندی، علم دوستی اور رعایا پروری مثالی حیثیت رکھتی تھی۔"

وہ چپ ہو گئی پھر اس نے ایک گہری آہ بھری اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میری آہیں روم کے عالیشان ماضی کا نوحہ ہیں۔ تم اس ملک کے رہنے والے نہیں ہو تم ایک رومن شہزادی کے کتھارسس کو کبھی سمجھ نہیں سکتے۔ روم کے ہر شہنشاہ، ہر سیزر نے عظیم سلطنت روما کا خواب دیکھا اور روم کی سلطنت کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچایا۔ مگر افسوس اس عظیم سلطنت کی عمارت چند سالوں کے اندر ہی زمین بوس ہو گئی۔"

میں نے کہا "اس میں کوئی شک نہیں کہ روم کی عظیم سلطنت نے دنیا کو ایک کوڈ آف لاء دیا مگر اس میں کچھ خامیاں بھی تھیں۔ جو کچھ بھی تھا، رومن سلطنت کا جاہ و جلال مفتوحہ علاقوں کے خراج کا مرہون منت تھا۔ جیسے جیسے مقبوضہ علاقے آزاد ہوتے گئے، رومن سلطنت کے محل مسمار ہوتے چلے گئے۔ اور ایک وقت آیا کہ رومن سلطنت روما نام کا ایک چھوٹا سا شہر بن کر رہ گئی۔"

ماریانہ کی آنکھوں میں عجیب چمک تھی۔ اس نے ساکت نگاہوں سے مجھے غور کر دیکھا، پھر دیوان پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میرے ساتھ آؤ، میں تم پر ایک راز فاش کرنا چاہتی ہوں۔"

اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ دیوان کے عقب میں جو سرخ بوسیدہ بھاری پردہ گرا ہوا تھا، وہ آہستہ آہستہ چلتی اس طرف گئی۔ ایک ہاتھ سے پردہ ہٹایا اور آگے بڑھی۔ پردے کے پیچھے بھی ایک چھوٹا سا زینہ تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے زینہ اترنے لگا۔ یہ سب کچھ مجھے ایک ڈرامہ سا لگ رہا تھا۔ یہ زینہ ایک چھوٹے سے کمرے میں چلا گیا تھا۔ چھت کے ساتھ موم بتیوں والا فانوس روشن تھا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ فرش سنگ مرمر کا تھا۔ سامنے دیوار پر کسی باغ کا منظر روغنی رنگوں میں پینٹ کیا ہوا تھا۔ یہ باغ پرانا تھا جس میں ایک طرف کسی قلعے کا دروازہ تھا۔ قلعے کے دروازے کے آگے خندق پر لکڑی کا پل بنا ہوا تھا۔ باغ میں سائپرس کے درخت ساکن کھڑے تھے۔ ماریانہ دیوار پر بنی ہوئی اس تصویر کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس نے میری طرف گردن پھیر کر دیکھا اور بولی۔

"تمہیں اپنے دور زمانے کی سائنس اور ٹیکنالوجی پر بڑا فخر ہے مگر جو راز میں تم پر افشا کرنے والی ہوں وہ تمہیں اور تمہاری سائنس کو بھی حیران کر دے گا۔ میرا ہاتھ پکڑ لو۔"

میں دل میں کچھ گھبرا سا گیا کہ جانے یہ عورت کیا کرنے لگی ہے۔ میں ذرا جھجکا تو اس نے خود میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔

"گھبراؤ نہیں، میں تمہیں کسی ایسے رومن ایرینا میں نہیں لے جا رہی جہاں انسانوں کو بھوکے شیروں کے آگے ڈالا جاتا تھا۔"

میں نے اپنے حواس درست کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔"

ماریانہ مسکرائی

"تم سمجھ بھی نہیں سکتے۔ میں تمہیں اپنے شاہی محل میں لیے جا رہی ہوں۔ یہ قلعہ دیکھ رہے ہو؟ یہ تصویر میں بنا ہوا قلعہ ہے، تصویر میں بنا ہوا باغ ہے۔ دونوں بے جان ہیں مگر ابھی ان میں جان پڑ جائے گی۔ میرے ساتھ اس باغ میں آ جاؤ۔"

اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی پاگل عورت ہے جو وینس کے کسی نفسیاتی امراض کے ہسپتال سے فرار ہو کر اس حویلی میں آ کر بیٹھ گئی ہے۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ماریہ نے میرا ہاتھ کھینچا اور دوسرے سمے میں نے دیکھا کہ میں ایک باغ میں ہوں۔ یہ وہی باغ تھا جو ایک سیکنڈ پہلے میں نے دیوار پر تصویر کی شکل میں بنا ہوا دیکھا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

یا اللہ! یہ کیا معجزہ ہے؟

میں اس باغ میں کیسے آ گیا؟

باغ میں کیسے جان پڑ گئی؟

اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کے تصور سے میرے دل پر رقت طاری ہو گئی۔ میرے مالک تو، مالک ارض و سما ہے۔ تو قادر مطلق ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے تیرے حکم اور تیرے اشارے سے ہوا ہے۔ تو اگر چاہے تو تن مردہ میں جان پڑ جائے۔ تو عظیم ہے! تو قادر مطلق ہے۔

میں نے باغ کا جائزہ لیا۔ باغ میں شام کا وقت تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوا میں سائپرس کے درختوں کی شاخیں آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔ میں نے قلعے کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ ایک سیکنڈ پہلے جس قلعے کا دروازہ بند تھا اب وہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ قلعے کے اندر سے دو گھڑ سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے نکلے۔ لکڑی کے پل پر ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ پل عبور کر کے وہ باغ کے دوسری طرف سڑک پر درختوں میں غائب ہو گئے۔ ماریہ نے ابھی تک میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسی طمانیت اور سکون تھا جیسے وہ اپنے گھر میں آ گئی ہو۔ کہنے لگی۔

"جانتے ہو تم کس زمانے میں ہو اور کہاں آ گئے ہو؟"

مجھ پر ابھی تک حیرت طاری تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں ابھی تک تیز تیز تھیں۔ میں بول نہ سکا۔ صرف نفی میں سر ہلا دیا۔ اس نے قلعے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ میرے شہنشاہ باپ کا قلعہ ہے اور تم اپنے زمانے سے تقریباً دو ہزار برس پیچھے آ گئے ہو۔"

اب جو میں نے اپنے لباس پر نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر مزید حیران رہ گیا کہ میرا لباس بھی قدیم رومن زمانے کے لباس میں بدل چکا تھا۔ میرے پاؤں میں فیتے دار چپل تھی۔ جسم پر صرف ایک ہی قرمزی رنگ کا ٹیونک یعنی لبادہ تھا۔ میں نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میرے بال بھی رومن وضع کے لمبے لمبے ہو گئے تھے۔ میں دہشت زدہ ہو گیا۔ یا اللہ! یہ کیا کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ یا اللہ! تو میری حفاظت کرنا۔

"آؤ میں تمہیں اپنی سہیلیوں سے ملاؤں۔"

ماریانہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے باغ کے دوسرے قطعے میں لے گئی۔ یہاں صنوبروں کے ساتھ سرو کے درختوں کے جھنڈ بھی تھے۔ چاندی ایسے پانی کا فوارہ چل رہا تھا۔ سنگ مرمر کی روشوں کے درمیان شفاف پانی کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ درختوں کے نیچے جگہ جگہ سنگ مرمر کے بنچ پڑے تھے۔ ایک طرف سے لڑکیوں کے قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر چھ سات رومن لڑکیاں قدیم ریشمی رومن لباس میں سرو کے درختوں کے درمیان سے دوڑتی ہوئی نکلیں اور ماریانہ کے پاس آکر رک گئیں اور مجھے حیرانی سے تکنے لگیں۔ ایک لڑکی نے اس زمانے کی رومن زبان میں ماریانہ سے کچھ پوچھا۔ ماریانہ نے میری طرف اشارہ کر کے انہیں کچھ کہا۔ وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ باغ کی ایک روش کے قریب ایک ڈولی رکھی ہوئی تھی۔ چار حبشی غلام سر جھکائے ایک طرف کھڑے تھے۔ ڈولی کے چار بانس تھے جو باہر نکلے ہوئے تھے۔ ان پر چاندی کے پترے چڑھے ہوئے تھے۔

ڈولی کے اوپر ایک سنہری چھت پڑی تھی۔ ماریانہ نے مجھے ڈولی میں اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ اس کے ساتھ ہی غلاموں نے ڈولی کو کندھوں پر اٹھایا اور ایک خاص رفتار سے چلتے ہوئے باغ سے باہر نکل آئے۔ ماریانہ نے کہا۔

"میں تمہیں اپنے زمانے میں ضرور لے آئی ہوں۔ تمہارا لباس اور حلیہ بھی قدیم رومنوں والا ہو گیا ہے مگر تمہاری زبان میں تبدیلی نہیں آ سکی۔ تم رومن زبان جو یہاں بولی جاتی ہے نہیں سمجھ سکو گے اس لیے خاموش رہنا۔ میں نے اپنی سہیلیوں سے بھی تمہارا تعارف یہ کہہ کر کرایا تھا کہ تم قرطاجنہ میں جو میری سہیلی رہتی ہے اس کے بھائی ہو اور تم بول نہیں سکتے۔ میں اپنے باپ سے بھی تمہارا اسی طرح تعارف کراؤں گی۔ تم بالکل مت بولنا۔"

میں تو جیسے خواب کے عالم میں تھا۔ سب کچھ خواب لگ رہا تھا۔ ماریانہ کی سواری جب قلعے کے دروازے میں داخل ہوئی تو ڈیوڑھی میں سے چار گھڑ سوار آگے آگے ہو گئے۔ انہوں نے لمبی شہنائی بجا کر اعلان کیا کہ شہزادی کی سواری آ رہی ہے۔ قلعے کے اندر ایک بازار تھا۔ شہنائی کی آواز سنتے ہی بازار میں ہلچل مچ گئی۔ دیکھتے دیکھتے بازار خالی ہو گیا۔ قدیم روم کے بازاروں میں سے گزرتی ہوئی ہماری سواری شاہی محل میں پہنچ گئی۔ شاہی محل کا ماحول وہی تھا جو میں نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھ رکھا تھا۔

ہر قدم پر مجھے احساس ہوتا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں کیونکہ حقیقت میں میں دو ہزار سال پیچھے کے زمانے میں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ماریانہ ہر قدم پر میرے ساتھ تھی۔ رات کو مجھے شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ ایک عجیب سی بے چینی کی کیفیت تھی جو مجھ پر طاری تھی۔ شاہی مہمان خانے کے شاہانہ بستر پر بھی مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں اس رنگین مگر غیر قدرتی خواب کے جال سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ لیکن لگتا تھا کہ یہ بات میرے اختیار میں نہیں رہی اور میں ماریانہ کی مرضی کے بغیر یہاں سے واپس بیسویں صدی کے وقت میں نہیں جا سکتا۔

میں بستر سے اٹھ کر گیلری میں آ گیا۔ کسی مضبوط بیل کی شاخیں گیلری کی دیوار کے ساتھ اوپر تک چلی گئی تھیں۔ سامنے سڑک کے پار شاہی عمارات میں کہیں کہیں شمع دانوں کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ رات نہ جانے کتنی گزر چکی تھی۔ میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

میں نے وہاں سے فرار کا فیصلہ کیا اور بیل کی موٹی شاخوں کو پکڑ کر نیچے اتر آیا۔ اب میں قلعے کے سنسان بازاروں میں پھرنے لگا۔ کسی جگہ سے پہرے داری آواز آتی تو میں کسی ستون یا مکان کی دیوار کی اوٹ میں چھپ جاتا۔ اسی طرح چلتے چلتے میں قلعے کے دروازے کے قریب آ گیا۔ یہاں رومن سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ میں ایک طرف چھپ کر سوچنے لگا کہ یہاں سے کیسے باہر نکلا جائے۔ یہ لوگ مجھے پکڑ کر موت کے تہہ خانے میں پھینک دیں گے۔ میں رومن محلات کے خفیہ تہہ خانوں کا بہت حال پڑھ چکا تھا۔ ان تہہ خانوں میں جن قیدیوں کو ڈالا جاتا تھا پھر ان کی لاش بھی باہر نہیں آتی تھی۔

مجھے پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی سڑک پر کسی چھکڑے کے چلنے کی آواز آئی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گھاس سے بھرا ہوا ایک چھکڑا قلعے کے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ جب یہ چھکڑا میرے قریب سے گزرا تو میں لپک کر اس پر سوار ہو گیا اور گھاس میں خود کو چھپا دیا۔ چھکڑا قلعے کی ڈیوڑھی میں رک گیا۔ میں نے سپاہیوں کی آوازیں سنیں۔ وہ رومن زبان میں کچھ بول رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ چھکڑے کی تلاشی لے رہے ہیں۔ ایک سپاہی نے گھاس میں نیزہ مارا تو وہ میرے قریب سے ہو کر نیچے اتر گیا۔ میں جلدی سے ایک طرف ہو گیا۔ سپاہی نے مجھے دیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا اسی لمحے مجھے پکڑ لیا گیا۔ میں نے اردو میں، انگریزی میں، پنجابی میں چیخ چیخ کر انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ میں پاکستان کا ٹورسٹ ہوں اور شاہی محل کی شہزادی ماریونہ مجھے وینس سے یہاں لے آئی ہے۔ مگر میری ایک بھی بات ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے فصیل کے پاس لے گئے۔ ایک سپاہی نے مجھے ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ دوسرے نے نیزہ اٹھایا۔ اسے اپنے ہاتھ میں تولا اور پوری طاقت سے میرے سینے میں گھونپ دیا۔ میرے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ اس کے بعد میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں اسی پراسرار حویلی کے دالان میں، جسے ٹورسٹ ہاؤس میں کھڑا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ آہوں والے پل پر کس راستے سے ہو کر جاؤں۔ میرا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ میں جلدی سے واپس مڑا۔ ملاح جا چکا تھا۔ میں وہیں گلی کی نہر کے کنارے پراسرار حویلی کی سیڑھی میں بیٹھ گیا۔ نہر کا پانی پتھر کی سیڑھی سے ٹکرا کر ہچکولے لے رہا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اگر میں کوئی خواب ہی دیکھ رہا تھا تو مجھے اس بھیانک سے نجات مل گئی۔

تھوڑی دیر گزری ہو گی کہ مجھے پانی میں شپ شپ کی آواز سنائی دی۔ میں نے جھک کر گلی کی نہر جہاں مڑتی تھی اس طرف دیکھا ایک کشتی بڑے آرام سے پانی پر بہتی چلی آ رہی تھی۔ جب وہ میرے قریب آئی تو میں نے ملاح کو آواز دی۔

اس نے کشتی کنارے کے ساتھ لگا دی۔ میں کشتی میں بیٹھ گیا۔ کشتی میں صرف ایک سیاح اکٹھا ہو کر ایک طرف سو رہا تھا۔ شاید وہ نشے میں دھت تھا۔ کیونکہ وائن کی ایک خالی بوتل اس کے قریب ہی کشتی میں پڑی تھی۔ ملاح سے میں نے اطالوی میں کہا کہ مجھے پورٹ پر پہنچا دو۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کشتی پورٹ کی طرف ہی جا رہی تھی۔

دور سے ریالٹو پورٹ کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں تو میری جان میں جان آئی۔ سوچنے لگا یہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ میں پر اسرار حویلی کے تاریک دالان میں کھڑے کھڑے کیسے خواب کی دنیا میں پہنچ گیا۔ شاید یہ اس وجہ سے تھا کہ میں ماورائیت پسند ہوں اور مجھے پر اسرار حویلیوں میں رہنے والی خوبصورت عورتوں اور شہزادیوں کی روحوں سے بڑی محبت ہے۔ میری اسی کمزوری یا جذباتیت نے مجھے یہ سب کچھ ایک پل میں دکھا دیا تھا۔ جس وقت میں وینس شہر کے سب سے بڑے جزیرے ریالٹو کی گھاٹ سے باہر وینس کے بازاروں میں آیا تو اس وقت رات کے دو بج رہے تھے مگر بازاروں میں رونق تھی۔ بازار سنسان نہیں تھے۔ اس وقت کوئی بس نہیں چل رہی تھی۔

مجبوراً مجھے ایک ٹیکسی لینی پڑی۔ مجھے یہ احساس ہونا شروع ہو گیا تھا کہ میرے پیسے ختم ہو رہے ہیں اور اب مجھے کسی جگہ کوئی جاب کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ میں ابھی وینس میں مزید کچھ روز ٹھہرنا چاہتا تھا۔ میں نے آہوں والے پل کا معمہ حل کرنے کا خیال دل سے نکال دیا اور اب یہ ارادہ کیا تھا کہ وینس شہر کی نائٹ کلبوں کی آوارہ گردی کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ان کلبوں میں رات کے وقت زندگی کس رنگ میں بسر ہوتی ہے۔

میں فلیٹ پر پہنچا تو سلیمان ابھی نہیں آیا تھا۔ میں صوفے میں گھس کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ حویلی کی پر اسرار رومن شہزادی ماریانہ کا چہرہ بار بار آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ آخر بڑی مشکل سے نیند آئی۔ صبح کوئی دس بجے ہوں گے کہ سلیمان نے مجھے جگا دیا۔ وہ رات کسی عورت کو ساتھ لے آیا تھا جو اس کے بستر میں گھس کر ابھی تک سو رہی تھی۔ سلیمان نے اسے لات مار کر جگایا اور گالی دے کر کہا۔

"چلو چھوڑو دفع ہو جاؤ۔"

عورت بڑبڑائی۔ جھکتی ہوئی بستر سے نکل آئی۔ سلیمان نے بٹوے میں سے کچھ پیسے نکال کر دے دیے۔ وہ چلی گئی تو سلیمان نے میری طرف جھک کر دیکھا، ہنس کر بولا۔

"تم کب سے جاگ رہے ہو رات کب آئے تھے؟ میں تو دو بجے کے بعد آیا تھا، تم سو رہے تھے۔"

میں نے یونہی ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔ "بس جلدی ہی آ گیا تھا۔"

سلیمان کے ساتھ ماریانہ رومن شہزادی والے خواب کے بارے میں بات کرنا بیکار تھا۔ میں نے اس کا بالکل ذکر نہ کیا۔ وہ ناشتہ تیار کر چکا تھا۔ ہم دونوں ناشتہ کرنے لگے۔ میں نے سلیمان سے کہا۔

"دوست! میرے پیسے ختم ہو رہے ہیں۔ میں اس شہر میں کچھ عرصہ قیام کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم مجھے کوئی چھوٹی موٹی جاب دلا دو تو میرے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی آسانی ہو جائے گی۔"

سلیمان سگریٹ کا لمبا کش لگا کر بولا۔

"ایک ترکیب میرے ذہن ...."

اس نے سگریٹ کا کش کھینچ کر پورا دھواں حلق سے نہیں نکالا تھا، بات کرتے کرتے وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں زور سے مسلتے ہوئے سگریٹ بنانے والوں کو گالی دی، رومال میں کھانسا اور آنکھیں ہتھیلیوں سے پونچھتے ہوئے بولا۔

"میں تمہیں کسی بس سٹیشن پر کام دلوا سکتا ہوں مگر وہاں ڈاکے بہت پڑتے ہیں۔ کسینو کے باہر گارڈ کی ڈیوٹی دے سکو گے؟

.........نہیں نہیں تم یہ کام نہیں کر سکو گے۔ اچھا تو پھر میں تمہیں ایک نائٹ کلب میں کام دلوا دیتا ہوں۔ اس کا مالک میرا دوست ہے آج اسی سے بات کرتا ہوں۔"

میں نائٹ کلب کا سن کر بڑا خوش ہوا۔ اگر نائٹ کلب میں مجھے کام مل جائے تو تنخواہ بھی ملے گی اور نائٹ کلب کے مزے بھی اڑاؤں گا۔

میں نے فوراً کہا۔

"ہاں! نائٹ کلب کی جاب ٹھیک رہے گی۔"

سلیمان دیوار کے ساتھ لگے آئینے کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا، بولا۔

"وہاں تمہیں ایک وقت کا کھانا مفت ملے گا اور بونس اور ٹپس کے ساتھ مل کر تین چار سو یورو تنخواہ ہوگی مگر ڈیوٹی بڑی سخت ہے۔ ساری رات تمہیں وہاں گزارنی پڑے گی۔"

میں نے کہا "مجھے منظور ہے۔"

"او کے .... میں آج ہی اپنے دوست سے بات کرتا ہوں۔"

دوسرے روز شام کو سلیمان مجھے وینس کی ایک نائٹ کلب میں لے گیا۔ یہ سمندر سے ہٹ کر ایک گنجان محلے میں تھا۔ سلیمان مجھے کلب کے گلی والے دروازے سے اندر لے گیا۔ اس نے اپنے دوست روبرٹو سے ملایا۔ روبرٹو ایک مضبوط تن و توش کا آدمی تھا جس کی مونچھیں پھولی ہوئی تھیں اور گردن بھینسے کی طرح موٹی تھی۔ سلیمان اس سے میرے بارے میں بات کر چکا تھا۔ روبرٹو نے مجھے اوپر سے نیچے تک

دیکھا اور اطالوی میں بولا۔

"ارے۔۔۔۔۔۔۔ ابھی سے کام شروع کر دو۔"

◆ ◆ ◆

وینس کی راتیں

پارما نائٹ کلب

نائٹ کلب کا نام پارما نائٹ کلب تھا۔

سلیمان مجھے روبرٹو کے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی رابرٹو نے مجھے مختلف بوتلوں سے بھرا ہوا ایک گتے کا بکس پکڑایا اور کہا ------ اسے کونے والے گودام میں رکھ آؤ۔ میں بار روم کے عقبی کمرے میں تھا۔ یہاں روبرٹو مختلف مشروبات کی بوتلوں کو لکڑی کے بکسوں سے نکال نکال کر شیلف میں لگا رہا تھا۔ میں گتے کا ڈبہ لے کر تنگ راہداری سے گزرتا ہوا کونے والے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں پہلے ہی سے کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ شیلف میں سینکڑوں بوتلیں لگی تھیں۔ میں نے ڈبہ فرش پر دوسرے ڈبوں کے اوپر رکھا اور واپس رابرٹو کے پاس آ گیا۔ اس نے ایک الماری کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”اس میں سے وردی نکال کر پہن لو اور اپنے کپڑے وہیں رکھ دو۔“

میں اس کا منہ دیکھنے لگا۔ اس کی تیز تیز اطالوی زبان میری سمجھ سے باہر تھی۔ بس الماری کپڑے وردی ہی سمجھ سکا تھا۔ رابرٹو نے مجھے گالی دے کر کہا۔

”میرا منہ کیا تکتے ہو جاؤ۔“

میں جلدی سے الماری کی طرف گیا۔ اس کے اندر سرخ جیکٹیں سرخ پتلونیں اور سرخ مخمل کی ٹوپیاں ہینگروں سے لٹک رہی تھیں۔ میں نے ایک ٹوپی ایک پتلون ایک جیکٹ اتاری اور باتھ روم میں جا کر اپنے کپڑے اتار کر نائٹ کلب کی وردی پہن لی۔ اپنے کپڑے الماری میں رکھ کر رابرٹو کے پاس آیا تو وہ ہنس کر اپنے گندے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

”اب ٹھیک ہے۔“

فوراً اس نے شیشے کی ایک گول ٹرے میں وہسکی کی ایک بوتل اور دو خالی جام اوندھے کر کے رکھے اور کہا۔

”یہ بار روم میں میز نمبر ۳۴ کو جا کر دے دو۔ یہ میز ڈانسنگ فلور کے پاس ہے۔ جاؤ جاؤ“

اس نے فوجی افسر کی طرح حکم دیتے ہوئے کہا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ بار روم کا کون سا دروازہ ہے۔ جب میں نے رابرٹو سے بار روم

کے دروازے کا پوچھا تو وہ گالی دے کر چلا گیا۔

"دو سو چھٹے ہے۔۔۔۔۔۔۔دو۔۔۔۔۔۔۔جاؤ۔"

بار روم تمباکو اور مختلف شرابوں کی بو سے بھرا ہوا تھا۔ فضا بوجھل اور دھندلی تھی۔ میزوں پر مدھم لائٹیں روشن تھیں۔ ڈانسنگ فلور پر پانچ چھ عورتیں نیم عریاں کاسٹیوم میں میوزک کے شور میں اچھل کود رہی تھیں۔ ایک طرف میزیں لگی تھیں جہاں جوا ہو رہا تھا۔ لوگ خوشی کے عالم میں تھے اور ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ ڈانسنگ فلور کے قریب جو لوگ بیٹھے تھے وہ رقص کرتی نیم عریاں لڑکیوں پر آوازے بھی کس رہے تھے اور ان کی طرف کبھی کبھی دس پانچ کا نوٹ بھی اچھال دیتے تھے۔ ملٹی کا ٹرے میرے ہاتھ میں تھا۔ میں میزوں کے نمبر پڑھنے لگا۔ ایک باوردی بار ٹینڈر یا میری طرح کے بیرے نے مجھے نمبر پڑھتے دیکھا تو لپک کر میرے پاس آ گیا۔

"تم نئے آئے ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے پوچھا۔

"نمبر کون سا ہے؟"

"چونتیس" میں نے فوراً جواب دیا۔

اس نے ایک میز کی طرف اشارہ کیا۔ میں دوسری میزوں کے درمیان سے گزر کر 34 نمبر میز پر پہنچ گیا۔ یہ میز ڈانسنگ فلور کے قریب ہی تھی۔ میز پر دو کسرتی بدن والے باکسر ٹائپ کے آدمی بیٹھے بڑے غور سے فلور پر رقص کرتی عورتوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے جھک کر مشروب کی بوتل اور دو جام میز پر رکھے تو ایک آدمی نے دس روپے کا نوٹ جیب سے نکال کر میری خالی ٹرے میں رکھ دیا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور واپس مڑا۔ یہ دونوں آدمی مجھے شکل ہی سے دہشت گرد لگے۔ کہیں یہ نائٹ کلب میں بم لگانے تو نہیں آئے ہوں۔ اگر میں انہیں پکڑ دوں تو نائٹ کلب میں نہ صرف میری نوکری پکی ہو جائے گی بلکہ ہو سکتا ہے میری راتوں رات ترقی بھی ہو جائے۔ یہ سوچ کر میں ایک طرف اندھیرے میں ستون کے پاس کھڑا ہو گیا اور ان دونوں آدمیوں کی نقل و حرکت غور سے دیکھنے لگا۔

ڈانسر لڑکی۔۔۔۔۔۔۔سنالی

فلور پر ڈانس کرتی ہوئی ایک سنہرے بالوں والی سڈول بدن کی خوبصورت لڑکی فلور کے کنارے آئی تو ان دونوں میں سے ایک آدمی نے اسے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ڈانسر لڑکی فلور سے اتری اور قیامت خیز چال چلتی میز کے قریب آ گئی۔ اس آدمی نے جیب سے ایک نوٹ نکال کر اس کے گریبان میں ڈال دیا۔ اور پھر بازو سے کھینچ کر اسے اپنے قریب کیا اور کان میں کچھ کہا۔ سنہرے بالوں والی لڑکی کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے نوٹ میز پر پھینکا اور تیزی سے واپس فلور پر جا کر رقص کرنے لگی۔

دونوں نے وہیں میز پر مشروب کی رقم رکھی اور بار روم کے عقبی گیٹ سے باہر نکل گئے۔ وہاں اتنا شور مچا ہوا تھا اتنا ہنگامہ تھا کہ اس چھوٹے سے ڈرامے کو کسی نے نہ دیکھا۔ اگر دیکھا بھی ہوگا تو وہاں کسی کو اس طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں تھی۔ اس قسم کے واقعات نائٹ کلبوں کا معمول ہوتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس واقعے کے بعد ڈانس کرتی سنہرے بالوں والی لڑکی کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ اور وہ اس جوش و خروش سے رقص نہیں کر رہی تھی۔ کسی نے میرے کندھے پر پیچھے سے ہاتھ مارا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ چیف بیرا غصیلی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ''اپنا کام کرو جاؤ۔''

میں جلدی سے بار روم کے پیچھے رابرٹو کے پاس آ گیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ رابرٹو کو بتا دوں۔ پھر خیال آیا کہ یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ رابرٹو میرا مذاق اڑائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے ڈانٹ بھی دے کہ گاہکوں کی نقل و حرکت پر نظر کیوں رکھتے ہو۔

نائٹ کلبوں میں میری ڈیوٹی شام کو شروع ہوئی اور رات کو ایک بجے ختم ہو گئی۔ اس دوران میں نے وہیں کچن میں رات کا کھانا بھی کھایا۔ جب میں ڈیوٹی سے آف ہو کر اپنے کپڑے چینج کرنے جانے لگا تو رابرٹو نے مجھے آواز دی۔

''اے۔۔۔۔۔۔۔۔ ادھر آؤ۔''

اس نے میز کی دراز میں سے پچاس لیرے کا نوٹ نکال کر میری ہتھیلی پر رکھ دیا اور بولا۔

''اسے خرچ کرو تمہاری تنخواہ میں سے کٹ جائے گا۔''

میں بڑا خوش ہوا اور کلوک روم کی طرف چلا گیا۔ کیونکہ مجھے بتایا گیا تھا کہ ڈیوٹی سے فارغ ہونے کے بعد گلی کے عقبی دروازے سے نہیں بلکہ کلوک روم والے دروازے سے باہر جاؤ گے۔ سارے ملازم اسی راستے سے باہر جاتے ہیں۔

کلوک روم میں مدھم بلب روشن تھا۔ دیوار کے ساتھ لوہے کی اونچی الماری یہاں سے وہاں تک چلی گئی تھی۔ اس الماری میں مختلف خانے بنے ہوئے تھے۔ میں کلوک روم میں داخل ہوا تو وہاں پہلے سے تین ڈانسر لڑکیاں لوہے کی الماری کے خانوں میں سے اپنے کپڑے نکال رہی تھیں۔ ان میں وہ سنہرے بالوں والی ڈانسر لڑکی بھی تھی جس کو ڈانسنگ فلور پر میکسیکن قسم کے آدمی نے نوٹ دے کر کان میں کچھ کہا تھا اور لڑکی کا رنگ اڑ گیا تھا۔ باقی دونوں لڑکیاں آپس میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ مگر سنہرے بالوں والی لڑکی خاموش تھی۔ میں اس کے قریب سے گزرا تو اس کے بالوں کا پلاسٹک کا پن نیچے گر پڑا۔ میں نے جلدی سے اٹھا کر اسے پکڑا دیا تو وہ میری طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرائی اور میرا شکریہ ادا کر کے الماری کو تالا لگانے لگی۔

کلوک روم کے دروازے کے باہر ایک گلی تھی جس میں سرخ رنگ کا ایک بلب بڑی خطرناک قسم کی روشنی دے رہا تھا۔ گلی آگے جا کر

سڑک پر نکل آئی۔ یہ سڑک میری دیکھی بھالی تھی۔ رابرٹو اور سیمان نے بھی مجھے بتا دیا تھا کہ رات سوا دو بجے یہاں سے ایک بس جاتی ہے جو سینٹ پال کے علاقے سے گزرتی ہے۔ مجھے سینٹ پال کے علاقے میں ہی جانا تھا۔ رابرٹو نے کہا تھا کہ یہ بس نہ پکڑ سکے تو تمہیں ٹیکسی پر جانا پڑے گا کیونکہ اس کے بعد بس صبح پانچ بجے آتی ہے۔ میں بس سٹاپ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ لیمپ پوسٹ کی روشنیاں کافی فاصلے پر تھیں۔ بس سٹاپ پر کوئی روشنی نہیں تھی۔ میں شیڈ کے نیچے خالی بنچ پر بیٹھ گیا۔ ابھی روم میں سردیوں کا موسم شروع نہیں ہوا تھا مگر رات کو کافی خنکی ہو جاتی تھی۔ میں بار روم میں کام کرتے کرتے کافی تھک گیا تھا۔ کیونکہ وہاں مجھے بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ مجھے کسی نے نہیں بتایا تھا کہ رات دو بجے کے بعد جو بس آتی ہے اسے ہاتھ سے روکنے کا اشارہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر ہاتھ نہ دو تو وہ نکل جاتی ہے۔

میں نے بس سٹاپ کی شیشے کی دیوار میں سے بس کی روشنیاں دیکھیں۔ یہ بس بغلی گلی میں سے چڑھائی چڑھ کر سڑک پر سوار ہوئی تھی۔ اس کے اندر دھیمی دھیمی روشنی میں سواریاں نظر آ رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ بس سٹاپ پر آ کر ضرور رکے گی پھر میں اس میں سوار ہو جاؤں گا۔ مگر چونکہ میں نے شیڈ سے نکل کر اسے اشارہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی اس لیے بس سٹاپ کے سامنے سے تیزی سے آگے نکل گئی۔ میں گھبرا کر اٹھا اور حسرت بھری نظروں سے بس کو جاتے دیکھنے لگا۔ دل میں بس ڈرائیور کو دو چار گالیاں بھی دیں۔ اگرچہ مجھے نائٹ کلب سے پچاس لیرے بطور ایڈوانس مل چکے تھے مگر میں ٹیکسی کا اتنا زیادہ کرایہ خرچ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اب مجبوری تھی۔ میں سڑک پر ٹیکسی کی سرخ روشنی تلاش کرنے لگا۔ دس پندرہ منٹ گزر گئے کوئی ٹیکسی نہ آئی۔ میں فٹ پاتھ پر چل پڑا۔ اتنا مجھے اندازہ تھا کہ آگے جا کر ایک گلی آتی ہے جو موڑ مڑنے کے بعد بڑی سڑک سے جا کر مل جاتی ہے۔ سیمان اپنی ٹیکسی اسی گلی میں سے نکالا کرتا تھا۔ تین بلاک چھوڑ کر وہ گلی آ گئی۔ میں گلی میں ہو گیا۔ یہ گلی کوئی ہمارے لاہور گوجرانوالہ یا لالہ موسیٰ کی طرح کی گلی نہیں تھی۔ بس یوں سمجھ لیں کہ لاہور کی بیڈن روڈ جتنی چوڑی پختہ سڑک تھی۔ دونوں جانب پختہ مکانات تھے ان کے بیچ میں راستے بنے ہوئے تھے۔ روشنی اس گلی میں بھی کم تھی۔ مجھے اپنے پیچھے سے کسی گاڑی کی آواز آئی۔ پلٹ کر دیکھا تو یہ خالی ٹیکسی تھی۔ کیونکہ اس کے اوپر سرخ روشنی جل رہی تھی۔ میں نے اسے ہاتھ دیا تو ٹیکسی میرے قریب آ کر رک گئی۔ اسے ایک بوڑھا اطالوی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ میں نے اسے اطالوی زبان میں کہا۔

”مجھے سینٹ پال جانا ہے۔“

بوڑھے ٹیکسی ڈرائیور نے سگریٹ سلگا کر کش لگایا اور ہنس کر کہا۔

”تم جہاں کہو گے میں تمہیں لے جاؤں گا تمہاری اطالوی زبان بہت بری ہے۔۔۔۔۔۔۔ کیا تم الجزائر کے رہنے والے ہو؟“

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور پچھلے دروازے کی طرف بڑھا۔ ابھی میں نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ کسی عورت نے چلا کر کہا۔ ”گاڑی

رکو گاڑی روکو۔"

دوسرے لمحے سامنے والے مکانوں کے درمیان جو اندھیرا راستہ تھا وہاں سے ایک لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اور ٹیکسی کا دوسری جانب کا دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر سمٹ کر چھپ گئی۔

"خدا کے لیے گاڑی لے چلو وہ مجھے مار ڈالیں گے۔"

بوڑھے ڈرائیور نے ڈرائیونگ وہیل پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"نکل جاؤ میری گاڑی میں سے .... میں بدمعاش عورتوں کو نہیں بٹھایا کرتا۔"

میں نے جھک کر گاڑی کے اندر دیکھا۔ یہ وہی سنہری بالوں والی لڑکی تھی جو کچھ دیر پہلے نائٹ کلب کے فلور پر ڈانس کر رہی تھی، جس کا پن میں نے اٹھا کر دیا تھا اور اس نے مسکرا کر میرا شکریہ ادا کیا تھا۔ اب اس نے بھی پہچان لیا۔ اس کا رنگ سفید پڑ چکا تھا اور خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"خدا کے لیے مجھے یہاں سے لے چلو، جلدی کرو، وہ لوگ........"

میں جلدی سے اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور دروازہ بند کر کے ڈرائیور سے کہا

"گاڑی بھگاؤ، میں تمہیں دوگنا کرایہ دوں گا۔"

اتنے میں مکانوں کی طرف سے فائر کی آواز آئی۔ لڑکی کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ دو آدمی تیزی سے بھاگتے ٹیکسی کی طرف آ رہے تھے۔ ڈرائیور نے ایکسیلیٹر دبا دیا۔ انجن پہلے ہی سٹارٹ تھا۔ ٹائروں کی چیخ بلند ہوئی اور گاڑی تیزی سے آگے نکل گئی۔ پیچھے سے پستول کے دو فائر ہوئے مگر گاڑی کو کوئی گولی نہ لگی۔ میں نے ڈانسر لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے تسلی دی۔ اس کا ہاتھ سرد تھا اور کانپ رہا تھا۔

ٹیکسی گلی میں سے نکل کر بڑی سڑک پر آئی تو ڈرائیور نے اس کی سپیڈ تیز کر دی۔ جب ہم خطرناک علاقے سے کافی دور نکل آئے تو اس بوڑھے ڈرائیور نے گردن پیچھے گھما کر نظریں سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"بہتر ہے تم لوگ اگلے چوک میں اتر جاؤ، وہاں تمہیں دوسری ٹیکسی مل جائے گی۔ میں تھانہ کچہری کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

میں نے ڈرائیور کو مزید پیسوں کا لالچ دیا مگر اس نے اگلے چوک میں جا کر ٹیکسی روک دی اور بولا۔

"اگر تم نہیں اترو گے تو میں پولیس کو بلاتا ہوں۔"

لڑکی اب کسی حد تک اپنے ہوش و حواس میں تھی مگر وہ بدستور گھبرائی ہوئی تھی اور ٹیکسی سے نکلنے کے بعد بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی۔

ڈرائیور ٹیکسی لے کر ریورس کر کے نکل گیا۔ سنسان سڑک پر ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔ لڑکی سڑک پر اترنے کے بعد زیادہ گھبرا گئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون لوگ تھے اور اس کے پیچھے کیوں لگے ہیں۔ وہ بار بار مڑ کر پیچھے دیکھتی۔ پھر میرا ہاتھ تھام کر منتیں کرنے لگی۔

”خدا کے لیے مجھے یہاں سے لے چلو۔۔۔۔۔۔۔۔ اف کیا کروں۔۔۔۔۔۔۔۔ کوئی ٹیکسی نہیں آئی۔“

اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ خوش قسمتی سے ایک خالی ٹیکسی سڑک پر سے گزری۔ لڑکی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر چیخ کر ”ٹیکسی ٹیکسی“ کی آوازیں دیں۔ ٹیکسی سڑک کی دوسری جانب سے گھوم کر ہمارے پاس آ گئی۔ وہ جلدی سے پچھلی سیٹ پر جھک کر بیٹھ گئی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

”سینٹ پال چلو۔“

ٹیکسی چل پڑی۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔

”تمہیں جہاں جانا ہے میں تمہیں وہاں اتار دیتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔ تم کہاں رہتی ہو؟“

لڑکی نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اس کے ٹھنڈے ہاتھ ابھی تک کپکپا رہے تھے۔ لگتا تھا کہ کوئی بہت خطرناک گینگ اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ دوڑتی ہوئی ٹیکسی میں سٹریٹ لیمپ کی روشنی پڑتی تو مجھے اس کا قابل رحم چہرہ جو اچھا بھلا خوبصورت تھا نظر آ جاتا۔ اس نے ملتجی لہجے میں کہا۔

”میں کون ہوں، کہاں رہتی ہوں، یہ لوگ کون تھے، یہ ساری باتیں میں تمہیں نہیں بتا سکتی۔ پلیز مجھے رات کی کسی جگہ چھپا لو۔ تم نائٹ کلب میں بھی مجھے ملے تھے۔۔۔۔۔۔۔ تم وہی ہو نا؟“

”ہاں، میں نے آج ہی نائٹ کلب میں ویٹر کی ڈیوٹی جوائن کی ہے۔ میں نے تمہیں فلور پر ڈانس کرتے بھی دیکھا تھا۔“

لڑکی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بڑی اپنائیت سے دبایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

”پلیز مجھے رات کی پناہ دے دو۔ میں تمہارا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔“

اس کا مطلب تھا کہ اب مجھے اس ڈانسر لڑکی کو لے کر سلیمان کے فلیٹ میں جانا تھا۔ میرے پاس کوئی دوسری جگہ نہیں تھی۔ لڑکی کی حالت ایسی تھی کہ میں اسے چھوڑ دینا خلاف انسانیت سمجھتا تھا اور پھر وہ میری نائٹ کلب کی کولیگ بھی تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”فکر نہ کرو تم میرے ساتھ چلو گی۔“

لڑکی نے اپنا سنہری بالوں والا سر میرے ساتھ لگا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ میں نے دل میں ان [illegible] کو

بڑی گالیاں دیں جو ایک معصوم لڑکی کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت میں خود کو ہیرو محسوس کر رہا تھا۔ لیکن چونکہ مجھے پہلے ہی تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ دوبئی میں اٹلی کے گھناؤنے معاشرے اور وہاں کے جرائم پیشہ گروہوں کی مذموم سرگرمیوں سے کافی حد تک واقف ہو گیا تھا اس لیے دل میں یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ اسے صبح سویرے سلیمان کے فلیٹ سے رخصت کر دوں گا اور پھر کبھی اس سے واسطہ سروکار نہیں رکھوں گا۔ نائٹ کلب میں بھی جب یہ ڈانس کر رہی ہوگی یا کلب میں آتی جاتی ملے گی تو میں سوائے ہیلو ہیلو کرنے کے اس سے کوئی بات نہیں کروں گا۔

سلیمان نے ایک چابی مجھے دے رکھی تھی۔ ٹیکسی سینٹ پال کے علاقے میں داخل ہوئی تو میں نے اسے سلیمان کے فلیٹ والی گلی کے باہر ہی رکوا دیا۔ لڑکی کو لے کر میں فلیٹ کی طرف بڑھا۔ اس نے موسم بہار کا پھولدار فراک پہن رکھا تھا جسم پر اونی جرسی تھی۔ اس کے بالوں اور لباس میں سے سینٹ کی خوشبو آ رہی تھی۔ لڑکی میرے ساتھ لگ کر چل رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ کیا یہ لڑکی ڈانسنگ کے پیشے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایسی لڑکیاں تو عام طور پر بڑی دلیر ہوتی ہیں مگر یہ تو بے حد کمزور دل کی ہے۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ عورت چاہے وینس کی ہو چاہے ماسکو کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب برا وقت اس پر آ جائے تو وہ بڑی ہی کمزور ہوتی ہے۔

وہ میرے ساتھ بالکل خاموش چل رہی تھی۔ سلیمان کے فلیٹ والی عمارت کا گیٹ کھلا تھا۔ یہ گیٹ رات دن کھلا ہی رہتا تھا۔ میں دوسری منزل پر آ گیا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ پھر خیال آیا کہ چابی تو میری جیب میں ہے۔ میں چابی لگا رہا تھا لڑکی نے پوچھا۔

"تم یہاں اکیلے ہی رہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"نہیں ایک دوست کے ساتھ رہتا ہوں۔ وہ ٹیکسی چلاتا ہے۔ کبھی رات کو آ جاتا ہے کبھی نہیں آتا۔ ابھی تک وہ نہیں آیا۔"

میں نے بتی جلا کر کمرے کو خالی دیکھ کر کہا۔ لڑکی پرس گود میں لے کر سلیمان کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس نے پرس میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگایا اور اطمینان کا سانس لے کر کہنے لگی۔

"بس میں ایک سگریٹ پی کر لیٹ جاؤں گی۔ دن نکلتے ہی چلی جاؤں گی۔"

اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا ہاتھ اب گرم تھا اور اس کی کپکپاہٹ بھی ختم ہو چکی تھی۔

"میں تمہارے احسان کا بدلہ دینا چاہتی ہوں۔"

میں نے اس کے ہاتھ کو آہستہ سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں تمہارا نام کیا ہے؟"

میں نے اسے اپنا نام بتایا۔ اس نے اپنی مخروطی انگلی سے اپنے سرخ ہونٹوں پر سے سنہری بال پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ثنائی۔۔۔۔۔۔ میرا نام ثنائی ہے۔ مجھے پیراماؤنٹ کلب میں آئے دو مہینے ہی ہوئے ہیں۔ پہلے میں پیرس کلب میں ڈانس کیا کرتی تھی۔"

"تمہارے لیے کافی بناؤں؟"

"نہیں پلیز۔۔۔۔۔۔ جب تک میں سگریٹ پیتی ہوں، تم میرے پاس ہی بیٹھے رہو مجھے ابھی تک ڈر لگ رہا ہے۔"

اس نے ایک جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

سلیمان کا فلیٹ رات کے وقت بھی ویسا ہی گندا تھا جیسے دن کے وقت گندا ہوتا تھا۔ ثنائی اس ماحول میں بہار کا پھول لگ رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ثنائی واقعی بہت خوبصورت تھی۔ شاید یہ وہی سنہری بالوں والی لڑکی تھی جس سے محبت کرنے کا عزم لے کر میں پاکستان سے جانب اطالیہ چلا تھا۔ مگر اب میں بڑا محتاط ہو گیا ہوا تھا اور میں نے اس قسم کی باتوں سے توبہ بھی کی ہوئی تھی۔

رات کے تین بجنے والے تھے۔ میں نے باقی رات سو کر گزارنے کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔ چنانچہ میں نے ثنائی سے کہا۔ "میں اپنے لیے کافی بناتا ہوں؟"

ثنائی نے مجھے بالکل نہ روکا۔ آگے سے کوئی بات بھی نہ کی۔ میں نے گیس کے چولہے پر پانی کی کیتلی رکھ دی اور سگریٹ سلگا کر وہیں بوسیدہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ ثنائی انتہائی محویت کے عالم میں فرش کی طرف تک رہی تھی۔ سگریٹ اس کی انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اسے نہ بلایا اور اٹھ کر چولہے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میں خود بھی اپنے آپ کو اس قسم کے معاملات میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک لڑکی کو مصیبت کے وقت پناہ کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے پناہ دے دی تھی۔ بس اس سے آگے میں اس نا آسرا لڑکی ثنائی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ میں کافی مگ میں ڈال رہا تھا کہ پیچھے سے ثنائی نے پوچھا۔

"تمہارا باتھ روم وہ سامنے ہے کیا؟"

دراصل باتھ روم کے دروازے پر سلیمان نے جاپانی اور امریکن ایکٹرسوں کی اتنی تصویریں اخباروں، رسالوں سے پھاڑ کر چپکائی ہوئی تھیں کہ دروازے کا صرف ہینڈل ہی نظر آتا تھا۔ میں نے کہا۔

"ہاں یہی ہے۔"

ثنائی باتھ روم میں چلی گئی۔

میں کافی کا مگ لے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سلیمان ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ کسی وقت آ سکتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ اب وہ اسی وقت آئے جب ثنائی وہاں سے جا چکی ہو۔ اگرچہ وہاں کے معاشرے کے ماحول کے مطابق فلیٹ میں کسی عورت کو لے آنا کوئی ایسی ویسی بات نہیں تھی،

پھر بھی میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ سلیمان کو پتہ چلے کہ میرے ساتھ رات کوئی لڑکی بھی تھی۔

ثنائی باتھ روم سے باہر نکلی تو اس نے بالوں میں کنگھی کی ہوئی تھی، اور وہ ٹشو پیپر سے اپنے ہونٹوں کی سرخی اتار رہی تھی۔ اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"میں یہاں سو جاؤں گی، تھوڑی سی رات رہ گئی ہے، تم پلنگ پر سو جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "نہیں ثنائی، تم پلنگ پر سوؤ، میں صوفے پر ہی سو یا کرتا ہوں۔"

ثنائی نے ایک عجیب سی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ میں کرسی پر خاموش بیٹھا کافی پیتا رہا اور اسے تکتا رہا۔ طوفان میرے اندر بھی چٹانوں سے ٹکرا رہا تھا مگر میں چپ تھا۔ میں نے توبہ کی ہوئی تھی اور میں اپنی توبہ پر قائم رہنا چاہتا تھا۔ ثنائی آگے بڑھ کر پلنگ پر جا کر لیٹ گئی۔ اس نے کمبل اوپر کر لیا۔

"بتی بجھا دوں؟" میں نے پوچھا۔

"جیسے تمہاری مرضی" ثنائی نے خواب ایسے لہجے میں کہا۔

میں نے بتی گل نہ کی۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے بتی بجھا دی تو اندھیرے میں شیطان مجھ پر حملہ کر دے گا بلکہ میں خود شیطان بن کر حملہ کر دوں گا۔ مگر میں نے توبہ کی ہوئی تھی۔ میں نے بتی جلتی رہنے دی۔ کافی کا خالی مگ ایک طرف رکھ کر میں بھی صوفے میں کمبل لے کر دھنس گیا۔ ثنائی کا منہ دیوار کی طرف تھا۔ اس کے سنہری بال کمبل سے باہر سونے کے تاروں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ میں نے نظریں ہٹا لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔

میری یہ حالت تھی کہ اونگھنے لگتا، کبھی آنکھ لگ جاتی اور کبھی آنکھ کھل جاتی۔ ثنائی اسی طرح دیوار کی طرف منہ کیے لیٹی تھی۔ شاید وہ سو گئی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اونگھنے لگا۔ پھر مجھے واقعی نیند آ گئی اور میں سو گیا۔ آنکھ کھلی تو کھڑکی میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں نے پلنگ کی طرف دیکھا۔ ثنائی جا چکی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بلا ٹل گئی۔

باتھ روم میں جا کر میں نے منہ ہاتھ دھویا اور باہر آ کر کافی بنانے لگا۔ گلی میں عورتوں اور بچوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر دروازے میں چابی لگی اور سلیمان اندر آ گیا۔ وہ سخت تھکا ہوا تھا۔ آتے ہی اس نے جیکٹ اتار کر پھینکی اور پلنگ پر اپنے آپ کو گرا دیا۔

"ساری رات غارت ہو گئی۔ صرف دو تھوڑے فاصلے کی سواریاں ملی ہیں۔"

پھر یک دم چونک کر اٹھ بیٹھا اور کمبل سونگھتے ہوئے بولا۔ "یہاں کوئی عورت سوئی تھی؟"

میں خاموش رہا۔ سلیمان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"شاباش! اب تم وینس شہر کو صحیح سمجھ سکو گے۔ اچھا بتاؤ وہ کون تھی ــــــ کوئی گرل فرینڈ بھی تو بڑی اچھی بات ہے۔ طوائفوں کے چکر میں نہ پڑنا۔ ایسی بیماری لگے گی کہ ساری عمر روتے رہو گے۔"

میں کافی لے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں مسکرا رہا تھا۔ سلیمان نے سگریٹ سلگا لیا تھا۔ کہنے لگا۔

"دوست! یہ بتاؤ نائٹ کلب کی پہلی رات کیسی رہی۔ ــــــ جاب پسند آئی؟"

میں نے کہا۔

"ماریو نے مجھے پچاس لیرے ایڈوانس بھی دیئے ہیں۔ اچھی جاب ہے مجھے پسند ہے۔"

"بس مل گئی تھی واپسی پر؟"

مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ اسے ہاتھ کا اشارہ کرنا ہے وہ نکل گئی۔ میں تو ٹیکسی پر آیا ہوں۔ بیس لیرے خرچ ہو گئے۔

سلیمان نے ٹیکسی ڈرائیور کو بڑی گندی گالی دی۔

"ارے وہاں سے یہاں تک کا کرایہ دس لیرے سے کبھی زیادہ نہیں بنتا۔ خیر کوئی بات نہیں اب تم بس کو ہاتھ ضرور دیا کرو۔"

وہ اٹھ کر باتھ روم جاتے ہوئے بولا۔

"دوست! میرا ناشتہ نہ بنانا۔ میں ایئرپورٹ سے ناشتہ کر کے آ رہا ہوں۔ بس اب پلنگ پر گر کر درخت کی طرح سو جاؤں گا۔"

میرے دوست سلیمان نے اپنے آپ کو پلنگ پر گرا دیا اور تھوڑی دیر بعد وہ خراٹے لے رہا تھا۔ میری بھی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ سنہرے بالوں والی مصیبت زدہ لڑکی حنان کا خیال ضرور ذہن کو پراگندہ کر رہا تھا مگر آخر کار میں بھی سو گیا۔

توبہ توڑ دی

رات کو میں اپنی ڈیوٹی پر پارہ کلب پہنچ گیا۔ کلب میں بڑی رونق تھی۔ ہال کمرے کی سلاٹ مشینیں بھی چل رہی تھیں۔ جوا ہو رہا تھا۔ ڈانسنگ فلور پر نیم عریاں کاسٹیوم پہنے لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔ مجھے ان میں حنان کہیں نظر نہ آئی۔ میرا خیال بار بار اس کی طرف جا رہا تھا۔ جانے وہ کہاں ہو گی کس حال میں ہو گی۔ میں اس کی مصیبت پر پریشان نہیں تھا۔ جس سوسائٹی میں وہ رہ رہی تھی یہ اس کا تقاضا تھا کہ حنان کسی نہ کسی مشکل میں پھنس کر رہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ کلبوں میں راتوں کو نیم عریاں اور عریاں ڈانس کرنے والی لڑکیاں بہت جلد کسی نہ کسی مافیا کے جال میں پھنس جاتی ہیں اور مافیا کے ارکان اپنے گھناؤنے اور مجرمانہ مقاصد کے لیے ان لڑکیوں کو استعمال کرتے رہتے ہیں۔ ان لڑکیوں کا کردار نیم طوائفوں والا ہوتا ہے اور انہوں نے بھی کچھ دولت کے لالچ میں اور کچھ موت کے خوف سے اپنے آپ کو مافیا کے حوالے کر دیا ہوتا ہے۔ مجھے حنان کی مصیبت کی بجائے اس کے انداز دلربائی نے اس کے قریب کر دیا تھا۔ آپ اسے میری کمزوری

کہہ لیں چاہے میرا ارتکاب گناہ کہہ لیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں اس سنہری بالوں والی نیم ترک اطالوی کلب ڈانسر کے دام الفت میں پھنس چکا تھا۔ میری توبہ کو ستانی نے توڑ دیا تھا۔

مشروبات کا ٹرے ہاتھ میں لیے میں میزوں کے گرد چکر لگا رہا تھا اور ستانی کا خیال اس کی حسین صورت اس کی لمبی سنہری زلفیں اور اس کا گرم جوشی کے ساتھ میرے قریب ہو کر سرگوشی میں بات کرنے کا انداز میرے اعصاب کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ میں بار بار اس کے خیال کو دل سے نکالتا۔۔۔۔۔۔۔۔ سے جھٹکتا تو پھر کرتا اور بار بار ستانی کا خوبصورت چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا اور میری توبہ ٹوٹ جاتی۔ میرا وجود جیسے چکی کے دو پاٹوں میں پس رہا تھا۔ کبھی مجھے جنت کی ہوا آتی اور کبھی دوزخ کے شعلے مجھے اپنے چہرے کے بالکل قریب محسوس ہوتے اور میں زور کر ستانی کا خیال دل سے نکال دیتا۔

فلور پر ڈانس کرتی لڑکیوں میں سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک ایک لڑکی فلور کے پیچھے گرے ہوئے پردے کے پیچھے چلی جاتی تھی اور اس کی جگہ دوسری لڑکی آ جاتی تھی۔ کلب کی فضا سگریٹ کے دھوئیں اور مشروبات کی بو سے بوجھل ہو رہی تھی مگر اب میں اس فضا کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔

میری ڈیوٹی رابرٹو نے ان میزوں پر لگائی تھی جو ڈانسنگ فلور کے گرد نیم دائرے کی شکل میں بچھی ہوئی تھیں۔ ان میزوں پر زندگی کے ہر طبقے کے اوباش لوگ بیٹھے مشروبات پی رہے تھے اور ڈانس کرتی لڑکیوں پر فقرے بھی کس رہے تھے۔ وہ مجھ پر بھی کبھی کبھی پانچ دس پیسو کا نوٹ بھی اچھال دیتے تھے۔ میرا کام یہ تھا کہ ان میزوں پر کوئی گلاس خالی ہو تو اسے فوراً وائن یا وسکی سے بھر دوں اور ساتھ ہی حساب بھی لکھتا جاؤں کہ فلاں میز پر کتنے پیگ دیے گئے ہیں۔ قدرتی طور پر میری نگاہ ڈانس کرتی نیم عریاں لڑکیوں کی طرف بھی اٹھ جاتی تھی۔ ان کے سرخ و سفید بدن کلب کی نیلی پیلی اور سرخ روشنیوں میں شعلوں کی طرح لگ رہے تھے۔ کلب کے باہر وینس کی رات بے حد سرد تھی مگر کلب کے اندر کی فضا گرم تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ جب بھی میری نگاہ ڈانسنگ فلور کی طرف جاتی ہے تو ایک نیگرو لڑکی مجھے گھور کر دیکھتی ہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے کوئی اشارہ کرتی ہے۔ پہلے تو میں نے کوئی خیال نہ کیا لیکن ایک دفعہ جب میں فلور کے بالکل ساتھ لگی میز پر گلاس میں وائن ڈال رہا تھا تو چوڑے نقشوں والی سانولی نیگرو لڑکی رقص کرتے کرتے میرے قریب آ گئی اور ہیلو کہا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میز کے گرد بیٹھے ہوئے گاہک نیم مدہوش تھے۔ نیگرو لڑکی نے مجھے اشارہ کیا کہ پردے کے پیچھے آؤ۔ میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔

یہ مجھے کیوں بلا رہی ہے؟

مجھے خیال آیا شاید میں اسے پسند آ گیا ہوں اور وہ پردے کے پیچھے ڈریسنگ روم میں بلا کر مجھ سے اظہارِ محبت کرے گی۔ یورپ کی اور خاص طور پر اطالیہ کی اس قماش کی لڑکیوں کو اگر کوئی مرد پسند آ جائے تو اس سے بڑی بے باکی سے محبت کا اظہار کرتی ہیں اور ان پر زبردست خود سپردگی کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور کوئی مردِ طریقت ہی ان کی ترغیبات سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ اپنے بارے میں مجھے علم تھا کہ میں کوئی مردِ طریقت نہیں ہوں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ میں گناہ کی دلدل میں پھنسنے سے گھبراتا تھا۔ ساقی نے میری توبہ توڑ دی تھی اور اس کے بارے میں میرے دل میں محبت کا ایک خفیہ جذبہ بیدار ہو چکا تھا لیکن اس سانولی نیگرو لڑکی نے جس انداز میں مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تھا اس نے میرے جنسی جذبات میں ہلچل مچا دی تھی۔

میں نے اپنے آپ سے کہا کہ میں اس لڑکی کے جال میں نہیں پھنسوں گا۔ میں ٹرے میں مشروبات کی دو بوتلوں کو سنبھالتا ہوا میزوں کی دوسری طرف گیا تو نیگرو لڑکی پردے کے پیچھے جا رہی تھی۔ میری بوتلیں خالی ہو گئی تھیں۔ میں نئی بوتلیں لینے کے لیے بار روم کے کاؤنٹر کی طرف گیا۔ ٹرے میں دوسری بوتلیں رکھیں اور واپس مڑا۔ ساتھ ہی چھوٹا سا کوریڈور پردے کے پیچھے جو ڈریسنگ روم بنے ہوئے تھے ان کی طرف جاتا تھا۔ میری نگاہ خالی کوریڈور کی طرف اٹھ گئی۔ چوڑے نقشوں والی نیگرو لڑکی کا خیال شیطان بن کر میرے دماغ پر چھا گیا۔ اور پھر میرے قدم اپنے آپ کوریڈور کی طرف اٹھ گئے۔ بار ٹینڈر دوسری طرف منہ کیے کسی کام میں مصروف تھا۔ اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی ورنہ وہ مجھے ضرور آواز دیتا کہ میں ادھر کیسے جا رہا ہوں۔ کوریڈور میں ذرا آگے جا کر بائیں ہاتھ کو ساتھ ساتھ تین چار چھوٹے چھوٹے ڈریسنگ روم بنے ہوئے تھے جہاں ڈانس کرنے والی لڑکیاں تھوڑی دیر بعد آ کر اپنا کاسٹیوم بدلتی تھیں۔

مجھے بالکل پتہ نہیں تھا نیگرو لڑکی ابھی تک فلور کے عقبی بھاری پردے کے پیچھے چھپ کر کھڑی تھی۔ جیسے ہی میں اس کے قریب سے گزرا وہ سامنے آ گئی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"میرے پیچھے آؤ۔"

اس کے لہجے میں کم از کم مجھے ضرور دعوتِ گناہ کا احساس ہوا۔ اصل میں میرے اندر کا شیطان مجھے اس طور پر یہ احساس دلا رہا تھا۔ وہ سامنے والے ڈریسنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ میں نے کوریڈور میں ادھر ادھر دیکھا اور میں بھی اندر چلا گیا۔ ہم مشرقی لوگوں کے دلوں میں ایک چور ضرور چھپا ہوا ہوتا ہے۔ ہم اس قسم کا کام کرنے سے پہلے ادھر ادھر ضرور دیکھ لیتے ہیں۔ نیگرو لڑکی ڈریسنگ ٹیبل پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ میں اپنی طرف سے بڑا ہیرو بنتا اس کی طرف مسکراتے ہوئے بڑھا۔ نیگرو لڑکی نے میری طرف بالکل توجہ نہ دی۔ وہ پرس کھول کر کوئی شے تلاش کر رہی تھی۔ میرے احساسِ مردانگی کو دھچکا سا لگا کہ اس لڑکی نے مجھے بلایا بھی ہے اور اب مجھے بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ پرس میں ہاتھ ڈال کر چیزوں کو ادھر ادھر کرتی ہوئی وہ میری طرف دیکھے بغیر میرا نام لے کر بولی۔

"تمہارا نام بکی ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں"

اب میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے مجھے محبت کرنے کے لیے نہیں بلایا تھا۔ اس دوران نیگرو لڑکی کاغذ کا ایک تہہ کیا ہوا ٹکڑا نکال چکی تھی۔ یہ کاغذ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"ثنائی نے یہ خط تمہارے نام دیا ہے۔"

ثنائی کے نام ہی سے میرے دل میں گناہ کا جو خیال تھا غائب ہو گیا۔ کیونکہ ثنائی کے خیال سے میرا دل دھڑکنے لگتا تھا اور مجھے میرے عشق کرنے کے تجربے نے بتایا تھا کہ یہ سو فیصد خالص محبت کی علامت ہوتی ہے۔ نیگرو لڑکی نے چاندی کے سگریٹ کیس میں سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور لائٹر سے اسے سلگاتے ہوئے بولی۔

"تم ثنائی کو کب سے جانتے ہو؟"

میں کاغذ کھولنے لگا تو نیگرو لڑکی بولی۔

"اسے یہاں مت پڑھو۔"

پھر وہ بلی کی طرح ڈریسنگ ٹیبل پر سے اچھل کر اتری۔ تیز تیز قدموں سے بند دروازے تک گئی۔ دروازے کے سوراخ میں سے دوسری طرف دیکھا کہ باہر کوئی کان لگا کر اس کی باتیں تو نہیں سن رہا۔ جب سے یقین ہو گیا کہ باہر کوئی نہیں ہے تو وہ میرے پاس آ گئی اور ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔

"ثنائی بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اس ماحول کی لڑکی نہیں ہے۔ میں اسے جانتی ہوں۔ وہ میری ایک ہی سہیلی ہے۔ اس وقت وہ سخت مشکل میں ہے۔ اس کا یقین ہے کہ تم اس کی مدد کر سکتے ہو۔ اس خط کو باتھ روم میں جا کر پڑھنا۔ اور اگر تم اس کی کوئی مدد کر سکو تو مجھے بڑی خوشی ہو گی۔"

باہر سے کسی مرد کی تیز آواز آئی۔

"ساشی! کتنی دیر لگاؤ گی کاسٹیوم بدلنے میں؟"

اس نیگرو لڑکی کا نام ساشی تھا۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے اسی طرح تیز آواز میں بلکہ چیخ کر کہا۔

"آ رہی ہوں ۔۔۔۔۔۔۔"

اس نے ہلکی سی اطالوی میں گالی بک دی۔ پھر جلدی جلدی میرے سامنے کپڑے اتار کر دوسری کاسٹیوم پہننی شروع کر دی۔ میں نے

دوسری طرف متوجہ ہوا تو ساشی نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا: "تم مجھے کیسے آدمی لگتے ہو۔"

اب میں اسے کیسے بتاتا کہ واقعی اس معاملے میں، میں کیسا ہوں۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کاسٹیوم بدل کر وہ پلٹ کر دروازے کے پاس گئی۔ دروازہ ذرا سا کھول کر باہر جھانک کر دیکھا اور ہاتھ سے مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا ہوا اپنا مشروبات والا ٹرے اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ نتالی کا رقعہ میری پتلون کی جیب میں تھا۔ میں رقعہ پڑھنے کے لیے بے چین تھا مگر جب میں بار روم کے کاؤنٹر کے قریب سے گزرا تو بروٹو نے کرخت آواز میں اطالوی زبان میں پوچھا۔ "ادھر کہاں سے آ رہے ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور جلدی سے ہال روم میں چلا گیا۔ یہاں میوزک کا شور مچا تھا۔ میں ٹرے کے ساتھ دوسری میزوں کے پاس جا کر اپنے کام میں لگ گیا۔ جہاں کسی میز پر گلاس خالی ہوتا میں اسے جلدی سے بھر دیتا اور گتے کے چھوٹے سے ٹکڑے پر میز کے نمبر کے آگے اس کا حساب ڈال دیتا۔ اسی طرح پھرتی دکھاتا ہوا کھسکتا ہوا اس طرف چلا گیا جہاں باتھ روم تھے۔ یہاں مردانہ اور زنانہ باتھ روم ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ میں نے ٹرے ایک خالی میز پر رکھی اور مردانہ باتھ روم میں گھس گیا۔ اندر جاتے ہی نتالی کا رقعہ کھول کر دیکھا۔ رقعے میں انگریزی میں جلی حروف میں میرے نام کے آگے لکھا ہوا تھا۔

"میری مدد کرو۔"

اس کے نیچے کسی جگہ کا پورا ایڈریس اور نیچے نتالی لکھا ہوا تھا۔ میرے کان گرم ہو گئے۔ جلدی سے رقعہ جیب میں ڈالا اور باتھ روم سے نکل آیا۔

وینس میں مافیا: مارکو گینگ

رات کو سلیمان کے فلیٹ پر آ کر میں نے نتالی کے رقعے کو ایک بار پھر پڑھا۔ بار بار پڑھا۔ نتالی جس مصیبت میں مبتلا تھی وہ میرے علم میں تھی۔ یہ مافیا کا چکر تھا۔ دو آدمی اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ میں اس چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا، لیکن نتالی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا اور میں بے بس سا ہو جاتا۔ اسے میری مدد کی ضرورت تھی۔ مجھے اس کی ضرور مدد کرنی چاہیے۔ ساتھ ہی یہ خیال آ جاتا کہ میں پردیس میں ہوں۔ یہاں مافیا والوں نے بڑے خونی جال بچھائے ہوتے ہیں، کہیں خواہ مخواہ گرفتار نہ ہو جاؤں۔ میں نے ان جرائم پیشہ لوگوں کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا اور یہاں آ کر بہت سی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ یہ لوگ بڑی آسانی سے وزیر سے لے کر خاکروب تک جس کو چاہیں قتل کروا دیتے ہیں اور بعض اوقات جو قتل کرتا ہے اس کو بھی قتل کروا ڈالتے ہیں۔ یہ منشیات کا دھندہ بھی کرتے ہیں۔ ارب پتی سرمایہ داروں کو بلیک میل بھی کرتے ہیں۔ ناجائز اسلحہ کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔ دہشت گردی بھی کرواتے ہیں۔ یورپ کے کسی ملک میں ایسا کوئی کلب یا کسینو نہیں ملے گا جہاں ان کے آدمی نہ ہوں۔ رازداری یہاں تک رکھتے ہیں کہ قتل کرنے والے کو بھی معلوم

نہیں ہوتا کہ وہ جس کو قتل کرنے جا رہا تھا، وہ کیوں قتل کیا جا رہا ہے۔ مافیا کے رکن ایک دوسرے تک سے واقف نہیں ہوتے ہیں۔

محبت کا امتحان

یہ سارے حقائق میرے پیش نظر تھے۔ مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ جس مافیا کے پھندے میں ثنائی پھنسی ہوئی ہے اس کا مقصد کیا ہے اور وہ ثنائی سے کیا کام کروانا چاہتے ہیں؟ میں نے اس کا رقعہ جیب میں ہی رکھا اور جب سلیمان آیا تو اس سے اس بارے میں کوئی بات نہ کی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے یہی کہے گا کہ خبردار اگر تم اس معاملے میں آئے یہ جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے اپنے فلیٹ میں بھی رہنے نہ دے۔ سلیمان حسب عادت رات دیر سے آیا۔ اس وقت میں جاگ رہا تھا وہ صوفے پر دو کمبل اوڑھے پڑا تھا مگر میں نے یہ ظاہر کیا کہ میں سو رہا ہوں۔ کافی دیر تک مجھے نیند نہ آئی۔ دماغ یہی سوچتا رہا کہ کیا کرنا چاہیے۔ دل سنہری بالوں والی خوبصورت اور گرم جوشی سے محبت کرنے والی لڑکی ثنائی کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر دماغ اس کام سے روکتا تھا کہ یہ خطرناک راستہ ہے۔ اس سے باز آجاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔ فوراً دل مجھے ثنائی کے چہرے اور جسم کے مختلف پوز دکھاتا تھا۔ اور میں ایک بار پھر ثنائی کے بارے میں سوچنے لگتا کہ آخر وہ ایک عورت ہے اور سخت مصیبت میں ہے اس کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔ چنانچہ سونے سے پہلے میں نے ثنائی کے بتائے ہوئے ایڈریس پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ دن میری محبت اور میرے عذاب کا پہلا دن تھا۔

دوسرے دن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹیلی ویژن پر محکمہ موسمیات والوں نے کہا تھا کہ آج بارش ہوگی۔ میں نے پولیسٹر والی فوم والی ایک نئی جیکٹ کل ہی خریدی تھی۔ یہ بے حد گرم تھی اور شدید سرد راتوں میں بھی میرے جسم کو گرم رکھتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک ہڈ یعنی ٹوپی بھی تھی۔ ہڈ سر پر پہن کر جب میں تسمے کس لیتا تھا تو سردی لگنے کا پھر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے نئی جیکٹ کے ساتھ بوٹ پہنا۔ گرم اونی ٹوپی سر پر جما کر کانوں تک کھینچ لی۔ سلیمان نے مجھے اس طرح تیار ہو کر نکلتے دیکھا تو پوچھا۔

"کیا ایلپس کے پہاڑوں میں سیاحت کرنے جا رہے ہو؟"

میں نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

"نہیں برادر! سپر مارکیٹ تک جا رہا ہوں تھوڑی دیر میں آجاؤں گا۔"

ثنائی کا لکھا ہوا ایڈریس میری جیب میں تھا۔ جس علاقے کا ایڈریس تھا اس علاقے سے میں بخوبی واقف تھا۔ یہ شہر کے شمال مشرق میں بندرگاہ والی گلیوں کے آخری سرے پر تھا جہاں سے آگے سمندر شروع ہو جاتا تھا۔ میں دو بسیں بدل کر شمال کی جانب بندرگاہ والی گلیوں کی ایک چھوٹی سی ڈاک یارڈ پر آ گیا۔ ثنائی نے مکان کا نام اور نمبر بھی لکھا تھا۔ میں کشتی میں بیٹھ کر اس نمبر والی گلی کے ایک پلیٹ فارم پر جا کر اتر گیا۔ پوچھتا پوچھتا آخر اس خاص مکان پر آ گیا جس کا نام ثنائی نے اپنے رقعے میں لکھا تھا۔

یہ عجیب سا لاطینی نام تھا اس نام کی ایک تانبے کی تختی مکان کے باہر لگی ہوئی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ کال بیل کا بٹن کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ تیسری بار دستک دینے پر دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور میرے سامنے اپنی کلب کی نیگرو ڈانسر ساشی گرم لمبا اونی گاؤن پہنے کھڑی تھی۔ اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے اندر آنے کا اشارہ کیا اور خود پیچھے ہٹ گئی۔ میں ایک تنگ سے بوسیدہ کمرے میں آ گیا۔ مدھم روشنی میں گھسا پٹا پرانا فرنیچر ادھر ادھر پڑا تھا۔ میں بڑا حیران ہوا کہ یہاں یہ نیگرو لڑکی کہاں سے آ گئی۔ پھر سوچا کہ یہ ثنائی کی سہیلی ہو سکتا ہے اس کے مکان پر آئی ہو۔ میں نے پوچھا۔

"ثنائی کہاں ہے؟"

ساشی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی جو پہلے کی طرح تنگ اور نیم روشن تھا۔ کمرے میں کاٹھ کا پلنگ دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ گول میز پر چائے کے برتن اور دو تین چینی کی تھالیاں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ کمرے میں پہلے ہی سے گھٹیا تمباکو کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ پلنگ کے پاس بھدا سا صوفہ رکھا تھا جس کے آگے بجلی کا ہیٹر جل رہا تھا۔ کمرے کی فضا پہلے کمرے کی نسبت گرم تھی۔

ساشی نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا اور خود سامنے والی آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے ایک بار پھر ثنائی کا پوچھا تو ساشی ہیٹر پر اپنے ہاتھ سینکتی ہوئی بولی۔

"یہ ثنائی کا گھر نہیں ہے یہ میرا مکان ہے۔ میں یہاں کرائے پر رہتی ہوں۔"

نیگرو لڑکی ساشی نے سرہانے کے نیچے سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ مجھے دیا۔ ایک خود سلگایا۔ اپنے چوڑے نتھنوں میں سے سگریٹ کا دھواں نکالتی ہوئی کہنے لگی۔

"میں نہیں سمجھتی کہ ثنائی نے تجھے اپنی مدد کے لیے کیوں بلایا ہے۔ کیونکہ تم اس ملک کے رہنے والے نہیں ہو۔ تمہیں یہاں کے جرائم پیشہ لوگوں کے بارے میں زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ لیکن ثنائی بار بار تمہارا نام لے رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا ہے کہ صرف تم ہی اس کی مدد کر سکتے ہو۔"

میں خاموشی سے نیگرو لڑکی کی باتیں سن رہا تھا۔ بات کرتے کرتے کسی وقت اس کے نتھنے مزید چوڑے ہو جاتے تھے جو مجھے افریقہ کے جنگل کی کسی شیرنی کی یاد دلاتے تھے جو اپنے شکار پر جھپٹنے ہی والی ہو۔ میں دل میں بڑا فخر محسوس کر رہا تھا کہ ثنائی کی نظروں میں میں ایک بہادر مرد ہوں۔ ساشی کہہ رہی تھی۔

"ثنائی میری بچپن کی سہیلی ہے۔ ہم گاؤں میں ایک ساتھ کانونٹ میں پڑھا کرتی تھیں۔ پھر اس کی شادی ہو گئی۔ اس کا خاوند وینس سے آیا اور اس نے ثنائی کو اونچی سوسائٹی میں لے جانا شروع کر دیا۔ وہ اپنی خوبصورت بیوی کی مدد سے ٹھیکے منظور کرانے لگا۔ ثنائی

نادان اور بھولی بھالی لڑکی تھی۔ وہ اپنے خاوند کی فرمانبرداری کرتی رہی اور اسے اس وقت ہوش آیا جب وہ گناہ کی دلدل میں پھنس چکی تھی۔ خاوند نے اسے چھوڑ کر دوسری شادی کر لی اور ثنائی جنس کے اوباش امراء اور عیاش سرکاری افسروں اور بعد میں مافیا کے آدمیوں کا کھلونا بن گئی۔"

ٹیگور والی ساشی رک رک کر سگریٹ کے کش بھی لگا رہی تھی۔ ثنائی کی داستان الم مجھ پر بڑا اثر کر رہی تھی۔ لیکن اب میں دل میں گھبرانے بھی لگا تھا کہ ثنائی کے ساتھ کہیں میں بھی دلدل میں نہ پھنس جاؤں۔

ساشی نے سگریٹ کی راکھ کو جھاڑتے ہوئے کہا۔

"بس یہی تھی داستان ہے ثنائی کی۔ یہ ملک کی ہر اس لڑکی کی کہانی ہے جو گاؤں سے شہر میں آتی ہے اور غلط ہاتھوں میں پڑ کر اپنی زندگی تباہ کر لیتی ہے۔ میں تمہارے لیے کافی بناتی ہوں۔ شاید باہر بارش شروع ہو گئی ہے۔"

وہ چولہے کے پاس کھڑی ہو کر کافی بنانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ باتیں بھی کرتی جاتی تھی۔

"کیا تم اس کی مدد کرو گے؟"

ساشی نے مجھ سے سوال کیا۔ میں خاموش رہا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

میں نے کہا۔

"میں ثنائی کی مدد کرنا چاہتا ہوں مگر تم کو تو معلوم ہی ہے کہ بار، کلب کا ایک معمولی ویٹر ہوں اور اس ملک میں اجنبی ہوں۔"

ساشی خاموشی سے کافی بناتی رہی۔ پھر وہ دونوں ہاتھوں میں کافی کا ایک ایک مگ لیے کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ سگریٹ اس کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔

"تم ثنائی کی مدد کرو یا نہ کرو یہ تمہیں اختیار ہے ۔۔۔۔۔۔ مگر میں ایک بات تمہیں ضرور بتانا چاہتی ہوں ۔۔۔۔۔۔"

میں ساشی کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"ثنائی تم سے محبت کرتی ہے۔"

میرا سر مزید فخر سے بلند ہو گیا۔ بس مرد کی یہی کمزوری اسے لے ڈوبتی ہے۔ اگر کسی مرد کی بیوی یا کوئی شریفانہ ماحول میں رہنے والی لڑکی یہ کہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں تو یہ بڑی خوش آئند بات ہوتی ہے اور اس سے مرد کی شرافت میں اضافہ ہوتا ہے لیکن جب کوئی جسم طوائف یا بار کی طوائف یا کلب ڈانسر لڑکی یہ کہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں تو مرد کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ ایک کان سے سنے اور

دوسرے کان سے نکال دے۔ اور اگر ایسا نہ کر سکے اور جذبات میں بہہ جائے تو اس پر لازم ہے کہ جس راستے پر وہ چل رہا ہے اس کو چھوڑ دے اور وہاں سے فرار ہو جائے۔ یہ نصیحت میں آپ کو اس لیے کر رہا ہوں کہ مجھے بڑا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ اور یوں سمجھیں کہ میں ذلت و رسوائی اور ہلاکت کی گہرائیوں میں گرتے گرتے بچا ہوں۔ افسوس کہ اس وقت مجھے نصیحت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ایک سلیمان تھا جس کو میں نے یہ باتیں بتائی ہی نہیں تھیں۔ میں خود بھی جذبات کے ریلے میں بہہ رہا تھا۔ ثنائی کے سنہرے بالوں اور اس کے انداز دلربائی نے مجھ پر جیسے ایک سحر پھونک دیا تھا۔

جس وقت ساشی مجھے ثنائی کی الم ناک کہانی سنا رہی تھی تو میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ مجھے اس جھک جھک میں نہیں پڑنا چاہیے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ثنائی کا اداس چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا اور میں سب کچھ بھول کر اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیتا۔ جب نیگرو لڑکی ساشی نے کہا کہ ثنائی مجھ سے محبت کرنے لگی ہے تو میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے میری تو اس سے صرف ایک ہی ملاقات ہوئی ہے اور وہ بھی سخت افراتفری کی حالت میں۔"

ساشی نے نتھنے مزید چوڑے کرتے ہوئے سگریٹ کا دھواں باہر نکالا اور میری طرف تھوڑا سا جھک کر کہنے لگی۔

"ہم وینس کی رنڈیاں ایک گھنٹے کے لیے بھی محبت کرتی ہیں، ایک رات کے لیے بھی محبت کرتی ہیں، ہم ایک گھنٹہ جھوٹ بولتی ہیں، ساری رات جھوٹ بولتی ہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن جب ہمیں کسی سے واقعی محبت ہو جاتی ہے تو پھر ہم بھی محبت کرتی ہیں اور اس محبت میں اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرتیں۔ ثنائی تم سے سچی محبت کرتی ہے۔ میں اسے دل کی گہرائیوں سے جانتی ہوں۔ اس وقت وہ مشکل میں ہے۔ اس کو یقین ہے کہ تم ہی اس کی مدد کر سکتے ہو۔ تمہارا فرض بنتا ہے کہ اس کی مدد کرو اور اس کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچاؤ۔ اگر تم بھی بھاگ گئے تو میں تمہیں یقین دلاتی ہوں ثنائی خودکشی کر لے گی، کیونکہ اس کے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

مجھ پر ایک ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ ذہن سخت کشمکش میں تھا۔ کبھی خیال آتا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اٹلی کے کسی دوسرے شہر میں چلا جاؤں۔ کبھی خیال آتا کہ نہیں، یہ بزدلی ہے، یہ عمل مردانگی کے خلاف ہے، بہادر بنو اور ثنائی کی مدد کرو، کم از کم اس سے مل کر معلوم تو کرو کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ کس قسم کی مدد کی اسے ضرورت ہے۔ میں نے ساشی سے کہا کہ مجھے ثنائی کے پاس لے چلو۔

ساشی کے چہرے پر پرسکون مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے گھٹنے کو اپنے ہاتھ سے دبایا۔ اور خالی گلاس لے کر کچن کی طرف گئی۔

"ثنائی سچ کہتی تھی کہ تم اس کی ضرور مدد کرو گے۔ میں ابھی تمہیں اس کے پاس لے چلتی ہوں۔"

”وہ کہاں رہتی ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

نیگرو لڑکی میری طرف دیکھ کر بولی۔

”میں تمہیں وہ جگہ نہیں بتا سکتی، تمہیں وہاں لے چلوں گی۔“

جب وہ مجھے لے کر اپنے مکان سے باہر نکلی تو بارش تھم چکی تھی۔ اس کے دالان کا فرش جو گلی کی نہر کی سیڑھیوں تک چلا گیا تھا، گیلا تھا۔ ساشی نے کالے گرم اوور کوٹ کے اوپر کالی بیریٹ کیپ پہن رکھی تھی۔ ایک گنڈولا پاس سے گزرا تو ہم اس میں بیٹھ کر ڈاک یارڈ تک آ گئے۔ سرد ہوا چل رہی تھی مگر میری اونی ٹوپی اور فوم کی جیکٹ نے مجھے سردی سے بچا رکھا تھا۔ ساشی نے ہاتھ دے کر ایک ٹیکسی روکی۔ ٹیکسی کو اس نے کسی علاقے کا نام دے کر چلنے کو کہا۔ ٹیکسی وینس کی گیلی سڑکوں پر چل پڑی۔ ہم دونوں پچھلی نشست پر ایک دوسرے کے ساتھ لگے بیٹھے تھے۔ مشرقی ملکوں میں اگر ہم کسی عورت کے ساتھ لگ کر ٹیکسی میں بیٹھے ہوں تو دونوں کی نفسیات پر اثر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ہماری آب و ہوا میں ایک قدرتی بات ہے اور پھر اس کے پیچھے عورت سے دور رہنے کا اثر بھی ہے۔ اور ہمارے دین کی تعلیمات بھی یہی ہیں۔ لیکن یورپ وغیرہ میں ایسی بات نہیں ہے۔ وہاں مرد اور عورت اگر گاڑی میں بالکل ساتھ لگ کر بھی بیٹھے ہوں تو ان کی نفسیات میں کوئی ہیجان پیدا نہیں ہوتا۔ وہ بالکل ایسے بیٹھے رہتے ہیں جس طرح دو مرد ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر بیٹھے ہوں۔ یہ نتیجہ ہے مغربی ماحول میں صدیوں سے عورت مرد کے آزادانہ میل جول اور ان کے سرد موسم کا۔ شروع شروع میں یہاں آ کر جب بس میں یا ٹرین میں یا کسی سینما گھر میں کوئی عورت میرے بالکل قریب ساتھ لگ کر بیٹھی ہوتی تھی تو مجھ پر شدید ردعمل شروع ہو جاتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ عورت پر بھی اس کا اثر ہو رہا ہوگا۔ چنانچہ ایک بار میں نے سینما ہال میں عورت کے ساتھ لگ کر بیٹھے بیٹھے بے تکلفی سے کام لیتے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ عورت نے ذرا سا چونک کر میری طرف دیکھا اور بڑی ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

”کیا تم بیمار ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے تم اپنے ہوش و حواس میں نہیں لگتے۔“

مجھے سخت ندامت ہوئی اور پسینہ آ گیا۔ تب مجھ پر یہ راز کھلا کہ یہاں اس قسم کی حرکت کو سخت بدتمیزی اور بیمار ذہن کی پیداوار سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ ٹیکسی میں نیگرو لڑکی ساشی میرے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ مجھے اس کے جسم کی حرارت اس کے گرم اوور کوٹ میں سے نکل کر اپنے جسم میں جذب ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ نیگرو لڑکی پر میرے جسم کے لمس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا۔ یہ ایک صحت مندانہ رویہ تھا جو مجھے بڑا اچھا لگا تھا۔

ٹیکسی وینس شہر کی گنجان آبادی سے نکل کر پہاڑی علاقے میں داخل ہو گئی تھی۔ آسمان اسی طرح ابر آلود تھا مگر بارش نہیں ہو رہی تھی۔ یہ علاقہ میرا دیکھا ہوا نہیں تھا۔

ایک بڑی سڑک سے اتر کر گاڑی چھوٹی سڑک پر آ گئی۔ یہ سڑک ایک ٹیلے کے گرد چکر کاٹ کر دوسری طرف گئی تو وہاں نشیب میں اونچے اونچے درخت تھے اور کوئی مکان نہیں تھا۔ ساشی نے یہاں ٹیکسی رکوائی اور ڈرائیور کو ٹھہرنے کو کہا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر بائیں طرف پہاڑی پگڈنڈی پر مڑ گئی۔ یہاں بڑے اونچے اونچے اور گھنے درخت تھے۔ ان درختوں کی شاخوں سے بارش کا رکا ہوا پانی ٹپک رہا تھا۔ ہم ڈھلان پر تھوڑی دور گئے تو سامنے نشیب میں ایک کھلی جگہ پر درختوں کے نیچے ایک کاٹیج کے باہر کار کھڑی تھی۔ جیسے ہی ساشی کی نظر اس کار پر پڑی اس نے جلدی سے مجھے بازو سے پکڑا اور اپنے ساتھ کھینچتی ہوئی ایک درخت کے پیچھے آ گئی۔

"کیا ہوا؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"شی" ساشی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چپ کرا دیا۔

"یہ ماروی کی گاڑی ہے۔ بہت برا ہوا۔ وہ لوگ نتالی کو تلاش کرتے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ مجھے اس کا ڈر تھا۔"

ساشی نے گہرا سانس لیا اور آہستہ سے کہا۔

"ہمارا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔"

نتالی کا اغوا

وہ میرا بازو ابھی تک پکڑے ہوئے تھی۔ وہ واپس مڑنے ہی والی تھی کہ درختوں کے نیچے سے جو چھوٹا سا کاٹیج بنا ہوا تھا اس کا دروازہ کسی نے اندر سے لات مار کر کھولا اور ہماری آنکھوں نے ایک دردناک منظر دیکھا۔ دو ہٹے کٹے آدمی نتالی کو گھسیٹتے ہوئے کاٹیج سے باہر لا رہے تھے۔ نتالی چیخ رہی تھی، رو رہی تھی مگر ان "دیووں" پر اس کی آہ و زاری کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اسے اسی طرح گھسیٹتے ہوئے کار کے پاس لائے۔ ایک آدمی نے زور سے نتالی کے چہرے پر گھونسا مارا۔ نتالی کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ میرے ساتھ کھڑی ساشی نے دبی زبان میں انتہائی غصے کے ساتھ اس آدمی کو گالی دی اور میرے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اتنی دیر میں دوسرے آدمی نے پستول نکال لیا تھا۔ انہوں نے نیم بیہوش نتالی کو گاڑی میں ڈال کر دروازہ زور سے بند کیا اور گاڑی سٹارٹ کر کے اسے تیزی سے درختوں میں سے نکال کر لے گئے۔

"اب یہاں رکنا بیکار ہے۔"

یہ کہہ کر ساشی واپس چل پڑی۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ میں نے پوچھا کہ یہ لوگ نتالی کو کہاں لے گئے ہیں؟ ساشی نے ان لوگوں کو گالی دی اور کہا۔

"وہ لوگ اسے کسی تہہ خانے میں بند کر دیں گے۔ اسے طرح طرح کی اذیتیں دیں گے یہاں تک کہ نتالی ان کے یہ کام کرنے پر

مجبور ہو جائے گی۔"

"وہ ستالی سے کیا کام لینا چاہتے ہیں؟"

ساشی نے کہا۔

"یہ جرائم پیشہ لوگوں کا بہت بڑا گینگ ہے۔ یہ لوگ ارب پتی تاجروں اور سیاسی لیڈروں سے معاوضہ لے کر ان کے حریفوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ اس گھناؤنے جرم کے لیے خوبصورت لڑکیوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لڑکیاں پارٹیوں میں بیش قیمت جاپانی گاؤن پہن کر شامل ہوتی ہیں اور بڑی ہوشیاری سے جس شخص کو ہلاک کرنا مقصود ہوتا ہے اس کے جام میں انتہائی زہریلا اور بے ذائقہ بے رنگ محلول ڈال دیتی ہیں یا پھر اس شخص کے بیڈ روم میں بم لگا آتی ہیں۔ ستالی چونکہ گروہ کی تمام لڑکیوں میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے اور بڑی اچھی گفتگو کر لیتی ہے اس لیے یہ لوگ اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتے۔"

ہماری ٹیکسی چھوٹی سڑک کے کنارے درختوں کے نیچے کھڑی تھی۔ ہم ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔ ساشی نے ڈرائیور سے واپس چلنے کو کہا۔ وہ ستالی کے لیے پریشان تھی۔ اس کے چہرے سے اس کے دل کی بات صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ میں خود ستالی کے بارے میں اداس ہو رہا تھا۔ لیکن میں مجبور تھا۔ گاڑی پہاڑی سڑک پر واپس جا رہی تھی۔

اچانک ساشی نے میری طرف گردن موڑ کر دیکھا اور بولی۔

"کیا تم ستالی کی مدد نہیں کرو گے؟ وہ ایک ایسی لڑکی ہے جو گناہ کی دلدل سے نکل کر شریف عورت کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔"

میرے لیے یہ ایک پریشان کر دینے والا سوال تھا۔ میں اگر چاہتا بھی تو ستالی کی کس طرح مدد کر سکتا تھا۔ میں نے کہا۔

"اب وہ جرائم پیشہ لوگوں کے قبضے میں ہے اور تم نے خود کہا تھا کہ میں یہاں اجنبی ہوں اور یہ قاتل قسم کے لوگ ہیں۔ میں ان کے ہتھکنڈوں سے بالکل ہی واقف نہیں ہوں۔"

ساشی نے کہا۔

"چونکہ اس گروہ کے لوگ تمہاری شکل سے واقف نہیں ہیں اس لیے تم بہتر طریقے سے ستالی کی مدد کر سکتے ہو۔ اس وقت اگر ہم نے ستالی کی مدد نہ کی تو یہ لوگ اسے اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیں گے۔ اور پھر ستالی تم سے محبت کرتی ہے اسے خدا جانے کیسے یقین ہو گیا ہے کہ تم اس کی مدد کرو گے۔"

میں عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا۔ میں ستالی کی مدد بھی کرنا چاہتا تھا اور یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں خواہ مخواہ بیچ میں آ کر مارا نہ جاؤں۔ مجھے زندہ رہنا تھا۔ میں واپس لاہور جا کر اپنے دوستوں کو جاپان کی سیاحت کے مزے دار قصے سنانا چاہتا تھا۔ ساشی بولی۔

"تم اکیلے نہیں ہو گے میں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ بس ایک بار اگر ہم اسے ان بدمعاشوں کے چنگل سے چھڑا لیں تو پھر میں نتالی کا ایسا انتظام کر دوں گی کہ وہ ان غنڈوں کے چنگل سے ہمیشہ کے لیے نکل جائے گی۔"

میں کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن جانے کیوں میں نے کہہ دیا۔

"مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

ساشی نے میرا ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ اور بڑی محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"میں جانتی تھی کہ تم نتالی کی ضرور مدد کرو گے۔ تم مشرقی لوگ بڑے بہادر اور محبت کرنے والے لوگ ہو۔ تم میرے فلیٹ پر چلو۔ وہاں جا کر میں تمہیں سارا پروگرام سمجھا دوں گی کہ ہمیں نتالی کو رہا کرانے کے لیے کیا کرنا ہوگا۔"

میں غیر ارادی طور پر اس معاملے میں پھنس گیا تھا۔ اب انکار کرنا اور پیچھے ہٹنا شان مردانگی کے خلاف تھا۔

ساشی مجھے اپنے اس نیم روشن بوسیدہ فلیٹ میں لے آئی۔ اس نے کافی بنائی۔ ایک طرف کو جھکے ہوئے پرانے فریج میں سے ٹھنڈے برگر نکال کر گرم کیے اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے کہا۔

"مافیا کے لوگ نتالی کو دو جگہوں پر رکھ سکتے ہیں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے اور نتالی نے بھی ایک بار مجھے بتایا تھا۔ ایک جگہ تو وینس کے گینگ لیڈر بدمعاش مارکو کا بنگلہ ہے جس کے نیچے تہہ در تہہ کمرے بنے ہوئے ہیں۔ نتالی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ کمرے صرف عیاشی کے لیے بنائے گئے ہیں۔ دوسری جگہ شمال میں سمندر میں ایک چھوٹا ویران جزیرہ ہے۔ یہاں مارکو نے ایک فارم بنایا ہوا ہے۔ اس فارم میں ایک عقوبت خانہ ہے جہاں اغوا شدہ لوگوں کو قید میں رکھا جاتا ہے اور نتالی کی طرح جو لڑکیاں گناہ کی دلدل سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتی ہیں انہیں اذیتیں دی جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نتالی کو اسی ویران جزیرے میں رکھا گیا ہے۔ ہمیں اسے وہاں سے نکالنا ہوگا۔ بس یہی وہ مدد ہے جو تم میرے ساتھ مل کر دو گے اور جس کی نتالی نے تم سے امید وابستہ کر رکھی ہے۔"

نہ جانے کیوں اور کس جذبے کے تحت میں نے حامی بھری کہ میں نتالی کو بدمعاشوں کی قید سے نکالنے کے لیے ساشی کی مدد کروں گا۔

نیگرو لڑکی نے بے اختیار میرا ہاتھ چوم لیا۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اب میں تمہیں سارا پروگرام سمجھاتی ہوں کہ ہمیں کیا کرنا ہوگا۔"

پروگرام یہ تھا کہ ہم آج رات کلب سے فارغ ہو کر سیدھا ویران جزیرے میں جائیں گے اور نتالی کو وہاں سے نکال کر لانے کی کوشش کریں گے۔ کہنے کو تو یہ بڑا مختصر سا پروگرام تھا مگر اس کی راہ میں کئی ایک رکاوٹیں تھیں اور ہر قدم پر موت نظر آ رہی تھی۔ لیکن چونکہ میں تیار ہو گیا تھا اس لیے میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ ہو جائے ایک بار تو نتالی کو رہا کرانے کی پوری کوشش کروں گا۔

ساشی نے کہا۔

"میرے پاس اپنا ایک آٹو میٹک ریوالور ہے تمہارے لیے ایک ریوالور کا انتظام بھی کرلوں گی۔ ہم کوئی تربیت یافتہ کمانڈوز نہیں ہیں ہمیں اپنی ہمت اور اعتماد کے بھروسے پر جزیرے میں داخل ہونا ہوگا۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو ہم ستانی کو اپنے ساتھ لے آئیں گے۔"

"ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ وہ جگہ کہاں ہے جہاں ستانی کو بند کیا گیا ہے؟"

ساشی نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"ستانی نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ بدمعاش مارکو کے فارم کے جنوب میں سمندر کے کنارے بالکل ساتھ ساتھ دو اونچی چٹانیں ہیں ان چٹانوں کے پیچھے ایک چھوٹا سا گودام ہے۔ اسی گودام کے نیچے عقوبت خانہ ہے۔"

میں نے کہا۔

"اس کے لیے ہمیں بڑی کشتی کا انتظام کرنا ہوگا۔۔۔۔۔۔۔کیا تم کشتی چلا سکتی ہو؟"

ساشی نے کہا۔"میں کالج کے زمانے میں کشتی رانی کے مقابلوں میں حصہ لیتی رہی ہوں' ہم ایک کشتی کرائے پر لے لیں گے تم فکر نہ کرو میں شام تک اس کا پورا انتظام کرلوں گی۔ یہ بتاؤ تمہیں تیرنا آتا ہے کیونکہ حالات کوئی بھی صورت اختیار کرسکتے ہیں۔"

جب میں نے اسے بتایا کہ میں تیرنا جانتا ہوں مگر سمندر میں کبھی تیراکی نہیں کی۔ ساشی نے سگریٹ سلگا کر کہا۔

"سمندر میں تیرنا سب سے آسان ہوتا ہے کیونکہ سمندر کا پانی ایک تو بھاری ہوتا ہے دوسرے وہ تیرنے والے کو نیچے سے اوپر اٹھائے رکھتا ہے۔"

میں دوپہر کے بعد تک ساشی کے فلیٹ میں ہی رہا۔ ساشی نے وہیں تھوڑا بہت کھانا بنایا۔ ہم نے مل کر کھایا۔ میں نے کہا۔"اگر موسم خراب ہوگیا میرا مطلب ہے اگر بارش شروع ہوگئی تو۔۔۔۔۔۔۔؟"

ساشی نے مسکرا کر کہا۔"بارش ہونے لگی تو ہمارا مشن مزید آسان ہو جائے گا' کیونکہ بارش اور سردی میں پہرے دار بھی کہیں گرم ہو کر سو رہا ہوگا۔"

دوپہر کے بعد میں واپس اپنے فلیٹ میں آ گیا۔ سلیمان کھانا بنا رہا تھا' مجھے دیکھ کر بولا۔"آج کل تم کچھ زیادہ ہی سیر سپاٹا کرنے لگے ہو۔ اگر کوئی خاص بات ہوگئی ہے تو مجھے بتا دو۔ میرا مشورہ تمہارے لیے بڑا مفید ہوگا۔"

میں ستانی مشن کے بارے میں سلیمان کو کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ سلیمان عام سوجھ بوجھ کا آدمی ہے وہ مجھے کوئی مفید مشورہ نہیں دے سکے گا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے نصیحتیں کرنے لگے کہ تم ایک غیر لڑکی کی خاطر اپنی جان کیوں خطرے میں

ڈال رہے ہو۔ چونکہ میں نے سفرنامہ لکھتے وقت آپ سے عہد کیا تھا کہ میں جو کچھ لکھوں گا سچ بولوں گا اور آپ سے اپنی کمزوریاں بالکل نہیں چھپاؤں گا۔ اس لیے میں اب اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں دس ہی دن میں سنہری بالوں والی لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا۔ یہ محبت کیا تھی۔۔۔۔۔۔ خراب محبت تھی یا پاک محبت تھی اس سلسلے میں مجھے خود بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں خود بھی آسانی سے اپنی محبت کو کسی خانے میں نہیں ڈال سکا تھا۔ بس محبت تھی، جیسی محبت ایک نوجوان لڑکا کسی نوجوان خوبصورت لڑکی سے کرتا ہے۔

کھانا میں ساشی کے ساتھ کھا کر آیا تھا۔ سلیمان سے میں نے کہہ دیا کہ میں نے ایک ریستوران میں کھانا کھا لیا تھا۔ وہ ہنس کر بولا۔

”بڑے پیسے آ گئے ہیں تمہارے پاس، اس طرح تم بہت جلد قلاش ہو جاؤ گے۔ میرے ساتھ کھایا کرو، میں کوئی تم سے پیسے لیتا ہوں؟“

میں نے اس مہربانی کے لیے سلیمان کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ آئندہ دوپہر کا کھانا میں اسی کے ساتھ کھایا کروں گا۔ اس کے بعد میں سو گیا اور شام تک سویا رہا۔ جب جاگا تو سلیمان چائے کارنس پر رکھ کر جا چکا تھا۔

میں نے اٹھ کر کافی بنائی اور ساشی والے مشن کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خطرناک مشن تھا۔ اور اس میں پستولیں، بندوقیں بھی چل سکتی تھیں۔ لیکن اس میں ایک ایڈونچر بھی تھا۔ میں نے اس قسم کے ایڈونچرز مشن کی کئی کہانیاں ڈائجسٹوں میں پڑھ رکھی تھیں۔ میں نے اپنے آپ کو اسی کہانی کا ہیرو سمجھنے لگا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا کر اس کا کش لگایا اور دل میں کہا۔

”میں ایک مصیبت زدہ لڑکی کی مدد کرنے جا رہا ہوں جو ایک ایسی لڑکی ہے جو گناہ کی آلودگی سے نجات حاصل کر کے شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔ خدا ضرور ہماری مدد کرے گا۔“

رات ہو گئی تو میں منہ ہاتھ دھو کر اپنے کلب کی طرف روانہ ہو گیا۔ کلب میں جا کر بریڈ کو شکل دکھا کر حاضری لگائی وردی پہنی اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ کلب کا ہال کمرہ روزانہ کی طرح لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ فلور پر ڈانس جاری تھا۔ ان میں نیگرو لڑکی ساشی بھی نیم عریاں کاسٹیوم میں ڈانس کر رہی تھی۔ میں فلور کے قریب لگی ہوئی میزوں کے ارد گرد چکر لگا رہا تھا۔ اس دوران ساشی نے ڈانس کرتے ہوئے میری طرف دیکھا اور سر کو اثبات کے انداز میں ہلاتے ہوئے تھوڑا سا مسکرائی اور ڈانس کرتے ہوئے دوسری طرف پھر گئی۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے آدھی رات کے بعد شروع ہونے والے اپنے مشن کے لیے سارا انتظام کر لیا ہے۔

رات کے دس بجے میں نے بار روم کے پیچھے لگے کاؤنٹر کے قریب میز پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے لیے ہمیں صرف بیس منٹ ملتے تھے۔ میں نے دس منٹ میں ہی کھانا کھا لیا۔ کھانا ہماری طرح کا نہیں ہوتا تھا کہ چاولوں کی پلیٹ بھری ہوئی ہے اور ہم اوپر گوشت ڈال کر کھانے جا رہے ہیں۔ وہاں تو فاسٹ فوڈ تھی۔ مرغی کی ایک ٹانگ، دو ٹماٹر، آلو کے تین چار ٹکڑے اور ڈبل روٹی۔ ہمارے گھروں میں تو ڈبل روٹی بیماروں کو کھلائی جاتی ہے مگر وہاں رات کو بھی مجھے ڈبل روٹی کے ساتھ سالن لگا لگا کر کھانا پڑتا تھا۔ کھانا کھا کر میں نے سگریٹ سلگایا

اور اٹھ کر یونہی ٹہلتا ٹہلتا اس کاریڈور کی طرف نکل گیا جہاں ڈانسر لڑکیوں کے ڈریسنگ روم تھے۔

دل میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ شاید کیبرے لڑکی ساشی سے وہاں ملاقات ہو جائے اور اس سے رات کے مشن کے بارے میں مزید تفصیلات معلوم کروں۔ میں ایک ڈریسنگ روم کے قریب سے گزرا تو اس کا دروازہ کھلا۔ ایک سرخ و سفید خوبصورت ڈانسر مسکراتی ہوئی باہر نکلی اور میری طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی "ہائے سینور" کہتی گزر گئی۔ بڑی طلسمی خوشبو اس کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھی۔ میں واپس مڑنے لگا تو اچانک کاریڈور کی مدھم روشنی میں سامنے سے ساشی آتی نظر آئی۔ میں وہیں رک گیا۔ اس نے ہاتھ سے مجھے دوسرے نمبر کے ڈریسنگ روم میں چلنے کا اشارہ کیا۔ میں دوسرے نمبر کے ڈریسنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ میرے پیچھے پیچھے ساشی بھی آ گئی۔ اس نے اندر آتے ہی دروازہ بند کیا اور قریب آ کر کہنے لگی۔

"سب ٹھیک ہے۔ تمہارے لیے ایک ریوالور میں ساتھ لے آئی ہوں۔"

پھر اس نے ریوالور کے ساتھ ہی الماری کے ایک خانے میں چابی لگا کر اسے کھولا، اپنا پرس نکالا ------ اس میں دو ریوالور پڑے تھے۔

"یہ تمہارا ریوالور ہے۔ تمہیں ریوالور چلانا آتا ہے؟"

میں نے ریوالور صرف ایک بار ہی لاہور میں چلایا تھا۔ ایک بار بسنت کے تہوار پر میں پتنگیں اڑانے اپنے ایک دوست کے گھر بھاٹی گیٹ گیا تھا اور وہاں جب ہم نے اپنے حریف کی پتنگ کاٹی تھی تو ریوالور کی فائرنگ کی تھی۔ میں نے ساشی سے کہا۔

"ہاں، مگر مجھے نشانہ وغیرہ لگانے کا تجربہ نہیں ہے۔"

ساشی نے پرس بند کر کے الماری کے خانے کو بند کیا۔ اسے چابی لگاتے ہوئے بولی۔

"ریوالور کا نشانہ نہیں لگاتے، صرف دشمن کو ڈرانے کے لیے چلاتے ہیں۔ ہم بھی ایسا ہی کریں گے۔ اگر ایسا موقع ہوا تو ------ ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔"

"جزیرے پر جانے کے لیے کشتی کا بھی کوئی انتظام ضرور ہو گیا ہو گا۔"

ساشی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے جھکی، اپنے چہرے پر پاؤڈر کا پف دے رہی تھی، کہنے لگی۔

"ہو گیا ہے۔"

پھر میری طرف پلٹ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

"تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ میرے بھی یہاں بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں۔"

میک اپ درست کرنے کے بعد ساشی میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

"تم کتنے بجے ڈیوٹی سے آف ہوتے ہو؟"

"رات تین بجے"

"ہوں" ساشی ٹشو پیپر سے اپنے ہونٹوں کے کنارے دباتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے تم ڈیوٹی سے فارغ ہوتے ہی عقبی سڑک پر جو بس سٹاپ ہے وہاں میرا انتظار کرنا میں تمہیں وہیں ملوں گی۔"

عورت کا اصل حسن حیا اور حجاب

یہ کہہ کر ساشی تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اس کے بعد میں بھی ڈریسنگ روم سے نکل گیا۔ ڈنر کے بعد ہیڈ ویٹر برونو نے میری ڈیوٹی کونے میں جو میزیں لگی تھیں اس طرف لگا دی۔ اس کونے میں دیوار پر ایک سکرین لگی تھی جس پر نیم فحش فلموں کے وڈیو کیسٹ چوبیس گھنٹے چلتے رہتے تھے۔ شروع شروع میں میزوں کے گرد گھوم پھر کر گاہکوں کی سروس کرتے ہوئے کانی آنکھ سے اس سکرین کو دیکھ لیا کرتا تھا۔ بریک کے وقت وہاں بیٹھ کر بھی یہ نیم فحش ڈانس دیکھتا۔ مگر پھر میرے لیے ان میں کوئی دلچسپی نہ رہی۔ بلکہ مجھے یہ نیم عریاں ڈانس مکروہ لگنے لگے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ واقعی عورت کا اصل حسن اس کی حیا داری اور حجاب میں ہے۔ بعد میں مجھے یورپ کے کئی ملکوں کی سیاحت کا موقع ملا اور میں نے وہاں کے ننگے کلب بھی دیکھے اور میں نے ان لوگوں میں رہ کر محسوس کیا کہ وہ لوگ خود اپنی عورتوں کی بے حجابی اور عریانی سے خستہ حال اور پریشان ہیں۔

رات کے دو بج گئے تھے۔

کلب کی عریانیاں اور رقص اپنے عروج پر تھیں۔ فلپینی ڈانسر لڑکیوں کا گروپ آ گیا تھا۔ ساشی دوسری لڑکیوں کے ساتھ ڈریسنگ روم میں جا چکی تھی۔ اس گروپ کی رات کے دو بجے ڈیوٹی ختم ہو جاتی تھی۔ ساشی نے مجھے بتایا تھا کہ جب ہم نیم عریاں کاسٹیوم میں فلور پر ڈانس کر رہی ہوتی ہیں تو ہمیں بالکل احساس نہیں ہوتا کہ ہمارے سامنے مرد بیٹھے ہیں۔ بس ہم کسی مشین کی طرح حرکت کر رہی ہوتی ہیں۔

پونے تین بجے تو میرے دل میں ایک قسم کی تشویش کا احساس بیدار ہونے لگا۔ خدا جانے وہاں جا کر کیسے حالات پیش آئیں۔ گولیاں تو ضرور چلیں گی۔ اچھا کوئی پروا نہیں میں بھی لاہور کا رہنے والا پنجابی ہوں۔ گولیاں چلتی ہیں تو چلیں۔ آمنے سامنے کا مقابلہ ہو گیا تو ایک آدھ کو تو میں بھی بھون کر رکھ دوں گا۔ پھر خیال آنے لگتا کہ یہ پردیس کا معاملہ ہے پولیس پکڑ کر لے گئی تو یہاں تو کوئی ضمانت بھی نہیں دے گا۔ اس وقت ساشی کا چہرہ میرے سامنے آ جاتا اور میرے ذہن میں پیدا ہونے والے کمزور اور تشویش انگیز خیالات غائب ہو جاتے۔ کیونکہ میں ساشی سے محبت کرتا تھا اور دل سے چاہتا تھا کہ وہ بری سوسائٹی سے نکل کر اچھی شریف زندگی شروع کرے۔

ٹھیک تین بجے میں نے ٹرے بار کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ بریڈ کو گڈ نائٹ کہا۔ وردی اتار کر نیلی جین اور فوم کی جیکٹ پہنی سر پر اونی ٹوپی جمائی اور عقبی دروازے سے نکل کر تیز تیز قدموں سے چلتا بس سٹاپ پر آ گیا۔ بس سٹاپ خالی پڑا تھا۔ آسمان اسی طرح ابر آلود تھا۔ سرد ہوا چل رہی تھی اور خالی سڑک پر لیمپ پوسٹوں کی روشنی میں کاغذ اور پلاسٹک کے شاپر بیگ ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔ سڑک پار کی بلڈنگوں میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ چاروں طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کسی وقت کوئی گاڑی تیزی سے گزرتی تو اس خاموشی میں بھنور سے پڑتے محسوس ہوتے۔ میں بس سٹاپ کے اندر چھت کے نیچے پلاسٹک کے موٹے شیشے کی دیوار کے ساتھ لگا سڑک کی دونوں جانب دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک ٹیکسی ہمارے کلب کے ساتھ والی گلی سے نکلی اور بس سٹاپ کے سامنے آ کر رک گئی۔ ڈرائیور نے گاڑی کے اندر کی بتی جلا دی۔ ہلکی روشنی میں مجھے ساشی نظر آئی۔ وہ کھڑکی میں سے ہاتھ باہر نکال کر مجھے جلدی آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ میں بھاگ کر ٹیکسی میں اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی آگے نکل گئی۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ کیونکہ ہم دونوں کو معلوم تھا کہ ہم کیا کرنے والے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ ساشی کی کہنی میری جیکٹ میں گھسی ہوئی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا: "دعا کرو بارش ہو جائے۔" میں نے ہاتھ جیکٹ کی گرم جیبوں میں دے رکھے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بارش کی دعا کیوں کر رہی ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا سے دعا کی۔

"یا اللہ! تو دلوں کا حال جانتا ہے، میری نیت ٹھیک ہے، میری حفاظت کرنا۔"

نتالی مشن

ٹیکسی وینس کی خالی سڑکوں پر رات کی سردی میں پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ ٹیکسی کا ہیٹر زیادہ گرمی نہیں دے رہا تھا۔ ساشی نے اپنے اوورکوٹ کی جیب میں سے مشکل کا پاکٹ نکالا۔ اس میں سے برانڈی کا ایک گھونٹ خود پیا اور پاکٹ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا تو اس نے اصرار کرنے کی بجائے پاکٹ جیب میں رکھ لیا۔ برانڈی یورپ کی قیامت خیز سردی کا جز سمجھا جاتا ہے اور یہ بات ہے بھی کسی حد تک درست۔۔۔۔۔۔ مگر میں اس وقت خدا کو یاد کر رہا تھا اور دل میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا۔ اس لیے برانڈی کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔

ٹیکسی کسی بڑی سڑک سے گھوم کر چھوٹی سڑک پر آ جاتی۔ کبھی چھوٹی سڑک سے نکل کر پھر کسی بڑی سڑک پر آ جاتی۔ رہائشی بلڈنگوں کی قطار ختم ہوتی۔ وہ اونچی اونچی بڑے بڑے شیشوں والی عمارتیں شروع ہو جاتیں جن میں دفاتر قائم تھے۔ ان سب عمارتوں میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ٹیکسی وینس کے شاد گنجان علاقے میں داخل ہو گئی۔ ایک شراب خانے کے باہر نشے میں دھت ایک آدمی ہاتھ میں بوتل لیے کھڑا تھا۔ ٹیکسی کو آتے دیکھ کر وہ سڑک کے بیچ میں آ گیا۔ اور بوتل والا ہاتھ ہلا کر ٹیکسی کو روکنے کے اشارے کرنے لگا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے منہ ہی منہ میں اسے ایک ہلکی سی گالی دی۔ اور گاڑی تیزی سے کاٹ کر آگے نکل گیا۔ ساشی میرے اوپر گر پڑی۔ اس نے بھی شرابی کو ہلکی سی

گاڑی جو صرف میں ہی سن سکا۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی ------ کاش آگے کوئی دوسرا ٹریفک کنٹرولر ہو۔ وہ اسی طرح گاڑی روکنے کا اشارہ کرے۔ ڈرائیور تیزی سے گاڑی کو دوسری طرف کاٹے اور ساشی ایک بار پھر میرے اوپر گرے۔ اس وقت نفسانی خواہشات کا مجھ پر شدید اثر تھا۔ میں نے جلدی سے اس قسم کے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور خدا سے توبہ کر کے اپنے مشن کی کامیابی کی دعائیں مانگنے لگا۔

کافی دیر تک ٹیکسی وینس کی سرد یخ بستہ رات میں خالی سڑکوں پر چلتی رہی۔ پھر روشنیاں کم ہونے لگیں۔ اور دور سے سمندر میں بنی ہوئی عمارتوں کی روشنیاں جھلملاتی نظر آئیں۔ میں سمجھ گیا کہ ہم شہر کے شمالی سمندری علاقے میں داخل ہونے والے ہیں۔ ٹیکسی وینس کی نہری گلیوں والے علاقے کو بائیں جانب چھوڑ کر آگے نکل گئی۔ آگے اندھیرا تھا۔ صرف سڑک کے دونوں جانب روشنیاں تھیں۔ سمندر کی مرطوب ہوا صاف محسوس ہو رہی تھی۔ دور سمندر کے اندر کہیں کہیں کوئی روشنی جھلملاتی دکھائی دے جاتی تھی۔ میں نے ساشی سے سرگوشی میں پوچھا۔

"ابھی کتنی دور جانا ہے؟"

اس نے میری طرف کندھا جھکا کر کہا۔

"ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔"

اس کے سانس میں برانڈی کی تیز بو تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد ٹیکسی نے ایک موڑ کاٹا تو ساشی نے ڈرائیور کو ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے اطالوی زبان میں کہا۔

"اس بس سٹاپ کے پیچھے۔"

ٹیکسی ایک ویران سی بس سٹاپ کے پیچھے سڑک کے کنارے رک گئی۔ ہم ٹیکسی سے باہر نکل آئے۔ ساشی نے ڈرائیور کو میٹر دیکھ کر کرایہ ادا کیا۔ گاڑی آگے نکل گئی۔ ساشی نے کہا۔

"اگر سگریٹ پینا ہے تو یہاں لگا لو۔"

مجھے سگریٹ کی سخت طلب ہو رہی تھی۔ میں نے جلدی سے پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگا لیا۔ ایک سگریٹ ساشی نے بھی سلگا لیا۔ میں نے جیکٹ کا زپ اوپر ٹھوڑی تک بند کیا ہوا تھا۔ ساشی نے بھی اوور کوٹ کے سارے بٹن بند کئے ہوئے تھے۔ اس نے وہی برٹش آرمی افسروں والی کاٹ بیرٹ کیپ پہن رکھی تھی۔ سرد ہوا میں تیزی آنے لگی تھی۔ ہم سڑک سے اتر کر ایک چھوٹی سڑک پر چل پڑے جس کی دونوں جانب اونچی اونچی گھاس اگی ہوئی تھی۔ ہوا میں سمندری مچھلیوں کی بو صاف محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ساشی سے کشتی کے بارے

میں دریافت کیا تو وہ بولی۔

"کشتی ہمیں فش پورٹ پر تیار ملے گی۔"

ساشی نے چلتے چلتے اپنے کوٹ کی جیب میں سے ریوالور نکال کر مجھے دیا اور کہا۔

"اس میں بارہ گولیاں بھری ہوئی ہیں' سیفٹی کیچ لگا ہوا ہے۔ فائر کرنے کی نوبت آ جائے گی تو سیفٹی کیچ ضرور اتار دینا' ورنہ گولی نہیں چلے گی۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"فکر نہ کرو' مجھے سب معلوم ہے۔"

خوف اور بے خوفی کی کیفیت

مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ سیفٹی کیچ کیسے پیچھے کیا جاتا ہے۔ ریوالور کا فائر کئے مجھے ایک مدت ہو گئی تھی۔ آخری فائر میں نے لاہور کے بھاٹی دروازے کے ایک مکان کی چھت پر بسنت کے موقع پر کیا تھا۔ لیکن مجھے اپنے اوپر اعتماد تھا کہ اگر مقابلہ ہو گیا تو میں انگریزی فلموں کے ہیرو کی طرح دھڑا دھڑ فائر کروں گا' کوئی پرواہ نہیں۔

مگر کسی وقت اچانک دل پر یہ خوف سا طاری ہو جاتا تھا کہ یار کہیں مجھے گولی نہ لگ جائے۔ اگر کسی غنڈے کی گولی سیدھی میرے دل پر یا سر میں آ کر لگی تو میں اسی وقت بے موت مارا جاؤں گا۔ پھر کیا ہو گا؟ مجھے تو ابھی لاہور واپس جانا ہے جہاں میرے بھائی' بہنیں اور ماں میرا انتظار کر رہی ہے۔ انہیں تو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ میں مر چکا ہوں اور میری لاش لاوارث قرار دے کر وینس کے کسی پولیس سٹیشن کے پیچھے گڑھے میں دبا دی گئی ہے۔ یہ تصور میرے اندر کمزوری پیدا کر دیتا اور میرے قدم خود بخود آہستہ ہو جاتے۔ دوسرے لمحے طاقتور خیالات کی یلغار ہوتی اور میں اپنے آپ سے کہتا کہ یار بزدل مت بنو۔ زندگی موت تو اللہ کے اختیار میں ہے۔ تم ایک لڑکی کو گناہ کی زندگی سے نجات دلا کر نیکی کی زندگی کی طرف لانے جا رہے ہو۔ یہ کوئی برا کام نہیں ہے۔ گھبراتے کیوں ہو! خدا تمہارے ساتھ ہے۔

ساشی نے سگریٹ پھینک دیا اور سامنے دو تین جگہوں پر فاصلے فاصلے پر جو روشنیاں ہو رہی تھیں ان کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"وہ فش مارکیٹ ہے' یہاں میں نے ایک کشتی کا انتظام کر رکھا ہے۔ یہ چھوٹی والی کشتی ہے' کیونکہ جزیرے پر جانے کے لیے ایسی ہی کشتی کی ضرورت تھی۔ ورنہ وہاں کشتی کے انجن کا شور گارڈز کو ہوشیار کر سکتا ہے۔"

فش مارکیٹ بند تھی۔ ایک جگہ ایک ٹرک کھڑا تھا جس کا انجن چل رہا تھا۔ ساشی کہنے لگی۔

"اس مارکیٹ سے شہر کے شمالی علاقے کو کوئی فوڈ سپلائی ہوتی ہے۔ یہ پھر ٹرک آیا ہے۔ اس قسم کے دوسرے ٹرک بھی صبح ہونے سے

پہلے یہاں قطار میں لگ جائیں گے۔ اس طرف آ جاؤ۔“

ہم اونچی چھت والی خالی مارکیٹ کے سنگی فرش پر سے گزر کر دوسری طرف نشیب میں اتر گئے۔ یہاں پتھر ہی پتھر تھے۔ سمندر کی لہروں کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ مارکیٹ کی جلتی روشنی سمندر کے پانی میں لہرا رہی تھی۔

زمین ریتلی تھی اور جگہ جگہ چھوٹے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اندھیرے میں ہم دیکھ دیکھ کر چل رہے تھے۔ ساشی میرا بازو پکڑ کر بائیں طرف گھوم گئی۔ یہاں ایک اونچا چبوترا بنا ہوا تھا۔ چبوترے کے ساتھ ہی مجھے اندھیرے میں ایک گنڈولا ٹائپ کی کشتی پانی میں اوپر نیچے ہوتی نظر آئی۔ اس کشتی پر مارکیٹ کی پچھلی دیوار کے بلب کی ہلکی ہلکی روشنی پڑ رہی تھی۔ ایک آدمی قریب ہی سٹول پر خوب گرم کپڑوں میں اپنے آپ کو لپیٹے منہ میں پائپ دبائے بیٹھا تھا۔ ساشی کو قریب آتے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے منہ سے پائپ نکال کر سٹول کے ساتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”سینوریتا واپسی پر اسی جگہ کشتی لگا دینا۔ باقی رقم مجھے ابھی دے دو۔“

ساشی نے جیب سے اسے کچھ نوٹ نکال کر دے دیے۔ یہ ملاح تھا۔ اس نے نوٹ گنے اور یہ کہہ کر کھانستا ہوا چل دیا۔

”کوئی گڑبڑ ہوئی تو میرا نام نہ لینا۔“

میں اور ساشی کشتی میں بیٹھ گئے۔ ساشی نے دونوں چپو سنبھالے اور بڑی مہارت کے ساتھ کشتی کو کنارے سے نکال کر کھلے سمندر کی طرف چل پڑی۔ کشتی پانی پر تھوڑے ہچکولے کھا رہی تھی۔ کیونکہ سمندر کی لہریں دور سے آ آ کر ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ سمندر میں سردی کی وجہ سے ہلکی ہلکی دھند چھا رہی تھی۔ میں نے کسی قدر تشویش مگر بظاہر بڑے نارمل لہجے میں ساشی سے کہا۔

”مجھے تو سمندر میں کسی جزیرے کی روشنی نظر نہیں آ رہی۔“

ساشی کشتی کے چپو چلاتے ہوئے بولی۔

”تھوڑی دیر بعد تمہیں اس کی روشنی نظر آ جائے گی۔ دھند کی وجہ سے ابھی دکھائی نہیں دیتی۔“

ویران جزیرے کی روشنی تو نظر نہیں آ رہی تھی مگر فش مارکیٹ کی روشنیاں ہم سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔ میں سوچنے لگا اگر مجھے سمندر میں تیرنا پڑا تو میں تو سردی سے ٹھٹھر کر ختم ہو جاؤں گا۔ یا اللہ! تیرا ہی آسرا ہے۔ کشتی اب سمندر کی پرسکون لہروں پر بہہ رہی تھی۔ ہمیں سمندر کی دھند نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ دھند کا بادل سا تھا جو سمندر پر پھیلا ہوا تھا۔ جب دھند چھٹی تو دور مجھے ایک روشنی ستارے کی طرح جھلملاتی نظر آئی۔ ساشی نے کشتی چلاتے ہوئے کہا۔

”اس روشنی کو دیکھ رہے ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ وہی ویران جزیرہ ہے۔ یہ بدمعاش مارکو کے فارم کی روشنی ہے۔“

”وہاں ساحل سمندر پر گارڈ ضرور ہوں گے۔ ہمیں بڑی احتیاط سے وہاں جانا چاہیے۔“

ساشی نے کہا۔ "تم فکر نہ کرو ہم کشتی کو پیچھے کی طرف سے لے جائیں گے۔۔۔۔۔۔۔ تم ٹھیک ہو نا؟"

"ہاں ہاں۔۔۔۔۔۔ کیوں نہیں؟" میں نے اپنی قدرتی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ساشی واقعی ایک مشاق کشتی چلانے والے کی طرح کشتی چلا رہی تھی۔ اس کا سانس تھوڑا تھوڑا پھول گیا تھا' کہنے لگی۔

"میری جیب میں برانڈی کا پاکٹ ہے' لے لو تم گرم ہو جاؤ گے۔۔۔۔۔۔۔ تمہیں اس وقت برانڈی کی ضرورت ہے۔"

واقعی میں محسوس کر رہا تھا کہ مجھے تھوڑی سی برانڈی کی ضرورت ہے۔ میں نے ساشی کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پاکٹ نکالا اس کا ڈھکن کھولا اور منہ کے ساتھ لگا کر اوپر تلے دو تین گھونٹ برانڈی کے پی گیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میرے اندر سیال آگ اتر گئی ہے۔ میں نے جلدی سے پاکٹ کو ڈھکن لگا کر اسے ساشی کی جیب میں ڈال دیا۔ دیکھتے دیکھتے برانڈی نے میرے کان پھر دونوں ہاتھ اور پھر سارے جسم کو گرم کر دیا اور میرے خیالات میں ہمت' مردانگی اور جرأت کی لہریں سی دوڑنے لگیں۔ میرے دل میں تھوڑی دیر پہلے اپنے مشن کے بارے میں جو تشویش اور ڈر تھا' وہ فوری طور پر ختم ہو گیا۔ اب میں ہر قسم کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھا۔ میں نے ساشی سے کہا۔

"لاؤ اب میں کشتی کھیتا ہوں' تم تھک گئی ہو۔"

ساشی نے بغیر تکلف کے چپوؤں کو چھوڑ دیا اور اٹھ کر میری جگہ پر آ گئی۔ کشتی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اس کے چلنے سے کشتی ڈولنے لگی اور میں گرتے گرتے بچا۔ ساشی نے مجھے سنبھالا اور بولی۔

"کہیں برانڈی زیادہ تو نہیں چڑھا گئے؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

میں نے کہا۔ "صرف تین گھونٹ پیے ہیں۔"

ویران جزیرے میں بدمعاش مارکو کے فارم کی روشنی اب قریب آ رہی تھی۔ مجھ سے کشتی ٹھیک طرح سے نہیں چل رہی تھی۔ ساشی نے چپو ایک بار پھر اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور کشتی کو ویران جزیرے کی بائیں جانب سے جانے لگی۔ اس نے کہا۔

"اب سگریٹ بالکل نہ جلانا' ہمیں صبح کی روشنی ہونے سے پہلے پہلے اپنا مشن مکمل کر لینا چاہیے۔ دن نکل آیا تو ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔"

آسمان پر اندھیرا اور دھندی پھیلی ہوئی تھی اور کوئی ستارہ نظر نہیں آتا تھا۔ سمندر کا پانی بالکل سیاہ لگ رہا تھا۔ کشتی کو ساشی بڑی مہارت سے چلاتی ہوئی جزیرے کے عقب میں لے آئی۔ اب ہمیں مارکو کے فارم کی اکلوتی روشنی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کشتی جیسے جیسے جزیرے کے عقبی ساحل کے قریب ہو رہی تھی کنارے کے اونچے نیچے ٹیلوں کے ہیولے بھی ہمارے قریب آتے جا رہے تھے۔ برانڈی

نے مجھے گرم کر دیا تھا اور میرے حوصلے بھی بلند کر دیے تھے۔ میرے دل سے اس خطرناک مشن کا سارا خوف دور ہو چکا تھا۔ اب سمندر سے بھی مجھے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔

ساشی کشتی کو بڑی احتیاط سے چلا رہی تھی کہ چپوؤں کی آواز تو بالکل پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اب ہم ساحل کے قریب آ گئے۔ یہاں اندھیرا تھا۔ ساشی نے دھیمی آواز میں ایک طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں وہ بلند چٹانیں ہیں، ہمیں وہیں جانا ہے۔"

کشتی ساحل کے ساتھ تھوڑا سا گھومی تو درختوں کے عقب میں اچانک دو بہت بڑی اور اونچی چٹانیں نظر آ گئیں۔ ان کے درمیان اندھیرے میں خلا سا تھا۔ اب ہماری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں اور تھوڑا بہت نظر آنے لگا تھا۔ ساشی نے جلدی سے کشتی ایک طرف کو گھمائی اور جہاں بلند درختوں کا جھنڈ تھا، وہاں کنارے پر لا کھڑی کر دی۔ سمندری موجوں کی چٹانوں سے ٹکرانے کی آواز، تیز ہوا، اندھیری سرد رات اور سامنے کھڑی دیو ہیکل چٹانیں، عجیب ڈراؤنا ماحول تھا۔

ہم دونوں نے مل کر کشتی کو ایک چھوٹی چٹان کی اوٹ میں لے جا کر پتھر کے ساتھ باندھ دیا۔ اس وقت آسمان پر بادلوں میں ہلکی سی گرج سنائی دی اور پھوار سی پڑنی شروع ہو گئی۔ ساشی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک طرف دیکھ رہی تھی۔ وہاں کسی طرف سے روشنی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے سرگوشی میں ساشی سے پوچھا کہ نتاں نے جس گودام کا ذکر کیا تھا وہ کس طرف ہوگا؟ اس کے جواب میں ساشی نے آہستہ سے کہا۔

"ریوالور جیب میں ہی رکھو مگر اسے اپنے ہاتھ کی گرفت میں لے لو۔"

میں نے سیدھا ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈال کر ریوالور پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ ساشی مجھے اشارہ کرنے کے بعد اندھیرے میں ایک طرف ذرا جھک کر چلنے لگی۔ میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہاں کہیں کہیں اونچی جھاڑیاں تھیں۔ ریتلی زمین پر چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے تھے جن پر ہم بڑی احتیاط سے پاؤں رکھتے کہ آواز پیدا نہ ہو۔

ساشی یک دم رک گئی۔ شاید اسے کوئی سراغ مل گیا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ مجھے اس کی سانس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے میرے بازو کو دبانے کے بعد ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔ وہاں کوئی روشنی نہیں تھی۔ مگر غور سے دیکھنے پر مجھے اندھیرے میں اونچی چاردیواری سی دکھائی دی۔ ساشی نے اپنے ہونٹ میرے کان کے قریب لا کر کہا۔

"یہی وہ فرنش گودام ہے۔ تم یہیں ٹھہرو، میں دیکھ کر آتی ہوں۔"

وہ بے پاؤں چلتی اندھیرے میں گم ہو گئی۔ میں وہیں بیٹھ گیا اور چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیرے میں خطرے کی بو سونگھنے کی

کوشش کرنے لگا۔ جرائم پیشہ گروہ کے سربراہ مارکو کے فارم کی وہ روشنی جو ہمیں سمندر میں دور سے نظر آئی تھی اب کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید وہ جزیرے کے جنوب درختوں کی اوٹ میں آ گئی تھی۔

مارکو پولو

اس وقت اپنے وطن پاکستان سے ہزاروں میل دور ایک دور افتادہ سمندر کے ویران جزیرے میں جرائم پیشہ لوگوں کے خطرناک ماحول میں رات کے وقت بیٹھے بیٹھے مجھے ایک دم سے لاہور کے گلی کوچے موچی دروازہ اور میکلوڈ روڈ یاد آ گئے۔ میں نے سوچا کتنے خوش قسمت ہیں لاہور کے لوگ کہ آرام سے گھروں میں سو رہے ہوں گے یا تہجد کی نماز پڑھنے کے لیے بیدار ہو گئے ہوں۔ تھوڑی دیر میں لاہور کی مسجدوں سے اذان کی آوازیں بلند ہوں گی اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور درود شریف کا ورد شروع ہو جائے گا۔ ایک میں ہوں کہ موت کے منہ میں بیٹھا ہوں اور کوئی پتہ نہیں آگے کیا ہونے والا ہے۔ پھر میں نے اپنے آپ سے کہا کہ ایڈونچر بھی تو اسی طرح ہوتے ہیں۔ جن زندہ قوموں کے افراد نے نئے نئے ملک اور براعظم دریافت کئے تھے اگر وہ بھی اسی طرح گھروں میں سوئے رہتے اور بھاٹی دروازے کے باہر دکان کے پھٹے پر بیٹھ کر چلغوزے کھاتے اور ایک دوسرے سے مذاق کرتے رہتے تو آج یورپ کے ملک خاص طور پر سپین، پرتگال، برطانیہ اور فرانس غریبی اور مفلسی کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوتے۔

جس شہر کی سرد رات کے پچھلے پہر میں سردی میں ٹھٹھرتا ہوا خطرناک حالات میں بیٹھا ہوں، وہ سیاح بھی اسی شہر کا رہنے والا تھا جس کا نام مارکو پولو تھا۔ یورپ امریکہ کے لوگ تو اس بہادر سیاح کو خوب جانتے ہیں مگر ہمارے ملک کے نوجوان شاید یہی جانتے ہوں گے کہ مارکو پولو کسی پولو کے کھلاڑی کا نام ہوگا۔ بہت کم نوجوانوں کو معلوم ہوگا کہ اس نوجوان مارکو پولو نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کن کٹھن حالات میں وینس سے سمرقند اور پھر وہاں سے صحرائے گوبی کو کبھی پیدل اور کبھی خچر پر بیٹھ کر عبور کیا اور کیسی کیسی مصیبتیں سہتا قدم قدم پر جان کی بازی لگاتا چین پہنچا۔ اور یوں اس نے اپنے وطن اٹلی کے لیے ایسی تجارتی راہیں کھول دیں کہ اٹلی کا ملک مالا مال ہو گیا اور ترقی کی شاہراہ پر آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ اگر وہ بھی وینس کی گلیوں میں اٹلی کی لڑکیوں کا پیچھا کرتے ہوئے اپنی جوانی ضائع کر دیتا تو آج وینس کا شہر صنعتی اعتبار سے کہاں ترقی کر سکتا تھا۔ جو لوگ محنت کرتے ہیں جن کے دل اپنے دین اور اپنے وطن کی محبت میں سرشار ہوتے ہیں اور اسی حب الوطنی کے جذبے میں ڈوب کر ترقی کی نئی نئی منزلیں دریافت کرتے ہیں، وہی اپنے وطن کا نام سربلند کرتے ہیں اور خدا بھی ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ میں لاہوری گلیوں میں گم تھا کہ مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

ویران جزیرہ

میں نے ریوالور جیب سے نکال کر اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اندھیرے میں مجھے ساشی کا ہیولا اپنی طرف بڑھتا نظر آیا۔ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں بھی تھا۔ سرگوشی میں بولی۔

"میں نے فارم کا زنانہ روم دیکھ لیا ہے۔ تاشی ضرور اسی عقوبت خانے میں قید ہوگی۔ وہاں دروازے کے باہر برآمدے میں ایک آدمی پہرہ دے رہا ہے۔"

میں نے آہستہ سے پوچھا۔ "پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

ساشی کہنے لگی۔ "اگر کسی طرح ہم اس شخص کو بے ہوش کر سکیں تو ہم گودام میں داخل ہو سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "پہلے تو ہمیں یقین ہونا چاہیے کہ تاشی اندر ہی ہے۔"

ساشی نے زور دے کر کہا۔ "مجھے پورا یقین ہے کہ تاشی اندر ہی قید ہے ورنہ باہر گارڈ نہ بیٹھا ہوتا۔ اسے اس سرد اندھیری رات میں باہر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"تو پھر اسے بے ہوش کس طرح کریں؟" میں نے ساشی سے پوچھا۔

وہ بولی۔ "اسے گولی ماری تو فائر کی آواز پر سب ہوشیار ہو جائیں گے۔ ایک ہی طریقہ ہے کہ کسی طرح پیچھے سے آ کر گارڈ کے سر پر بھاری پتھر کا وار کیا جائے۔ یہ کام میں نہیں کر سکتی۔ تم مرد ہو تم کر سکتے ہو۔"

میں سہم سا گیا۔ میں نے سوچا اگر میرے پتھر مارنے سے یہ بدمعاش بے ہوش نہ ہوا یا میرے وار کرنے سے پہلے ہی وہ خبردار ہو گیا تو وہ الٹا مجھے دبوچ لے گا۔ ہو سکتا ہے مجھ پر فائر بھی کر دے۔ مجھ پر براندی کا جو اثر تھا وہ اب تقریباً غائب ہو چکا تھا۔ مگر ساشی کے آگے میں انکار بھی نہ کر سکا۔ میں نے اتنا ضرور کہا کہ اس میں یہ خطرہ بھی ہے کہ گارڈ میرے قدموں کی آہٹ سن کر ہوشیار ہو جائے۔ اس کے پاس ضرور پستول وغیرہ بھی ہوگا۔ ساشی نے مجھے کندھے سے پکڑ کر آہستہ سے جھنجھوڑا اور سرگوشی میں بولی۔

"تم مرد ہو کر ایسی باتیں کرتے ہو؟"

یہ میری مردانگی کی توہین تھی۔ میں نے گردن تان کر کہا۔

"میں نے کب انکار کیا ہے۔ چلو مجھے موقع پر لے چلو۔"

ساشی اندھیرے میں چلتی مجھے گودام کے پیچھے لے گئی۔ اب ہم پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے تھے۔ اس نے اندھیرے میں ہی ایک طرف اشارہ کیا اور میرے کان کے بالکل قریب ہونٹ لا کر سرگوشی کی۔ "دائیں جانب برآمدے میں گارڈ بیٹھا ہے۔ میرا خیال ہے اس نے گود میں شاٹ گن رکھی ہوئی ہے۔ تم کوئی پتھر اٹھا لو۔"

مجھ پر بڑا کٹھن وقت آن پڑا تھا۔ جو کام میں نہیں کرنا چاہتا تھا وہ مجھے کرنا پڑ رہا تھا۔ ساشی نے ہاتھ سے مجھے آگے دھکیلا اور خود وہیں بیٹھ گئی۔ دنوں میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد بجلی کی گرج سنائی دے جاتی تھی، اور پھوار اسی طرح پڑ رہی تھی۔ ہوا بھی سرد اور تیز ہو گئی تھی۔ سمندر کی جانب سے موجوں کے چٹانوں سے ٹکرانے کی دھیمی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اس خیال سے اپنے آپ کو حوصلہ دیا اور میں ایک مظلوم لڑکی کی بہتری کے لیے یہ کام کر رہا ہوں۔ وہیں بیٹھ کر چلتے ہوئے میں نے ایک بڑا سا گول پتھر اٹھا لیا۔ یہ پتھر اگر میں پوری طاقت سے پہرہ دینے والے بدمعاش کے سر پر پیچھے سے آ کر ماروں تو وہ بے ہوش ضرور ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے مر بھی جائے۔ ساشی نے بتایا تھا کہ گارڈ نے سر پر کوئی ٹوپی پہن رکھی ہے۔ میں نے خدا کا نام لیا اور گودام کی دیوار کے ساتھ ساتھ جوں کی چال چلتا ہوا دوسری طرف آ گیا۔

دیوار کے کونے میں سے میں نے ذرا سا باہر نکال کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ ایک انسانی ہیولا مجھے نظر آیا جو برآمدے میں لکڑی کے ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر شاید کرسی یا کسی سٹول پر بیٹھا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس نے اپنا سر ستون کے ساتھ لگا رکھا ہے۔ میں دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ یہ بدمعاش سو رہا ہو یا کم از کم اونگھ ہی رہا ہو۔ میں نے غور سے دیکھا۔ اندھیرے میں مجھے اتنا نظر آ گیا کہ گارڈ کے پیچھے برآمدے میں کافی جگہ تھی۔ مجھے دبے پاؤں اس جگہ پر سے گزر کر گارڈ کے پیچھے پہنچنا تھا۔ یہ بڑا خطرناک کام تھا۔ اگر وہ جاگ رہا ہے تو برآمدے میں میرے قدموں کی آہٹ پر چونک سکتا ہے۔ میں دس پندرہ سیکنڈ تک وہیں کھڑا گارڈ کا جائزہ لیتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ستون کے ساتھ سر لگائے بے حس بیٹھا ہے اور کوئی حرکت نہیں کر رہا۔

میرے پاؤں میں جوگر شوز تھے جن کی آواز پیدا نہیں ہوتی۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور پتھر ہاتھوں میں لیے برآمدے پر چڑھ گیا جو زمین سے تین فٹ بلند تھا۔ برآمدے کے لکڑی کے فرش پر آتے ہی وہیں سانس روک کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں سانپ کی آنکھوں کی طرح پہرے دار کے ہیولے پر جمی ہوئی تھیں۔ واقعی وہ کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ اس نے لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ جو گھٹنوں سے نیچے برآمدے کے فرش تک آیا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر تھے جہاں ساشی کے بقول یقیناً شاٹ گن رکھی ہوئی تھی۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ صبح ہو گئی اور روشنی پھیلنے لگی تو ہمارا مشن ناکام ہی نہیں ہو گا بلکہ ہم بھی پکڑے جائیں گے اور ہمیں وہیں شوٹ کر دیا جائے گا۔ ہمیں اس سے بھی وقت مل رہا تھا کہ یورپ میں سردیوں کے موسم میں سورج دیر سے طلوع ہوتا ہے۔ صبح چھ سات بجے رات کا اندھیرا ہی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ہم مزید وقت ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے برآمدے کے فرش پر بیٹھ کر آگے کھسکنا شروع کر دیا۔ گول چوڑا پتھر میرے دونوں ہاتھوں میں تھا۔

جیسے جیسے میں اونگھتے ہوئے، سوئے ہوئے یا جاگتے ہوئے پہرے دار کے قریب ہو رہا تھا، مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں موت کے

قریب ہو رہا ہوں۔ میں کوئی تربیت یافتہ کمانڈو نہیں تھا کہ بڑی مہارت سے سانپ کی طرح رینگتا ہوا ٹارگٹ پر جا پہنچتا اور چیتے کی طرح اچھل کر پہرے دار کی گردن میں بازو ڈال کر تربیت کے مطابق ایک ہی جھٹکے میں گردن کا منکا توڑ ڈالتا۔ میں تو لاہور کا رہنے والا ایک نارمل نوجوان تھا۔ اپنے ٹارگٹ کی طرف بھی بڑھ رہا تھا اور ڈر بھی رہا تھا۔ میرا سانس خوف کے مارے پھول گیا تھا حالانکہ میں چیونٹی سے بھی کم رفتار کے ساتھ فرش پر گھسٹ رہا تھا۔ مگر اس وقت میرے حواس ضرور بیدار تھے اور دل میں یہ خیال حاوی ہو چکا تھا کہ اگر میں ذرا سا بھی چوک گیا تو پھر میری موت یقینی ہے۔ کیونکہ ریوالور میری جیکٹ کی جیب میں تھا اور میں اسے اتنی پھرتی سے نہیں نکال سکتا تھا جس پھرتی سے کمانڈو ٹائپ کے فلموں کے ہیرو پستول نکال لیتے ہیں۔ میں تو بالکل آپ لوگوں کی طرح سیدھا سادا بندہ تھا۔ بس کسی نہ کسی وجہ سے اس مشکل میں پھنس گیا تھا۔ بلکہ اب تو موت کے منہ میں آ چکا تھا۔

اچانک پہرے دار نے گہرا سانس لیا اور سٹول پر پہلو بدلا۔ میں تو وہیں سن ہو کر فرش کے ساتھ لگ گیا۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ خطرہ تھا کہ کہیں پہرے دار میرے دل کی دھڑکن نہ سن لے۔ پہرے دار نے پہلو بدل کر اپنا سر ستون کے ساتھ لگا دیا۔ میں پتھر کی طرح فرش پر جہاں پڑا تھا وہیں پڑا رہا۔ ایک پتھر میں بن چکا تھا اور دوسرا پتھر میں نے ہتھیلیوں میں تھام کر ہتھیلیاں فرش کے ساتھ لگا رکھی تھیں۔ میری خوش قسمتی اور پہرے دار کی بدقسمتی سے مجھے اس کے ہلکے سے خراٹے کی آواز سنائی دی۔ میں شیر بن گیا۔ پہرے دار سو رہا تھا۔ میں تیزی سے گھسٹتا ہوا سٹول کے قریب گیا اور جس پھرتی کا میں نے مظاہرہ کیا اس پر آج بھی جب میں اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو مجھے سخت حیرت ہوتی ہے۔ میں سٹول کے پیچھے آتے ہی یک دم سے اٹھا اور دونوں ہاتھوں میں پتھر لے کر پوری طاقت سے اس کے سر پر مار دیا۔ میں نے گھبراہٹ میں اتنی زور سے پتھر مارا کہ پہرے دار بھی سٹول سے نیچے گر پڑا اور اس کے ساتھ میں بھی فرش پر گر پڑا۔ تب میں نے اپنی جان بچانے کے واسطے جلدی سے جیکٹ میں سے ریوالور نکال لیا۔ میں نے وہیں فرش پر بیٹھے بیٹھے اپنی نظریں پہرے دار پر جما دیں۔ وہ بے حس پڑا تھا۔ مجھے حوصلہ ہوا۔ اٹھ کر پہلا کام یہ کیا کہ اس کے گھٹنوں پر سے پھسل کر جو شال نیچے گر پڑی تھی اسے اٹھایا پھر جھک کر غور سے پہرے دار کی شکل دیکھی۔ اس کی ہلکی ہلکی داڑھی اور مونچھیں تھیں۔ سر پر اونی ٹوپی تھی۔ میں نے ٹوپی کو ہاتھ لگایا تو میری انگلیاں خون سے گیلی ہو گئیں۔

ساشی دیوار کے ساتھ لگی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں بھاگتی ہوئی میرے پاس آ کر جھک گئی۔ اس نے بھی جھک کر غور سے پہرے دار کے چہرے کو دیکھا۔ پھر اس کی نبض دیکھی اور سرگوشی میں کہا۔

"شاید یہ مر چکا ہے۔۔۔۔۔۔۔ اسے چھوڑو میرے ساتھ آؤ۔"

پیچھے گودام کا دروازہ تھا جو بند تھا۔ ہم نے اندھیرے میں ٹٹول کر دیکھا۔ دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ ساشی نے مجھ سے شاٹ گن لے لی اور اس کی نال تالے کے کنڈے کے اندر ڈال کر دونوں ہاتھوں سے دستے کو پکڑ کر پوری طاقت سے ایک طرف کھینچا۔ تالے کا کنڈا کھٹک کی آواز کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ ہم دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ اندر بھی اندھیرا تھا۔ ساشی نے دروازہ پیچھے بند کر دیا تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں ثنائی کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ ساشی نے جیب سے لائٹر نکال کر جلایا۔ لائٹر کے شعلے کی روشنی میں ہمیں دیوار کے ساتھ لگی ایک کیمپ کارٹ نظر آئی جس پر ایک انسانی ہیولا کمبل میں لپٹا پڑا تھا۔

ساشی نے مجھے ہاتھ سے پیچھے کر دیا اور کان میں کہا۔

”ریوالور ہاتھ میں رکھنا۔“

یہ کہہ کر ساشی نے ایک بار پھر لائٹر جلایا۔ کیمپ کارٹ کے قریب گئی اور کمبل ذرا سا ہٹایا۔ اس نے ثنائی کا چہرہ دیکھتے ہی کمبل جلدی سے پیچھے ہٹا دیا اور اسے ہلاتے ہوئے کہا۔

”ثنائی۔۔۔۔۔۔۔ میں ساشی ہوں، جلدی سے اٹھو جلدی کرو۔“

ثنائی ایک دم سے اٹھ بیٹھی۔ لائٹر کی روشنی میں مجھے اس کا اترا ہوا چہرہ صاف نظر آ گیا۔ اس کی ایک آنکھ کالی تھی اور سوجی ہوئی تھی ضرور اس پر تشدد کیا گیا تھا۔ ثنائی کو ساشی نے سہارا دے کر اٹھایا۔ ثنائی نے جین پہن رکھی تھی اور پاؤں میں جوگر شوز تھے۔ وہ جوتوں سمیت کارٹ پر پڑی تھی۔ ساشی نے کہا۔

”تمہیں اپنے پاؤں پر چلنا ہوگا، جلدی کرو۔“

ثنائی نے مجھے بھی دیکھ لیا تھا۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے ثنائی نے میرے کاندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ساشی نے دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ باہر اندھیرا تھا۔ فرش پر پہرے دار کی لاش پڑی تھی یا وہ بے ہوش پڑا تھا۔ ہم تیزی سے برآمدے میں سے گزرتے ہوئے دوسری طرف پتھروں میں اتر گئے۔ ساشی آگے آگے تھی۔ ثنائی پیچھے پیچھے تھی۔ میں ثنائی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

اب ہم سمندری چٹانوں کی طرف تقریباً بھاگ رہے تھے۔ ہم جتنی جلدی ہو سکے سمندر کے کنارے اسی جگہ پہنچنا چاہتے تھے جہاں ہماری کشتی پتھر کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ ثنائی بھاگتے ہوئے ایک بار لڑکھڑا گئی۔ میں نے جلدی سے اسے سنبھال لیا۔ اس نے اطالوی زبان میں مجھے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ابھی تک ثنائی کے فرار کا کسی کو علم نہیں ہوا تھا۔ آسمان بادلوں سے بدستور ڈھکا ہوا تھا اور پھوار پڑ رہی تھی۔ بارش پوری طرح سے تھم نہیں ہوئی تھی۔ ہم چٹانوں کے قریب سے ایک طرف کو گھوم گئے۔ ساشی

نے جلدی سے کشتی کھولی اور ستاں کو سہارا دے کر اس میں بٹھایا۔ پھر میں اور ساشی بھی کشتی میں سوار ہو گئے۔ ساشی چپو ہاتھوں میں تھام کر کشتی کے کونے میں بیٹھی اور کشتی کو سمندر کی ایک لہر کے اوپر ڈال دیا۔ سمندر کی لہر ہماری کشتی کو کنارے سے اٹھا کر لے گئی۔ ساشی تیز تیز چپو چلانے لگی۔ اس نے کشتی کا رخ پیچھے کی طرف موڑ دیا۔ ستاں کشتی کے فرش پر دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے سمٹ کر بیٹھی تھی۔ میں بھی اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ آسمان کے مشرقی کناروں پر جو بادل تھے ان میں دھیمی دھیمی صبح کاذب کی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔

ساشی بڑی ہمت کے ساتھ چپو چلا رہی تھی۔ یہ اس کی کشتی چلانے کی مہارت تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں ہم بدمعاش مارکو کے فارم کے پہلو سے نکل کر کھلے سمندر میں آ گئے۔ ایک بار پھر ہمیں فارم کی بلوریں روشنی نظر آنے لگی۔ میں نے ساشی سے کہا۔

"تم یہاں آ جاؤ۔ میں کشتی چلاتا ہوں۔"

ساشی نے کہا۔ "تم ستاں کے پاس بیٹھے رہو۔"

ساشی جانتی تھی کہ میں اچھی طرح کشتی نہیں چلا سکوں گا۔ اب کشتی تیزی سے جنوبی کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بدمعاش مارکو کے فارم کی روشنی دور ہوتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد فش مارکیٹ کی روشنیاں قریب آنا شروع ہو گئیں۔ ستاں میرے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے۔ وہ ایک بار کپکپائی تو میں نے اسے کہا کہ میری جیکٹ بھی پہن لو۔ اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا۔ "نہیں نہیں" مجھے چاہیے تھا کہ میں اس کے گرد بازو ڈال کر اسے اپنے ساتھ لگا لیتا لیکن میری مشرقی حیا داری اور جھجک نے مجھے ایسا نہ کرنے دیا۔ ستاں میرے ساتھ لگی سردی سے کانپ رہی تھی۔ آخر میں نے مجبور ہو کر اپنا بازو اس کے گرد ڈال دیا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ساشی دیوانہ وار جتنی تیز چپو چلا سکتی تھی، چلا رہی تھی۔ آخر ہم فش مارکیٹ کے قریب پہنچ گئے۔ ساشی نے کشتی کو دور سے ایک طرف گھما دیا۔ کشتی کنارے کی ریت پر چڑھ گئی۔ ساشی چھلانگ لگا کر کشتی سے اتری اور میرا نام لے کر بولی۔ "میرے ساتھ کشتی کو اوپر کھینچو۔"

ہم دونوں نے زور لگا کر کشتی کو ریت پر کھینچ لیا۔ ہمیں کشتی کو مزید آگے چبوترے کی طرف لے جانا چاہیے تھا جہاں سے ہم کشتی کو لے کر چلے تھے۔ وہاں سمندر چبوترے تک آیا ہوا تھا، مگر گھبراہٹ میں ساشی نے ادھر پیچھے ہی کشتی لگا دی۔ کشتی کو ہم نے وہیں ایک پتھر کے ساتھ باندھ دیا۔ ساشی نے ستاں کو سہارا دے کر کشتی سے باہر نکالا اور اس کا ماتھا چوم کر بولی۔ "ستاں! خدا کا شکر ہے ہم تمہیں لے آئے۔"

ستاں پر نقاہت طاری تھی۔ سردی اور کمزوری سے اس کے دانت بج رہے تھے۔ ساشی نے جلدی سے اپنا اوورکوٹ اسے اوڑھا دیا اور ہم اسے سہارا دے کر فش مارکیٹ کی دوسری جانب سے سڑک پر لے آئے۔ دن نکلنے میں اب زیادہ وقت باقی نہیں رہا تھا۔ سڑک پر دو ٹرک آگے پیچھے چلتے فش مارکیٹ میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ سڑک غیر آباد اور چھوٹی سی تھی۔ ساشی کہنے لگی۔

”یہاں تمہیں ٹیکسی نہیں ملے گی۔ تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ میں دوسری سڑک پر سے ٹیکسی لے کر آتی ہوں۔“

ساشی ہمیں وہیں چھوڑ کر تیز تیز قدموں سے سڑک کی دوسری طرف چلی گئی۔ اب میں اور ستالی وہاں اکیلے تھے۔ ساشی کے اوور کوٹ نے ستالی کی سردی کافی حد تک روک دی تھی۔ چند قدموں کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا پتھر کا چبوترہ تھا۔ یہاں لیمپ پوسٹ کی روشنی تھی۔ ہم چبوترے کے کنارے پر بیٹھ گئے۔ ستالی نے اطالوی میں کہا۔ ”مجھے یقین تھا' ساشی کے تم ضرور آؤ گے۔“

میں نے انگریزی میں کہا۔ ”تمہارا رقعہ مجھے مل گیا تھا پھر میں کیسے آرام سے بیٹھ سکتا تھا۔“

ستالی نے بیٹھے بیٹھے اپنا بھیگے ہوئے بالوں والا سر میرے کاندھے کے ساتھ لگا دیا۔ میں نے کہا۔ ”تمہاری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔ تمہیں انہوں نے مارا پیٹا تھا؟“

ستالی نے کوئی جواب نہ دیا' وہ خاموش رہی۔ پھر مجھے صبح کی دھندلی روشنی میں اس کی سسکی کی آواز سنائی دی۔ وہ رونے لگی تھی۔ ہم مشرق میں رہنے والے لوگ عورت سے ویسے ہی بڑے متاثر ہو جاتے ہیں۔ جوانی میں تو کوئی لڑکی ذرا ہنس کر بات کرے تو ہم یہی سمجھتے ہیں کہ اسے ہم سے محبت ہو گئی ہے۔ اور وہ اگر ہمارے پاس بیٹھ کر ذرا سا آنسو بہا دے تو پھر تو ہم فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر زندگی بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں کھانی شروع کر دیتے ہیں۔ اگرچہ میں اب یورپ کی معاشرتی فضاؤں کا عادی ہو چلا تھا۔ مجھے علم ہو چکا تھا کہ مغربی معاشرے میں اگر کوئی عورت آپ کے ساتھ لگ کر بیٹھ جائے' آپ کا منہ چوم لے یا آپ کے سامنے رو بھی دے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ وہ آپ سے محبت کرنے لگی ہے۔ مگر ستالی میری کمزوری سے بنتی جا رہی تھی۔ دوسری اطالوی عورتوں میں بہت سی باتیں ہماری مشرقی عورتوں سے ملتی جلتی تھیں۔ ستالی بھی بڑے گہرے جذبات والی لڑکی تھی۔ ہم کبھی ایک دوسرے سے دیر تک نہیں ملے تھے' پھر بھی مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں اور ستالی ایک بار نہیں' ہزار بار پہلے بھی ایک دوسرے سے مل چکے ہیں اور اگر میں روایتی بات کروں تو یہ کہوں گا کہ جیسے ہم جنم جنم میں ایک دوسرے کے ساتھ رہ چکے ہیں۔

اس وقت تک میں کئی لڑکیوں سے مل چکا تھا اور مجھے اتنا تجربہ ہو گیا تھا کہ میں لڑکی کو دیکھ کر یا اس سے بات کر کے اس کے دل کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا۔ ستالی کے بارے میں میرا تجربہ اور میری عقل اور میرا دل تینوں اس بات پر متفق تھے کہ ستالی دل کی نیک اور شریف لڑکی ہے۔ ماحول نے اور غلط صحبتوں نے اسے غلط راستے پر ڈال دیا ہے۔ یہ اس کے کردار کی شرافت تھی کہ وہ جرائم پیشہ لوگوں کے ماحول کو چھوڑ کر شریفانہ زندگی کی طرف لوٹ آنا چاہتی تھی۔ حالانکہ اس ماحول میں کام کرنے والی دوسری لڑکیاں عیش کر رہی تھیں۔ اونچی سوسائٹی سے ان کا ملنا جلنا تھا۔ ان کے پرس میں یورپ کی حسین ترین سیرگاہوں کے ٹکٹ اور کریڈٹ کارڈ ہوتے تھے۔ ستالی کے اسی احساس گناہ اور اچھی شریفانہ زندگی کے عزم نے مجھے اس کی طرف متوجہ کر دیا تھا اور میں نے اس کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔

اگرچہ جان کی بازی لگاتے ہوئے میں آخری وقت تک ہچکچا رہا تھا' اسے آپ میری کمینگی سمجھ لیں یا خود غرضی کہہ لیجیے کہ میں ستانی سے وہ پردہ محبت کرتے ہوئے بھی اس کی خاطر جان کی بازی لگانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ انسان میں کمزوریاں تو ہوتی ہی ہیں' میرے اندر کمزوریاں اور کمینگیاں کچھ زیادہ ہی ہیں۔ ہو سکتا ہے دوسرے لوگوں میں بھی ہوں اور وہ انہیں تسلیم نہ کرتے ہوں مگر میں نے آپ سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ میں اپنے سفرنامے میں جھوٹ نہیں بولوں گا' چنانچہ میں اپنی تمام کمزوریوں کو قبول کرتا ہوں۔

اتنے میں ساشی ٹیکسی لے کر آ گئی۔

ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ساشی ہمیں سیدھا اپنے شہر کی گلیوں والے بوسیدہ سے فلیٹ میں لے گئی۔ یہاں آتے ہی ستانی نے گرم پانی سے غسل کیا۔ ساشی نے اس کی سوجی ہوئی آنکھ پر دوائی لگائی اور اسے ناشتہ کرایا۔ پھر اسے اپنے بستر میں لٹا کر اوپر دو گرم کمبل ڈال دیے اور کہا۔ "ستانی اب تم آرام کرو۔"

نہا دھو کر ستانی کا چہرہ نکھر آیا تھا۔ اگرچہ اس کی ایک آنکھ پر نیل پڑا تھا اور سوجی ہوئی بھی تھی مگر اس حلیے میں بھی وہ مجھے خوبصورت لگ رہی تھی۔ یہ بھی ایک طرح سے میری کمزوری ہی تھی۔ ستانی نے منہ دیوار کی طرف کرتے ہوئے ایک نظر دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں میرے لیے ممنونیت کا اظہار تھا۔ وہ ذرا سا مسکرائی بھی تھی۔ ساشی نے مجھے ساتھ والے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کمرے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ یہ کمرہ نہیں تھا بلکہ چھوٹا سا سٹور روم تھا۔ یہاں زمین پر دو میٹرس جوڑ کر بچھا دیے گئے تھے۔ ایک چھوٹی سی کھڑکی دوسری طرف کھلتی تھی۔ پرانے کپڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ میٹرس پر کوئی کمبل یا چادر وغیرہ نہیں تھی۔ ایک کلوزٹ تھا جس کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ اس میں سے بھی اندر ٹنگے ہوئے پرانے کپڑے نظر آ رہے تھے۔ ساشی نے پٹ بند کر دیا اور میٹرس پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک کمبل اپنے اوپر کر لیا۔ ایش ٹرے وہ دوسرے کمرے سے اپنے ساتھ ہی لے آئی تھی۔

"تم بھی وہ کمبل اٹھا کر لے آؤ۔ ہم دونوں ساری رات کے جاگے ہوئے ہیں' تھوڑی دیر باتیں کریں گے پھر سو جائیں گے۔"

میں نے بھی کپڑوں کے انبار کے اوپر پڑا کمبل اٹھا کر اپنے اوپر کر لیا اور دیوار سے ٹیک لگا دی۔ ہم دونوں نے سگریٹ لگا لیے تھے۔ بہت جلد کمرہ سگریٹوں کے دھوئیں سے بھر گیا۔ ساشی نے اٹھ کر گلی والی کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیا۔ کھڑکی کے کھلتے ہی سرد ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ کمرے میں کمزور روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ کھڑکی کا پٹ کھلا تو باہر کی دھندلی سی روشنی دکھائی دی اور ساتھ ہی بارش کی بوندا باندی کی بھی آواز آنے لگی۔ میں نے ساشی سے کہا۔ "دوسری طرف گلی میں نہر ہے کیا؟" کیونکہ مجھے بارش کے قطروں کے پانی میں گرنے کی آواز آ رہی تھی۔

ساشی نے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں' دوسری طرف نہر بہہ رہی ہے مگر یہ بہت چھوٹی ہے اس میں کشتیاں نہیں گزرتیں۔ لوگ اس طرف مکانوں

کی کھڑکیوں سے کود کر نکل سکتے ہیں۔''

وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم واقعی بڑے بہادر ہو۔ ستالی نے تمہیں ٹھیک پہچانا ہے۔ تم نے برآمدے میں بیٹھے ہوئے بدمعاش پر کچھ زیادہ ہی زور سے وار کر دیا۔ میرا خیال ہے وہ زندہ نہیں بچا ہوگا لیکن تم فکر مت کرو۔ ان غنڈوں میں سے کوئی غنڈہ ایسا نہیں ہے جس نے چھ سات خون نہ کیے ہوں۔ اگر پولیس کو پتہ چل جائے تو وہ تمہیں ضرور انعام دے گی۔''

مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کہیں میری وجہ سے ایک بے گناہ انسان نہ مارا گیا ہو۔ جب ساشی نے بتایا کہ یہ لوگ کئی کئی خون کر چکے ہیں تو میرا ضمیر کافی حد تک مطمئن ہو گیا۔ سگریٹ ختم کر کے ساشی نے کہا۔ ''میں کافی بنا کر لاتی ہوں میرا دل کافی پینے کو چاہ رہا ہے۔۔۔۔۔۔ تمہارے لیے بھی لاؤں؟''

مجھے بھی نیند آ رہی تھی میں نے کہہ دیا۔

''ہاں ایک مگ میرے لیے بھی لے آنا۔''

ساشی چلی گئی اور میں آنکھیں بند کر کے رات کے واقعات پر غور کرنے لگا۔ واقعی یہ سب کچھ کسی انگریزی ایکشن فلم کی طرح ہی ہو گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ میں نے اتنا خطرناک ایڈونچر کیا ہے۔ مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ خدا نے مجھے کامیاب و کامران کیا تھا۔ یقیناً یہ مجھے میری نیت کا پھل ملا تھا۔ کیونکہ میں نیک نیتی سے ستالی کو غنڈوں کے چنگل سے نکال کر اسے نیک زندگی کی راہ پر ڈالنا چاہتا تھا۔ میں اس سے محبت کرتا تھا یا نہیں یہ ایک الگ بات تھی۔

تھوڑی دیر میں ساشی آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں کافی کے مگ تھے۔ ہم بیٹھ کر کافی پینے اور باتیں کرنے لگے۔ اس نے کہا۔ ''ستالی سو رہی ہے خدا جانے اس کے ساتھ ان بدمعاشوں نے کتنا تشدد کیا ہوگا۔''

میرے دل میں جو اندیشہ تھا میں نے اس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ لوگ اس کی تلاش میں ضرور اپنے آدمی دوڑائیں گے۔ اب تو ان کا ایک آدمی بھی قتل ہو گیا ہے۔''

ساشی نے کافی کا گرم مگ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ کہنے لگی۔ ''ان میں سے کسی کو میرے ٹھکانے کا علم نہیں ہے اور پھر میرے بارے میں وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں ان کے ایک آدمی کو مار کر ستالی کو وہاں سے نکال لے جاؤں گی۔''

میں نے پوچھا۔ ''اب ستالی کیا تمہارے پاس ہی رہے گی؟''

وہ بولی۔ ''نہیں اس کا زیادہ دیر یہاں رہنا بھی ٹھیک نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''وہ اپنے ماں باپ کے پاس کیوں نہیں چلی جاتی؟''

"اس کے ماں باپ مر چکے ہیں۔ ایک بھائی کہیں پیرس میں دھکے کھاتا پھرتا ہے۔ اس دنیا میں وہ اکیلی ہے۔ ایسی لڑکیاں ہی ان بدمعاشوں کے چنگل میں آسانی سے پھنس جاتی ہیں۔"

"اور ستانی کا خاوند ۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ کہاں ہوتا ہے؟"

ساشی کے چہرے پر نفرت کے تاثرات ابھر آئے اور بولی۔ "اس کمینے نے تو اس بے چاری کی زندگی برباد کی ہے۔ ستانی نے تو اس سے طلاق لے لی تھی۔ وہ ذلیل آدمی سنا ہے امریکہ چلا گیا تھا۔"

"تو پھر ستانی کا کیا بنے گا؟"

ساشی نے کندھوں کو سکیڑتے ہوئے کہا۔ "میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ستانی نے بھی خود کچھ نہ کچھ سوچ رکھا ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ اٹلی چھوڑ کر پیرس یا ڈنمارک چلی جائے۔ اتنا میں ضرور جانتی ہوں کہ اب وہ اٹلی میں نہیں رہ سکتی۔ وہ اس ملک میں جہاں بھی ہوگی' جس کونے میں بھی چھپی ہوگی' مارکو کے آدمی اسے ڈھونڈ کر قتل کر دیں گے۔"

میں نے کہا۔ "اگر انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ تم ستانی کو نکال کر لے گئی تھی' پھر کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا ۔۔۔۔۔۔۔ جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔ میں بھی کوئی کمزور اور شریف عورت نہیں ہوں۔ میرے پاس بھی بھرا ہوا ریوالور ہر وقت موجود رہتا ہے' میں ان غنڈوں کا مقابلہ کروں گی۔"

میں نے ساشی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ستانی پولیس کے پاس کیوں نہیں چلی جاتی۔ پولیس ضرور اس کی مدد کرے گی اور ان سب غنڈوں کو گرفتار کرے گی۔"

ساشی مسکرائی۔ "تم اس شہر کی آب و ہوا سے ابھی پوری طرح واقف نہیں ہوئے۔ یہاں پولیس بھی مافیا کے ماتحت ہے۔ پولیس کے بڑے سے بڑا افسر ان کا تنخواہ دار ملازم ہوتا ہے۔ وہ ان بدمعاشوں کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ بلکہ پولیس تو مافیا کے لیے جاسوسی کرتی ہے۔ ستانی اگر پولیس کے پاس پناہ لینے چلی جائے تو یقین کرو پولیس اسے پکڑ کر مارکو بدمعاش کے پاس پہنچا دے گی۔"

کھڑکی میں سے سرد ہوا اب بدن کو چھیڑنے لگی تھی۔ میں نے ساشی سے پوچھا۔ "کھڑکی بند کر دوں؟"

ساشی نے کافی کا مگ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں ۔۔۔۔۔۔۔ اور بتی بھی بجھا دو۔ مجھے نیند آ رہی ہے تم بھی سو جاؤ۔"

تیرے پہلو میں

ساشی نے اپنے آپ کو کمبل میں اچھی طرح لپیٹا اور دوسری طرف منہ کر کے لیٹ گئی۔ میں بھی اپنے کمبل میں گھس گیا۔ اگرچہ میں ساری رات کا جاگا اور موت کے ایڈونچر کی وجہ سے تھکا ہوا تھا مگر میری نیند غائب ہو گئی تھی۔ آنکھیں جل رہی تھیں مگر نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس

کی وجہ صرف یہی تھی کہ ایک نوجوان ڈانسر ٹائپ کی لڑکی میرے بالکل ساتھ کمبل میں سمٹی ہوئی تھی۔ بند کھڑکی کے باہر بڑے زور کی بارش شروع ہوگئی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ یہ ایک باد و باراں کا طوفان تھا۔ ایسا ہی ایک طوفان میرے اندر برپا تھا۔ اگر میں یورپ میں پیدا ہوا ہوتا اور وہاں کے ماحول میں پل کر بڑھا ہوا ہوتا تو شاید میں بھی سو جاتا اور میرے جذبات میں وہ ہیجان پیدا نہ ہوتا جو اس وقت پیدا ہو چکا تھا۔ کیونکہ یورپ کے ماحول میں اگر ایک آزاد خیالی اور گناہ کے ماحول میں زندگی بسر کرنے والی لڑکی بھی کسی لڑکے سے یہ کہے کہ تم بھی سو جاؤ میں بھی سو رہی ہوں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ہم دونوں کو سو جانا چاہیے اس کے سوا کچھ اور نہیں کرنا چاہیے۔ اور وہ دونوں پھر واقعی سو جاتے ہیں اور ان کے جذبات میں ایسا ہیجان پیدا نہیں ہوتا جو میرے دل میں پیدا ہو رہا تھا۔ اس قسم کے جذباتی ہیجانات کے لیے ان مغربی ممالک کے سرد لوگوں نے ایک الگ وقت رکھا ہوتا ہے۔ میں یورپ کے سرد ماحول میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود مجھے معلوم تھا کہ مجھ پر یہاں کی سماجی حد بندیوں کے مطابق ایک حد عائد ہوتی ہے اور مجھے اس حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ مغربی ماحول میں اس قسم کی تجاوزات کو سخت ناپسند کیا جاتا ہے اور وہاں کی طوائف بھی اپنی عزت بچانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

آخر مجھ پر نیند کا غلبہ طاری ہوگیا اور میں سو گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو نہ بارش کی آواز تھی نہ بادل گرج رہے تھے۔ بند کھڑکی کی جھریوں میں سے دن کی پھیکی پھیکی سی روشنی تنگ و تاریک کمرے کو روشن کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ساشی اسی طرح ایک پہلو پر سمٹی گہری نیند سو رہی تھی۔ مجھے اس کے ہلکے ہلکے خراٹے لینے کی آواز سنائی دی۔ عورت کے خراٹے مجھے بڑے برے لگتے ہیں ------ عورت بڑی نازک اور لطیف چیز ہے کہ نہ منہ میں سے کھانا کھاتے دیکھ سکتا ہوں اور نہ اس کے خراٹے سن سکتا ہوں۔ مگر نیگرو لڑکی ساشی بڑی ایک خاص تان کے ساتھ خراٹے لے رہی تھی۔ میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں آگیا۔ یہاں ابھی دیوار کے ساتھ لگا بلب روشن تھا مگر بند کھڑکی کے شیشوں میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔

نتالی بھی گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کا چہرہ کمبل میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ دوپہر کے تین بجنے والے تھے۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ نتالی بالکل خراٹے نہیں لے رہی تھی۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ جس لڑکی کو میں پسند کرتا ہوں یا اس سے محبت کرتا ہوں وہ خراٹے نہیں لیتی۔ میرے چلنے پھرنے سے نتالی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے نیند بھری آواز میں پوچھا۔ ”کون؟“

میں نے اپنا نام لیا تو اس نے کمبل چہرے سے ہٹا لیا اور اٹھ کر پلنگ کی آہنی ریلنگ سے ٹیک لگا لی۔ میں اس کے پاس پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔

”اب کیسی طبیعت ہے نتالی؟“

نتالی نے اپنا ہاتھ کمبل سے نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ مجھ سے زیادہ تر انگریزی میں ہی بات کرتی تھی۔ اس نے کہا۔ ”میں جلد

ٹھیک ہو جاؤں گی۔ تم میری نیکی کے ساتھ مل کر مجھے جہنم سے نکال لائے ہو۔ میں تمہارا یہ احسان۔۔۔۔۔۔"

میں نے نتالی کا جملہ مکمل نہ ہونے دیا اور اس کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ دی اور کہا۔ "میں نے وہی کیا جو مجھے ان حالات میں کرنا چاہیے تھا۔"

"ساشی! اکیلی یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تم میری ایک آواز پر میری مدد کرنے ضرور آؤ گے۔"

نتالی کی آنکھوں کی سوجن زیادہ ہو گئی تھی۔ اس نے ہلکی سی کراہ کے ساتھ اپنا ہاتھ آنکھ پر رکھ دیا۔

"انہوں نے مجھے بہت مارا پیٹا ہے۔ اگر میں ان کے لیے کار آمد نہ ہوتی تو اب تک میری لاش سمندر کی مچھلیاں کھا چکی ہوتیں۔"

دوسرے کمرے سے ساشی بھی آ گئی۔ اس نے نتالی کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ "تمہیں ہلکا بخار بھی ہے۔ میں تمہارے لیے دوائی سے کرتی ہوں۔ ابھی تم یہ گولیاں پانی سے کھا لو۔"

ساشی نے میز کے دراز میں سے گولیوں کا ایک پیکٹ نکال کر کھولا اور دو رنگ کی دو گولیاں نتالی کو کھلا دیں۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔ "میں آج کلب میں نہیں جاؤں گی۔ برونو سے کہہ دینا کہ میں بیمار ہوں۔ میرا نتالی کے پاس رہنا از حد ضروری ہے۔"

میرا بھی اب واپس سلیمان کے فلیٹ پر جانا ضروری تھا۔ میں نے نتالی سے دوسرے دن آنے کا کہا اور اجازت لے کر وہاں سے آ گیا۔

فلیٹ پر پہنچا تو سلیمان کسی لڑکی کو لے کر آیا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے آنکھ ماری۔ میں وہیں سے واپس مڑ گیا۔ شام تک وینس کے گنجان علاقے کے ایک ریستوران میں بیٹھا رہا۔ وہیں میں نے تھوڑا بہت کھانا کھایا، کافی پی اور سگریٹ پر سگریٹ پیتا رہا۔ میرے دل میں ایک نیا خوف پیدا ہو چکا تھا۔ یہ خوف ایک ایسے شریف آدمی کا خوف تھا جس کے ہاتھوں ایک آدمی قتل ہو گیا تھا۔ میں یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ مارکو کے فارم والا گارڈ جس کے سر پر میں نے پورے زور سے پتھر مارا تھا، وہ مر گیا یا زندہ ہے۔ مگر یہ بات بتانے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ ریڈیو ٹیلی ویژن اور کسی اخبار میں یہ خبر چھپ نہیں سکتی تھی۔

اتنا مجھے معلوم تھا کہ بدمعاش مارکو کے خونخوار درندے نتالی کے ساتھ ساتھ اس شخص کی تلاش میں بھی شہر کا کونا کونا چھان رہے ہوں گے جس نے گارڈ کو قتل کیا تھا یا شدید زخمی کیا تھا۔ میں دل میں خدا سے بار بار دعا مانگ رہا کہ یا اللہ پاک! وہ آدمی زخمی ہوا ہو مرا نہ ہو۔ مارکو مافیا کے لوگوں میں سے کوئی بھی میری شکل سے شناسا نہیں تھا لیکن وہ ساشی کو جانتے ہوں گے۔ ساشی کا کہنا تھا کہ انہیں اس پر شک نہیں پڑ سکتا لیکن مارکو کے آدمی اتنے بھی بے وقوف نہیں ہوں گے۔ وہ ضرور جانتے ہوں گے کہ نیگرو ڈانسر ساشی نتالی کی سہیلی ہے اور وہ اس کا پتہ کرنے رات کلب میں ضرور آئیں گے۔ وہاں جب انہیں معلوم ہو گا کہ نیگرو ڈانسر آج نہیں آئی تو ان کا شبہ یقین میں بدل جائے گا کہ ساشی ہی نے

ستانی کو کہیں چھپا رکھا ہے اور وہ اس کے نمبر کی گلیوں والے فلیٹ پر دھاوا بول دیں گے۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ میں بھی ایک طرح سے مافیا کے جال میں پھنس گیا ہوا تھا۔ مارکو کے کان میں ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی کہ ان کے گارڈ کو میں نے مارا ہے تو میرا زندہ رہنا ایک ناممکن بات تھی۔ پھر خدا کی ذات ہی مجھے مارکو بدمعاش کے آدمیوں کی گولی سے بچا سکتی تھی۔

میں چوتھا سگریٹ سلگانے لگا تو اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے کبھی ایک نشست میں اتنے سگریٹ نہیں پیے تھے۔ دراصل میں اپنے خیالات اور اندیشوں کی وجہ سے اتنا پریشان تھا کہ سگریٹ پہ سگریٹ پیے جا رہا تھا۔ اس رات میں پارما کلب میں اپنی ڈیوٹی پر گیا تو اندر سے ڈر ہو رہا تھا۔ میرے دل میں ایک مجرمانہ احساس تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ہر آدمی مجھے گھور رہا ہو۔ جب میں نے بار روم میں برونو کو بتایا کہ ساشی کا ایک آدمی میرے فلیٹ پر آ کر کہہ گیا تھا کہ ساشی آج رات کلب نہیں آئے گی۔ اسے بخار ہے تو وہ بھینسے کی طرح پھنکار مار کر بولا۔ "اس کتیا نے مجھے فون کیوں نہیں کر دیا۔ میں کسی دوسری ڈانسر کا بندوبست کر لیتا؟ جاؤ دفع ہو جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔"

میں نے خالی ٹرے اٹھائی اور کان کھجاتا ہوا اس شیلف کی طرف بڑھا جہاں مشروبات کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں اور ساتھ والی ٹھنڈی الماری میں بیئر کے ایک ایک درجن کے ڈبوں کے پیک رکھے تھے۔ وہاں سے میں نے بیئر کے چار ڈبے اور وائن کی ایک بوتل ٹرے میں رکھی اور ڈانسنگ ہال میں آ گیا۔ ڈانسنگ ہال میں میوزک زور و شور سے بج رہا تھا۔ سلاٹ مشینیں کھٹا کھٹ چل رہی تھیں۔ فلور پر ڈانس ہو رہا تھا۔ فضا مشروبات کی بو اور تمباکو کے دھوئیں سے بوجھل ہو رہی تھی۔

ڈانسنگ فلور پر ستانی اور ساشی کی جگہ آج دوسری لڑکیاں رقص کر رہی تھیں اور وہاں بیٹھے ہوئے نیم مدہوش لوگوں کا دل بہلا رہی تھیں۔ میرا خیال بار بار ستانی کی طرف چلا جاتا۔ مجھے معلوم تھا اس پر کوئی نہ کوئی آفت ضرور آنے والی ہے اور ممکن ہے کہ نیگرو لڑکی ساشی بھی رگڑی جائے۔ خود مجھے بھی خطرہ محسوس ہو رہا تھا مگر میں یہ سوچ کر اپنے آپ کو حوصلہ دیتا کہ کسی نے مجھے کبھی ستانی کے ساتھ یا ساشی کے ساتھ نہیں دیکھا۔ کلب کے ہال میں ہاؤ ہو کا بازار گرم تھا۔ خدا جانے یہ کون لوگ تھے کہ جو ساری رات بیٹھے وہاں داد عیش دیتے رہتے تھے۔ ساشی کی جگہ کوئی اور نیگرو لڑکی نیم عریاں کاسٹیوم پہنے ڈانس کر رہی تھی۔ کلب کی ڈانسروں میں ایک نیگرو لڑکی کا ہونا ضروری تھا۔ لوگ نیگرو لڑکیوں کے گہرے سانولے کالے جسم پسند کرتے تھے۔

خطرات کے سائے

رات کے کوئی دو بجے کا وقت ہو گا کہ وہی اسی روز والے باکسر ٹائپ کے آدمی کلب میں داخل ہوئے اور ڈانسنگ فلور کے قریب ایک خالی میز پر بیٹھ گئے۔ وہ بڑے غور سے ڈانس کرتی لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں مشروبات کا ٹرے لے کر ان کے پاس آ گیا۔ یہ میری

ڈیوٹی تھی کہ جیسے ہی کوئی گاہک آئے، میں اسے مشروبات پیش کروں۔ کیونکہ وہاں بیٹھنے کی یہ فیس تھی کہ ہر آدمی کو کم از کم بیئر کی ایک بوتل یا ڈبہ ضرور پینا پڑتا تھا۔ میں ان باکسر ٹائپ کے آدمیوں کے پاس گیا تو ان میں سے ایک نے میری طرف گھور کر دیکھا، پھر اشارے سے مجھے قریب بلایا۔ میں ذرا جھک گیا تو اس نے پوچھا۔ ''اس نیگرو لڑکی سے پہلے جو نیگرو لڑکی ڈانس کرتی تھی، وہ کہاں ہے؟''

اس نے یہ بات اطالوی زبان میں پوچھی تھی، اب میں ٹوٹی پھوٹی سی ہی مگر اطالین بولنے لگا تھا، میں نے کہا۔ ''وہ آج بیمار ہے۔''

باکسر نے جیکٹ کی جیب سے دس لیرے کا نوٹ نکال کر میرے ٹرے میں رکھ دیا اور منہ میں سگریٹ گھماتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم جانتے ہو وہ کہاں رہتی ہے؟ ہم اس کے دوست ہیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ''سینور! مجھے اس کے گھر کا پتہ معلوم نہیں۔''

وہ مجھے اور بار کاؤنٹر کی طرف چلے جہاں برونو شیشے کے ایک گلاس کو ہلا ہلا کر کاک ٹیل بنانے میں مصروف تھا۔ مجھے ایک دم احساس ہوا کہ برونو کو تو ساشی کا ایڈریس معلوم ہوگا، اگر اس نے بتا دیا تو یہ جرائم پیشہ بدمعاش جو یقیناً مارکو کے آدمی تھے، ساشی کے گھر پہنچ جائیں گے اور وہاں نتالی بھی ان کے ہاتھ آ جائے گی۔ میں بھی تیز تیز قدموں سے دوسری طرف ہو کر بار کاؤنٹر پر پہنچ گیا اور ٹرے کونے میں رکھ کر شیلف میں سے مشروبات کی بوتلیں نکال نکال کر دیکھنے لگا۔ میرے کان کاؤنٹر کی طرف لگے تھے جہاں دونوں باکسر پہنچ گئے تھے اور انہوں نے برونو سے ساشی کے بارے میں پوچھا تھا۔ ان کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ نتالی کے متعلق انہیں معلوم ہے کہ وہ کلب میں نہیں آئے گی کیونکہ وہ زخمی حالت میں تھی۔ وہ ساشی کا ایڈریس چاہتے تھے جو نتالی کی گہری سہیلی تھی۔ یہ معلومات پہلے سے ان کے پاس موجود تھیں کہ نیگرو ڈانسر ساشی ہی نتالی کی سہیلی ہے جو اس کی راز دار بھی ہے۔ میرا خیال تھا کہ برونو انہیں فوراً ساشی کا ایڈریس بتا دے گا مگر اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''سینور! یہ جو لڑکیاں ہمارے کلب میں ڈانس کرنے آتی ہیں، یہ ہمیں کبھی اپنا ایڈریس نہیں بتاتیں، یہ تو رات یہاں گزارتی ہیں، دن کہیں بسر کرتی ہیں۔''

دوسرے باکسر نے پوچھا۔ ''پھر بھی تمہیں اس کا کچھ تو اتہ پتہ تو معلوم ہوگا۔''

برونو نے ذرا سا مسکرا کر معذرت کا اظہار کیا۔

''تو سینور! مجھے اتنا ہی پتہ ہے کہ یہ لڑکیاں کسی امیر زادے کی کار میں یا کسی اوباش کے ساتھ ٹیکسی میں آتی ہیں اور واپسی پر بھی انہیں کوئی نہ کوئی آ کر لے جاتا ہے۔''

دونوں باکسر کلب کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گئے۔ مجھے بے حد سکون سا ہو گیا۔ ایک طرح سے ساشی اور نتالی کی زندگی بچ گئی تھی۔ کیونکہ اب جبکہ ان بدمعاشوں کا ایک آدمی بھی قتل یا شدید زخمی ہو چکا تھا وہ کسی صورت میں نتالی یا ساشی کو معاف نہیں کر سکتے تھے۔ میں

بڑے اطمینان سے ٹرے میں شیری کی چھوٹی بوتل رکھ کر ڈانسنگ فلور کی طرف چل دیے۔

رات کو ڈیوٹی آف کر کے میں نے آخری بس پکڑی اور سلیمان کے فلیٹ پر آ گیا۔ وہ بستر میں گھسا خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ میں بھی بتی بجھا کر صوفے پر پڑ گیا۔ بار بار ستانی کی طرف خیال چلا جاتا' وہ کس حال میں ہوگی' کہیں یہ بدمعاش کسی دوسرے ذریعے سے اس کے فلیٹ کا پتہ کر کے وہاں پہنچ نہ گئے ہوں۔ طرح طرح کے اندیشے دل میں پیدا ہو رہے تھے۔ آخر انہی اندیشوں اور وسوسوں کے ساتھ میں سو گیا۔ رات کو بڑے ڈراؤنے خواب ٹکڑوں کی شکل میں آتے رہے۔ سلیمان کی کھڑ کھڑ نے مجھے جگا دیا۔ اس وقت دن کا ایک بج رہا تھا۔ میری نیند پوری ہو چکی تھی۔ سلیمان کھانا تیار کر رہا تھا۔ کمرے میں بھنے ہوئے قیمے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے صوفے پر بیدار ہوتے دیکھ کر سلیمان مسکرا کر بولا۔ ”آج کل تم مجھے کسی لمبے چکر میں پڑے ہوئے لگتے ہو۔“

”تم نے کیسے اندازہ لگایا؟“ میں نے جمائی لیتے ہوئے پوچھا۔

سلیمان نے خالص دہلویوں کی طرح کندھے سکیڑ کر کہا۔

”بس لگا لیا اندازہ .... میں ایک مدت سے اس شہر کی فضا میں سانس لے رہا ہوں' یہ وینس شہر ہے۔ جب کوئی سیاح یہاں نوکری کر کے رہنا شروع کر دیتا ہے تو پھر اس کا کسی نہ کسی سکینڈل میں پھنس جانا یقینی ہو جاتا ہے۔“

میں نے باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک برادر .... مگر کوئی سکینڈل نہیں ہے' میں تو کلب کی ڈیوٹی پر جاتا ہوں اور آدھی رات کے بعد واپس آ کر یہاں صوفے پر سو جاتا ہوں۔“

میں نے باتھ روم کا دروازہ بند کر دیا تو مجھے سلیمان کے قہقہے کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”برادر! ہوشیار رہنا کہیں مارے نہ جانا۔“

سلیمان کو میں نے ستانی کے بارے میں کچھ نہ بتایا تھا۔ ورنہ میں اسے کچھ بتانا چاہتا تھا۔ تیسرے پہر وہ ٹیکسی لے کر نکل گیا۔ میں فلیٹ میں اکیلا بستر پر لیٹ کر سگریٹ پینے لگا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ ذرا اندھیرا ہو تو میں ساشی کے فلیٹ پر جا کر ستانی کا حال معلوم کروں۔ دن کی روشنی میں' میں وہاں نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ نیچے گلی اور سڑک پر بچے کھیل رہے تھے۔ موسم خراب نہیں تھا۔ آسمان صاف تھا اور سورج غروب ہونے والا تھا۔ پھر جب شام ہو گئی اور مکانوں میں بتیاں روشن ہو گئیں تو میں نے فلیٹ کو تالا لگا کر چابی خاص جگہ پر رکھی اور سیڑھیاں اتر کر سڑک پر آ گیا۔ چوک میں آ کر بس پکڑی اور ساشی کے فلیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرا دل اس خیال سے دھڑکنے لگا کہ کہیں وہاں کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو۔ دشمن ستانی کی تلاش میں تھے اور دشمن بھی ایسے تھے کہ سارا وینس شہر ان کی زد میں تھا اور ان کے جاسوس اور قاتل سارے شہر میں پھیلے ہوئے تھے۔ پھر خیال آتا کہ ساشی نے اپنے فلیٹ کا ایڈریس اگر کسی کو نہیں بتایا تو پھر یہ لوگ وہاں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

ستانی کا خیال آتا تو دل اداس سا ہو جاتا۔ اس سنہری بالوں والی اطالوی لڑکی نے اپنی مشرقی لڑکیوں والی شرم و حیاداری اور بے زبانی سے میرے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میں دکھ اس کا خیال دل سے نکالتا مگر اس کا اداس معصوم چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ میں پہلے ساشی کے فلیٹ پر جا کر ستانی کی خیریت دریافت کروں گا۔ انہیں اس خطرے سے آگاہ کروں گا کہ بدمعاش مارکو کے غنڈے ان کی تلاش میں ہیں اور وہ کلب میں آ کر ساشی کے فلیٹ کا پتہ بھی پوچھ رہے تھے۔ وہاں تھوڑی دیر بیٹھوں گا اور پھر کلب میں اپنی ڈیوٹی پر چلا جاؤں گا۔ بس وینس کے بارونق جگمگاتے ہوئے بازاروں میں سے گزر رہی تھی مگر میں اپنے خیالات میں گم تھا۔ ایک بڑے چوک میں میں نے بس تبدیل کی۔ اس بس نے مجھے مچھیروں والی گلیوں کے علاقے میں پہنچا دیا۔ ڈاکیا روڈ سے میں گنڈولے میں سوار ہو گیا۔ اور ایک گلی کے کونے میں پتھر کے لمبے چبوترے پر اتر گیا۔ یہاں سے میں نے پیدل چل کر دو تین مکانوں کے صحن عبور کئے۔ یہاں تک سمندر کا پانی ندی کی شکل میں گلی میں ہچکولے کھا رہا تھا اور آس پاس کے مکانوں کی عقبی روشنیاں ندی کے پانی میں جھلملا رہی تھیں۔ ساشی کا گھر مجھے معلوم تھا۔

میں گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ واقعی یہ ایک ویران علاقہ تھا۔ مکانوں کے پچھواڑے گلی میں کھلتے تھے۔ رات پہلے روز کی طرح ویران اور نیم روشن تھی۔ یہ روشنی کونے والے مکان کے باہر جلتے ہوئے بلب کی تھی۔ ساشی کے مکان کے باہر کوئی بتی نہیں جلتی تھی۔ اس تیز لڑکی نے اپنے ماحول اور حالات کے مطابق بڑا اچھا کرائے کا مکان لیا تھا۔ اس کے فلیٹ بلکہ مکان کا دروازہ بند تھا۔ یہ مکان صدیوں پرانے تھے۔ اس لیے میں انہیں فلیٹ نہیں لکھوں گا۔ اس علاقے میں ابھی تک کتنے ہی مکان خالی پڑے تھے۔ ان مکانوں میں کوئی نہیں رہ رہا تھا۔

ساشی کے فلیٹ پر حملہ؟

ساشی کے مکان کا دروازہ حسب معمول بند تھا۔ کوئی کال بیل بھی نہیں تھی۔ میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ دوسری بار دستک دی۔ کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ میں نے دروازے کو دبایا تو وہ کھل گیا۔ دروازہ پہلے سے ہی کھلا تھا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی کہ ساشی نے دروازہ اندر سے بند کیوں نہیں کیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس پر میں مزید حیران ہوا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ساشی دروازہ کھلا چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہو۔ میں آگے بڑھا تو میرا پاؤں آگے پڑی ہوئی کسی شے سے ٹکرایا اور میں گرتے گرتے بچا۔ میں نے جلدی سے دیوار کو پکڑ لیا اور ٹٹول کر دیوار کے ساتھ لگا ہوا بجلی کا سوئچ دبا دیا۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ بلب کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ ساشی کے کمرے کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ کرسی ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں تیزی سے پچھلے سٹور روم میں گیا۔ وہاں ہینگرز پر کلوزٹ سے نکالے ہوئے کپڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ دیوار پر لگی ہوئی کسی اطالوی فلم ایکٹرس کی تصویر کا شیشہ چکنا چور ہو چکا تھا اور وہ ٹیڑھی ہو کر دیوار سے لٹک رہی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہاں نہ ساشی تھی اور نہ ستانی تھی۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ مافیا کے آدمی یہاں آئے تھے اور گھر کے سامان کو تباہ کر کے

ساشی اور ستالی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں جلدی سے مکان سے باہر آ گیا۔ وہاں رکنا میرے لیے بھی خطرناک ہو سکتا تھا۔ مکان کا دروازہ بند کر کے میں تیز تیز قدموں سے ساتھ والے مکان کے دالان میں سے گزر کر گلی کے کونے پر آ کر ایک ستون کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا کہ کوئی ٹیکسی گنڈولا یعنی کشتی ادھر سے گزرے تو میں وہاں سے نکل جاؤں۔ میرا دماغ طرح طرح کے خیال سوچ رہا تھا۔ ان لوگوں نے دونوں کو لے جا کر ضرور ہلاک کر دیا ہوگا۔

ایک گنڈولا آ کر رک گیا۔ اس میں پہلے سے تین سواریاں بیٹھی تھیں۔ میں بھی اس میں سوار ہو گیا اور ڈاک یارڈ پہنچ کر جلدی جلدی یارڈ سے نکل کر بارونق سڑک پر آ گیا۔ بس سٹاپ سامنے تھا۔ میں بس سٹاپ کے کیبن میں آ کر بنچ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ یہ لوگ تو قاتل ہیں۔ انہوں نے ضرور ساشی کو دھمکیاں دے کر یہ معلوم کر لیا ہوگا کہ وہ رات کو ویران جزیرے کے فارم سے ستالی کو نکال کر لے گئی تھی۔ اس نے ضرور یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ میں بھی اس کے ساتھ تھا اور برآمدے میں پہرہ دینے گارڈ کو میں نے ہی پتھر مار کر ہلاک کیا تھا۔ یہ سوچ کر میرے ہونٹ خوف کے مارے خشک ہو گئے۔ میرا حلق کڑوا ہو گیا۔ یہ لوگ اب مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ پھر خیال آیا کہ ساشی نے میرے بارے میں نہیں بتایا ہوگا۔ اگر بتا بھی دیا ہوگا تو مارکو کے آدمیوں کو کیا معلوم کہ وہ میں ہی ہوں۔ انہوں نے میری شکل تو دیکھی نہیں۔ کلب میں کتنے ہی لڑکے میری طرح ویٹر کی جاب کرتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم؟ وہ لڑکا میں ہی ہوں جو ساشی کے ساتھ ویران جزیرے میں گیا تھا۔

مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ وہاں سے میں نے ایک بس پکڑی۔ دوپہر کو کلب کے باہر جا کر اتر گیا۔ اس رات میں ہزاروں اندیشے اور وسوسے دل میں لیے کلب میں داخل ہوا۔ میں بروڈو کے قریب سے گزرا تو اس نے حسب عادت چیخ کر کہا۔ "مکاؤ آج پہلے والی شیلف میں رکھی ہے ذرا تیز تیز چلا کرو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جاؤ۔"

جب میں مشروبات سے بھرا ہوا ٹرے لے کر ہال میں آیا تو میوزک کے شور میں فلور پر لڑکیاں نیم عریاں کاسٹیوم میں رقص میں مصروف تھیں۔ فلور کے ساتھ لگی میزوں پر بیٹھے ہوئے عیاش لوگ ان پر آوازے بھی کس رہے تھے اور مشروبات اور سگریٹ بھی پی رہے تھے۔ ہر رات کی طرح فضا میں تمباکو اور مشروبات کی بو رچی ہوئی تھی۔ اب میں اس بو کا عادی ہو گیا تھا۔ میں تھوڑی دیر بعد تمام میزوں کا جائزہ لے لیتا تھا کہ کہیں مارکو کے باکسر ٹائپ کے آدمی تو میری تلاش میں وہاں نہیں آئے۔ مگر ان میں سے مجھے کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

گیارہ بجے میں نے کاؤنٹر کے پیچھے چھوٹی سی بنچ پر بیٹھ کر مختصر سا کھانا کھایا اور واپس اپنی ڈیوٹی پر آ گیا۔ رات کے کوئی ایک بجے کے قریب میں نے ان دونوں باکسروں کو کلب کے ہال کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس طرف ہال کا

ایک ہی دروازہ تھا۔ میں دوسرے دروازے کی طرف جانے لگا تو دونوں باکسروں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر ان میں سے ایک نے مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک لمحے کے لیے وہیں بت سا بنا رہا۔ میں بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ میری ڈیوٹی بھی تھی کہ کوئی گاہک بلائے تو میں اس کی بات سننے اس کے پاس ضرور جاؤں۔ میں نے دل میں سمجھ لیا تھا کہ انہیں میرے بارے میں ساشی نے سب کچھ بتا دیا ہے اور اب یہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اوپر سے بظاہر مسکراتا ہوا ان کے قریب چلا گیا اور روایتی خوش اخلاقی سے بڑی مشکل سے پوچھا۔ "یس سینور؟"

ان میں سے ایک باکسر نے جس کی ناک کی ہڈی درمیان سے ٹوٹ کر ایک طرف مڑ گئی تھی میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دباتے ہوئے کہا۔ "تم ہمارے دوست ہو۔ ہمیں ایک ضروری بات تم سے پوچھنی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ لو اسے اپنے پاس رکھ لو۔" اور اس نے دوسرا ہاتھ جیب سے نکال کر دس لیرے کا نوٹ میری جیب میں ٹھونس دیا۔

میں سخت تذبذب میں تھا۔ کبھی لگتا کہ انہیں میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے، کبھی لگتا کہ نہیں۔۔۔۔۔۔۔ انہیں ابھی کچھ نہیں پتہ۔ باکسر نے میری طرف جھک کر پوچھا۔ "یہ بتاؤ کہ تم ہیروں میں وہ کون سا ہیرا ہے جس کی نگرو ڈانسر ساشی سے دوستی تھی؟"

اس بدمعاش کی زبان سے یہ جملہ سن کر میری جان میں جان آ گئی۔ انہیں میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اتنا مجھ پر منکشف ہو گیا تھا کہ ان لوگوں کی اطلاع دینے والے نے اسے معلوم کر لیا ہے کہ وہ کلب میں سے ایک دوست ہیرے کے ساتھ ویران جزیرے پر گئی تھی۔ مگر اس نے میرا حلیہ انہیں غلط بتایا تھا جس کی بعد میں ان باکسروں نے تصدیق بھی کر دی۔ میں نے کہا۔ "ساشی ڈانسر تو سب ہیروں سے ہنس کر ملتی تھی۔ اب پتہ نہیں آپ کس ہیرے کی بات کر رہے ہیں؟"

دوسرے باکسر نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اس ہیرے کا نام گونزالیز ہے۔ سپینش ہے۔ عمر چالیس کے قریب ہے۔ ماتھے پر ایک طرف زخم کا لمبا نشان ہے۔"

پہلے والا باکسر بولا۔ "ہمیں اس حلیے کا ہیرا یہاں کہیں نظر نہیں آ رہا۔ کیا تم اس کے بارے میں ہمیں کچھ بتا سکتے ہو؟ ہمیں اس سے بڑا ضروری ملنا ہے۔"

میرے تن مردہ میں مزید جان پڑ گئی۔ ساشی نے میرے ساتھ پوری پوری دوستی نبھائی تھی۔ اس نے نہ جانے کیسی کیسی اذیتیں برداشت کیں مگر میرا حلیہ غلط بتایا۔ اگر وہ ان قاتلوں کو صرف اتنا ہی بتا دیتی کہ جس لڑکے کے ساتھ میں نتاں کو نکال کر لائی تھی اور جس کے حملے سے ان کا گارڈ مارا گیا وہ پاکستانی ہے، اس کا نام یہ ہے اور اس کا حلیہ اس طرح کا ہے تو یہ باکسر کلب ہال میں داخل ہوتے ہی مجھے گولیوں سے بھون کر رکھ دیتے اور بڑے اطمینان سے باہر نکل جاتے۔ میرا کھویا ہوا اعتماد بحال ہو چکا تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ہاں ہاں ------- یاد آیا ------- تم گلوایز کی بات کر رہے ہو۔ مجھے اس کا نام تو معلوم نہیں کہ کیا ہے لیکن ہاں اس علاقے کا ایک آدمی میں نے دو تین دن پہلے یہاں دیکھا ضرور تھا۔ پھر وہ نظر نہیں آیا۔ آپ لوگ مسٹر مارکو سے کیوں نہیں معلوم کرتے؟"

دوسرے باکسر نے مارکو کو موٹی سی گالی دی اور کہا۔ "اس سے بھی پوچھ لیں گے۔"

اور دونوں بدمعاش تیزی سے دروازے کی طرف مڑ گئے۔ میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور خیال ہی خیال میں ساشی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "ساشی! تم واقعی مخلص دوست ہو تم نے دوستی کی لاج رکھ لی۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔"

ثنائی کے ساتھ مجھے ساشی کی بھی فکر تھی۔ قیاس یہی تھا کہ مارکو نے ثنائی کو قتل نہیں کیا ہوگا کیونکہ بقول ساشی اس سے اس گروہ کے گہرے مجرمانہ مفادات وابستہ تھے۔ میں یہ بھی سوچتا کہ ساشی کو بھی انہوں نے ٹھکانے نہیں لگایا ہوگا۔ اگر ان کا کوئی ایسا ارادہ ہوتا تو ساشی کے فلیٹ میں ہی دونوں کی لاشیں پڑی ہوتیں۔ کافی رات گئے میں کلب سے واپس آیا۔

ساشی قتل ہو گئی

دوسرے دن میں شام تک سویا رہا۔ جب سے مجھے یہ پتہ چلا تھا کہ ساشی نے مارکو کے آدمیوں کو میرا اصلی حلیہ اور نام پتہ نہیں بتایا میرے دل سے ایک خوف سا دور ہو گیا تھا۔ دوسری رات میں کلب میں گیا تو مارکو کا کوئی آدمی وہاں نہ آیا۔ تیسری رات بھی ایسے ہی گزر گئی۔ ثنائی اور ساشی کا بھی کچھ پتہ نہ چل سکا۔ میں نے سراغ لگانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ دل میں ان دونوں اطالوی لڑکیوں کے بارے میں تشویش ضرور لگی تھی کہ خدا جانے وہ کس حال میں ہوں گی؟ کہاں ہوں گی اور مافیا کے قاتل غنڈے ان کے ساتھ کس قسم کا سلوک کر رہے ہوں گے۔ چوتھے دن میں کلب سے واپس آ کر سلیمان کے فلیٹ میں سو گیا۔ اگلے دن دوپہر کے بعد اٹھا تو سلیمان میز کے پاس بیٹھا برگر کھاتے ہوئے کافی پی رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار بھی تھا۔ مجھے جاگتا دیکھ کر اس نے کہا۔

"برادر! تمہارے کلب کی ایک ڈانسر قتل ہو گئی ہے .... یہ دیکھو اس کی تصویر چھپی ہے۔"

مجھ پر تو جیسے بجلی سی گری۔ میں ایک پل کے لیے ساکت ہو گیا۔ مگر جلدی سے اپنے ہوش پر قابو پایا اور سلیمان سے اخبار لے کر دیکھا۔ اخبار کے پچھلے صفحے پر چوکھٹے میں ساشی کی لاش کی تصویر چھپی تھی۔ نیچے لکھا تھا کہ ریالٹو جزیرے کے ایک یارڈ میں ایک نوجوان لڑکی کی لاش ملی ہے جس کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ پارما کلب میں ڈانس کیا کرتی تھی۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں لکھا تھا۔ ساشی کا نام بھی اخبار والوں نے معلوم کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس قسم کے قتل وینس میں آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ میرا دل ڈوبنے سا لگا۔ آخر وہی ہو جس کا مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے ساشی کو ہلاک کر ہی دیا۔ ثنائی بچ گئی تھی صرف اس وجہ سے کہ مارکو کا گینگ اس سے کام لینا چاہتا تھا۔ ساشی نے مجھے بتایا تھا کہ اونچی سوسائٹی میں ثنائی کی شخصیت کو بہت پسند کیا جاتا ہے اور وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بات کرتی ہے۔ ساشی

کی موت کا مجھے دلی صدمہ ہوا۔ مگر میں سوائے افسوس کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

خوابوں کی شہزادی

دن گزرتے گئے۔۔۔۔۔۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ اس دوران مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ ثنا کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ میرے دل میں اس کی یاد برقرار تھی۔ ایک رات میں نے اسے خواب میں بھی دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ۔۔۔۔۔۔ ایک پرانا باغ ہے اس میں ایک گرجا گھر ہے جس کی دیواروں پر سرسبز بیل چڑھی ہوئی ہے۔ اچانک گرجا گھر کے دروازے میں سے ثنا باہر نکلتی ہے۔ اس نے یورپ کی دلہنوں والا سفید لباس پہن رکھا ہے۔ سر پر سفید پھولوں کا تاج ہے ہاتھ میں سفید پھولوں کا گلدستہ ہے۔ اس کے سفید جالی دار گاؤن کو پیچھے سے دو ننھی ننھی پریوں نے اٹھا رکھا ہے۔ ثنا گرجے کے دروازے میں کھڑی ہو کر پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھتی ہے۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑتی ہے۔ میں سرو کے ایک جھنڈ کے پاس کھڑا ہوں۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتی ہے اور اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتی ہے۔ اس نے کہنیوں تک سفید ریشمی دستانے پہنے ہوئے ہیں۔ میں بے اختیار سا ہو کر اس کی طرف بڑھتا ہوں۔ وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے اور میری طرف دیکھ کر مسکراتی ہے۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کرتی ہے مگر اس کی آواز نہیں نکلتی۔ اچانک وہ اپنا گلا دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتی ہے اور پھر اس کے منہ سے خون ٹپکنا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ چیخ مار کر گرجا گھر کے اندر دوڑتی ہے۔ میں اس کے پیچھے اسے آوازیں دیتا جاتا ہوں۔ میں کسی چیز سے ٹکرا کر گر پڑتا ہوں اور پھر میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

میں مہمان خانے کے کمرے میں صوفے پر سو رہا تھا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ثنا کے خواب نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ یہ ایک ایسا خواب تھا جس کے حسن اور معصومیت میں خون بھی شامل تھا۔ دیر تک میں صوفے پر پہلو بدلتا رہا۔ پھر مجھے نیند نہ آئی اور میں اٹھ کر نیچے گلی کے ریستوران میں جا کر کافی پینے لگا۔ شام تک خواب کے بارے میں سوچتا رہا۔ دل یہی کہتا تھا کہ ثنا کسی مصیبت میں ہے اسے میری مدد کی ضرورت ہے۔ مگر میں اس کی کیسے مدد کر سکتا تھا۔ مجھے تو اس کا کچھ بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔

ثنا کی مدد میں دو وجوہات کی بنا پر کرنا چاہتا تھا بلکہ کرنے پر تیار تھا۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ میں ثنا سے محبت کرنے لگا تھا دوسری وجہ یہ تھی کہ ثنا دل سے چاہتی تھی کہ وہ گناہ کی زندگی سے توبہ کر کے اس دلدل سے نکل جائے اور عزت اور آبرومندی کی شریفانہ زندگی بسر کرنی شروع کرے۔ چونکہ میری اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ اس لیے اب چشم پوشی سے کام لینا مردانگی اور انسانی قدروں کے خلاف تھا۔ مجھے ہر حالت میں اس کی مدد کرنی چاہیے تھی۔ یہ میرا فرض بنتا تھا۔

وہاں کوئی ایسا آدمی یا عورت نہیں تھی جس سے میں ثنا کے بارے میں کچھ پوچھ سکتا۔ بار اور کلب میں اس قسم کے معاملات پر دوسری ڈانسر لڑکیوں سے بات کرنا اپنی موت کو آواز دینا تھا۔ کیونکہ وہ سب ایک طرح سے مافیا گینگ کے جال میں پھنسی ہوئی جل پریاں تھیں۔

مافیا والوں کے کانوں میں ذرا سی بھی بھنک پڑ جاتی کہ پیرو کلب کا ایک بیرا ستاں کے بارے میں پوچھ رہا تھا تو وہ لوگ ضرور میرے پیچھے لگ جاتے کیونکہ یہ طے شدہ بات تھی کہ ماریو کو ابھی تک اپنے فارم والے گارڈ کے قتل یا اسے شدید زخمی کر کے ستانی کو نکال لے جانے والے اصلی آدمی کا پتہ نہیں چلا تھا۔ کیونکہ اصلی آدمی تو میں تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میرے دل سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ستانی کا خیال نکل جاتا مگر ہوا یہ تھا کہ ستانی مجھے پہلے سے زیادہ شدت سے یاد آنے لگی تھی۔ میرے یہ سفرنامہ پڑھنے والوں میں سے اگر کسی نے محبت کی ہے تو وہ میرے جذبات کو صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ محبت ایک عجیب و غریب جذبہ ہے اور جوانی میں جو محبت کی جاتی ہے اس کی شدت کسی جوالا مکھی پہاڑ کے کھولتے ہوئے لاوے سے کم نہیں ہوتی۔ ہم بڑے ہو کر لاکھ نصیحتیں کریں مگر جوان دلوں پر محبت کا نقش کبھی نہیں مٹتا۔ میرا بھی ستانی کے بغیر یہی حال ہو رہا تھا۔

سارا دن تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ ستانی کا خیال آتا اور میں اس کے تصور میں گم ہو جاتا۔ رات کو کلب جاتا تو دوسری لڑکیوں کو فلور پر ڈانس کرتے دیکھ کر بے اختیار ستانی کا تصور آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ ایک بار تو میری آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اس جذباتی عذاب کو سہنے سے یہی بہتر ہے کہ میں وینس چھوڑ کر فلارنس یا نیپلز یا روم کے شہر میں چلا جاؤں۔

مجھے اپنی طبیعت اور اپنے مزاج کا پورا پتہ تھا کہ میں دور ہو کر اپنی محبت کے اور قریب ہو جاؤں گا۔ پھر مجھے ستانی پہلے سے زیادہ یاد آنے لگے گی۔ یہاں تو پھر بھی یہ امید ہے کہ شاید کبھی ستانی کی صورت دکھائی دے جائے اٹلی کے دوسرے شہروں میں چلا گیا تو وہاں تو یہ امید بھی ختم ہو جائے گی۔

سنہری بالوں والی میری محبت!

اسی حالت میں تین مہینے گزر گئے۔ موسم سرما گزر گیا۔ آسمان کا رنگ گہرا نیلا ہونے لگا۔ جن درختوں کے پتے سوکھ کر گر چکے تھے۔ ان کی شاخوں پر نئی نئی کونپلوں کی آنکھیں نکلنے لگیں۔ رات کو سردی کم ہو گئی تھی۔ ایک رات میں کلب سے اپنی ڈیوٹی ختم کر کے عقبی دروازے سے باہر نکلا تو گیراج کے باہر ایک جانب اندھیرے میں ایک گاڑی کھڑی تھی۔ میں اس کے قریب سے گزرا تو کسی نے میرا نام لے کر مجھے بلایا۔ میرے قدم وہیں رک گئے۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

گیراج کی مدھم بتی کی روشنی میں مجھے پرانی سی کار کے پاس ایک لڑکا کھڑا نظر آیا جس کی عمر اٹھارہ انیس سال کی ہوگی۔ اس نے دوسرا سوال کیا۔ ”سینور! تم کس ملک سے آئے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”پاکستان سے ۔۔۔۔۔۔ کیوں کیا معاملہ ہے؟“

لڑکا میرے قریب آ گیا۔ اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور بولا "مجھے آپ کا جو حلیہ بتایا گیا تھا میں نے اس سے آپ کو پہچانا ہے۔ آپ کا نام اور ملک کا نام بھی وہی ہے جو مجھے بتایا گیا تھا۔ کیا آپ نتالی کو جانتے ہیں؟ یہ میرا آخری سوال ہے۔"

نتالی کا خط

میں سمجھ گیا کہ اسے نتالی نے بھیجا ہے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ تنگ گلی رات کے وقت بالکل خالی تھی۔

"نتالی کہاں ہے؟"

لڑکے نے لفافہ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا" سینور! یہ لفافہ نتالی نے دیا ہے کہ آپ کو پہنچا دوں اس میں سب کچھ لکھا ہوگا۔"

یہ کہہ کر لڑکا گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ کر کے تیزی سے گلی میں آگے نکل گیا۔ میں نے لفافے کو فوراً اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا سڑک پر آ گیا۔ سامنے بس سٹاپ تھا جہاں مجھے ہاتھ دے کر بس کو کھڑا کرنا تھا۔ نتالی کے خط نے میرے جذبات محبت میں ایک ہیجان سا برپا کر دیا تھا۔ میں پہلی فرصت میں خط کو پڑھنا چاہتا تھا مگر بس سٹاپ پر دو عورتیں پہلے سے کھڑی تھیں۔ پچھلے پہر کی ہوا میں اب سردیوں کی راتوں والی تیزی اور شدت نہیں تھی۔ ایک عورت بوڑھی تھی جو بنچ پر دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے بیٹھی تھی۔ دوسری عورت نے بہت زیادہ میک اپ کیا ہوا تھا اور کھڑے کھڑے کسی وقت پرس سے چھوٹا سا شیشہ نکال کر کھمبے کی روشنی میں اپنا میک اپ ٹھیک کرنے لگتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کہاں سے آئی تھی اور کہاں جا رہی تھی۔ اس نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ میں نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ اس وقت میرے ذہن میں سوائے نتالی کے اور کسی کا خیال نہیں تھا۔ اگر بس سٹاپ کا کیبن خالی ہوتا تو میں وہیں اس کا خط نکال کر پڑھنا شروع کر دیتا۔ اتنے میں بس آ گئی۔ میں نے اور اس فیشن ایبل عورت نے ایک ساتھ بس کو ہاتھ دیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیئے۔ بوڑھی اطالوی عورت بھی اٹھ کر ہمارے پیچھے کھڑی ہو گئی۔

بس میں تین چار سواریاں پہلے سے بیٹھی اونگھ رہی تھیں۔ میں بھی بس میں سوار ہو گیا۔ میں کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کر شیشے میں سے باہر دیکھنے لگا۔ فیشن ایبل عورت میرے ساتھ والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ گھٹیا قسم کے پرفیوم کا جھونکا میرے قریب سے ہو کر گزر گیا۔ عورت نے پرس میں سے سگریٹ کیس نکال کر سگریٹ منہ میں دبایا اور مجھ سے ماچس مانگا۔ میں نے لائٹر نکال کر دے دیا۔ مجھے اس وقت کسی عورت کی مداخلت ہرگز پسند نہیں آ سکتی تھی۔ میں اپنے خیالات میں گم تھا۔

عورت نے سگریٹ سلگایا تو پیچھے سے کسی کی آواز آئی۔ "بس میں سگریٹ پینا منع ہے۔"

میرے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت نے سگریٹ منہ سے نکال کر پاؤں تلے مسل دیا اور جس مرد نے وارننگ دی تھی اسے منہ ہی منہ میں گالی دی اور میرے کندھے سے کندھا ملا کر کہا۔ "ہر شخص کو آزادی ہونی چاہیے سگریٹ پینے کی اور محبت کرنے کی بھی ۔۔۔۔۔۔۔ کیوں سینور!

تمہارا کیا خیال ہے؟"

اس وقت میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اسے اپنا خیال بتاتا۔ کیونکہ میں ثنائی کے خیال میں' سچی محبت کے پاکیزہ جذبوں میں تھا۔ میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور کھڑکی کے شیشے میں سے باہر دیکھنے لگا۔ شیشہ بند تھا۔ اس میں سے بھی مجھے بس کی روشنی میں اسی عورت کا دوہرا عکس ہی نظر آیا۔

اس عورت نے جب یہ کیا کہ مجھ پر اپنا بوجھ ڈالنا شروع کر دیا۔ تب میں نے اسے دور پیچھے دھکیلتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔

"سینوریتا! میں شریف آدمی ہوں میں جانتا ہوں تم کیا چاہتی ہو۔ مگر اس وقت میں ذہنی طور پر بہت مصروف ہوں اور تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ بہتر ہے کہ تم گھر جا کر آرام کرو۔"

وہ مسکرائی اور پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔

سلیمان ابھی تک رات کو ہی ٹیکسی چلاتا تھا اور صبح کسی وقت آتا تھا۔ میں فلیٹ پر گیا تو حسب معمول وہ نہیں آیا ہوا تھا۔ کیونکہ اس وقت رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ میں نے بتی جلائی۔ اور جلدی سے لفافہ کھول کر بیٹھ گیا۔ لفافے کے اندر ثنائی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مختصر سا خط تھا۔ یہ اس نے انگریزی میں لکھا تھا تاکہ میں اچھی طرح سمجھ سکوں۔ اس نے لکھا تھا۔

"میرے پیارے .... اس وقت میں اپنی زندگی کے دوراہے پر کھڑی ہوں ایک طرف گناہ کا جہنم ہے دوسری طرف پاک صاف زندگی کا فردوس ہے۔ اس وقت صرف تم میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے جنت کی راہ پر چلا سکتے ہو۔ اگر تم ایسا فیصلہ کرو تو سنو! ایئرپورٹ کے پیچھے پارکنگ لاٹ ہے۔ پارکنگ لاٹ کے کونے پر وینس دیوی کا ایک سنگی مجسمہ لگا ہوا ہے۔ تم کل رات کے گیارہ بجے آ جانا۔ وہاں تمہیں ایک گاڑی کے پاس وہی لڑکا ملے گا جس نے تمہیں میرا خط دیا ہے۔ اگر تم آ گئے تو یقین کرو جہنم سے نکل کر نیکی کے راستے پر میرا سفر شروع ہو جائے گا۔ اگر تم نہ آئے تو پھر جہنم کے شعلے تو میری قسمت میں لکھے ہی ہوئے ہیں۔

تمہاری ثنائی!"

خط کو میں نے کئی مرتبہ پڑھا۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ ثنائی کل رات گیارہ بجے ایئرپورٹ کے پارکنگ لاٹ میں کہاں سے آئے گی۔ لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ جن بدمعاشوں میں گھری ہوئی ہے کسی نہ کسی طرح ان کے چنگل سے نکل کر ہی آئے گی۔ اس نے اپنی طرف سے کوئی منصوبہ ضرور بنا رکھا ہوگا۔ اس وقت مجھے اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ میں اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا مگر اتنا ضرور مجھے کرنا چاہیے تھا کہ وہ بری زندگی سے نکل کر اچھی طرح زندگی کی طرف لوٹ آئے۔

میں نے دوسری رات گیارہ بجے ایئرپورٹ پر پہنچنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے جمپر کی پچھلی جیب میں خط سنبھال کر رکھ لیا اور بتی بجھا کر

لیٹ گیا۔ دیر تک سوچتا رہا۔ تانی کس طرف سے آئے گی؟ مارکو کے بدمعاشوں کو پتہ چل گیا تو ضرور اس کے پیچھے ہو لیں گے۔ ہو سکتا ہے گولیاں بھی چلیں۔ میرے پاس جو ریوالور تھا وہ ساشی نے واپس لے لیا تھا۔ میں نے خالص پنجابیوں کی طرح اپنے آپ سے کہا۔ "یار دیکھا جائے گا' جو ہوتا ہے ہو جائے۔۔۔۔۔۔۔ اللہ مالک ہے۔"

اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

دوسرے روز میں شام کو کلب اپنی ڈیوٹی پر گیا تو میں نے جاتے ہی برونو سے کہا کہ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' ٹمپریچر بھی ہے' مجھے دس بجے چھٹی دے دیجئے گا۔ برونو نے خشمگیں آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور مجھے گالی سی دے کر بولا۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو۔۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے چلے جانا دس بجے' مگر میں پانچ گھنٹوں کے پیسے کاٹ لوں گا۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور یونہی سوں سوں کرتا جیسے مجھے زکام بھی ہو' ٹرے اٹھا کر مشروبات کے شیلف کی طرف چل دیا۔ دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ تانی مجھے کہاں لے جائے گی؟ ضرور اس نے کچھ نہ کچھ سوچ رکھا ہوگا۔ ہو سکتا ہے مارکو کے آدمی اسے کسی دوسرے شہر لے جانے کے لیے ایئر پورٹ پر لا رہے ہوں اور تانی نے وہیں سے فرار ہو جانے کا منصوبہ تیار کر رکھا ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن میں ایئر پورٹ پہنچنے کے لیے بالکل تیار تھا۔

ایئر پورٹ کو L-17 نمبر کی بس جاتی تھی۔ یہ مجھے معلوم تھا۔ یہ بس ہمارے کلب سے کوئی چار بلاک کے فاصلے پر ایک چوک سے روانہ ہوتی تھی۔ میں پونے دس بجے ہی برونو سے چھٹی لے کر بس سٹاپ پر آ گیا۔ وہاں سے جلدی جلدی پیدل ہی چلتا ایئر پورٹ والے بس سٹاپ پر پہنچ گیا۔ اس وقت وینس کی رونقیں اپنے عروج پر تھیں۔ چوک روشنیوں سے جگمگ کر رہا تھا۔ نیون سائنز کی رنگ برنگ روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔ سڑک پر کافی رش تھا۔ بس سٹاپ پر دوسرے لوگ بھی کھڑے تھے۔ بس آئی تو میں اس میں بیٹھ گیا۔ ایئر پورٹ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اگر زیادہ دور ہوتا تو میں ضرور کوئی ٹیکسی پکڑ لیتا۔ پندرہ منٹ بعد بس نے مجھے ایئر پورٹ پہنچا دیا۔ میں ایئر پورٹ کے مین گیٹ کے سامنے سے ہو کر عقبی پارکنگ لاٹ کی طرف چل پڑا۔ یہ کوئی چھوٹا ایئر پورٹ نہیں تھا۔ بڑا کشادہ رقبہ تھا۔ سامنے والے پارکنگ لاٹ میں کاریں ہی کاریں تھیں۔ لوگ مین گیٹ میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک جمبو جیٹ جہاز ایئر پورٹ کے اوپر سے گزر گیا۔ وہ اتنی کم بلندی پر تھا کہ اس کی کھڑکیوں کی روشنیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔

وینس کا ایئر پورٹ

ایئر پورٹ کا عقبی پارکنگ لاٹ بھی گاڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔

میں پارکنگ لاٹ کے کونے کی طرف بڑھا۔ وہاں دور ہی سے مجھے ایک مجسمہ دکھائی دیا۔ یہ وینس دیوی کا مجسمہ تھا جو ایک چبوترے پر

کھڑا تھا۔ میں نے آس پاس دیکھا۔ وہاں کونے میں کوئی گاڑی نہیں کھڑی تھی اور وہ لڑکا بھی نہیں تھا جو مجھے ستالی کا خط دے گیا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ابھی ساڑھے دس نہیں بجے تھے۔ کافی وقت تھا۔ میں وہاں سے ہٹ کر نیم دائرے میں سجی ہوئی دکانوں کی طرف آ گیا جن کے شیشے روشنیوں میں چمک رہے تھے۔ شوکیسوں میں عورتوں اور مردوں کے مجسمے کھڑے تھے۔ ان مجسموں نے نئے فیشن کے لیڈیز اور مردانہ کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہاں ایک کتابوں کی دکان بھی تھی۔ میں دکان میں آ کر شیلفوں میں لگی کتابیں دیکھنے لگا۔ زیادہ کتابیں اطالوی زبان میں تھیں۔ انگریزی کی کلاسیکی کتابیں بھی تھیں۔ دانتے کی ڈیوائن کامیڈی کی اطالوی اور انگریزی دونوں جلدیں رکھی تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ میں دانتے کے شہر فلارنس بھی ضرور جاؤں گا۔ فلارنس میں اس عظیم اطالوی شاعر کا گھر ابھی تک محفوظ ہے جس طرح ہمارے عظیم شاعر علامہ اقبال کا گھر سیالکوٹ میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ افسوس کہ ہمارے پنجابی کے عظیم شاعر وارث شاہ کی کوئی چیز ہمارے پاس محفوظ نہیں ہے۔ مگر ہم پسماندہ یا ترقی پذیر قوم ہیں۔ ہمارے ہاں ان چیزوں کو کون پروا کرتا ہے۔ ہم بادشاہوں کے مقبروں اور غسل خانوں کی تو سرکاری طور پر حفاظت کرتے ہیں اور ان کے بوسیدہ شاہی لباس کو عجائب گھروں میں سجا سجا کر رکھتے ہیں مگر کلاسیکل صوفی شاعری کے شہنشاہ وارث شاہ اور میاں محمد صاحب کے کلام کے سوا ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ شاہ حسین کی ٹکسالی کے باہر ایک کوٹھڑی یادگار کے طور پر رہ گئی ہے اس کی بھی دیواریں گرنے کو ہیں۔

میں یونانی دیوی وینس کا وہ مجسمہ دیکھ رہا تھا جو کتابوں کی دکان میں دانتے اور ہومر کی کتابوں کے درمیان سجا ہوا تھا۔ میں پھرتے پھراتے کتابوں کی دکان کے دوسرے دروازے سے نکل کر پیچھے کی جانب آ گیا۔ میرا ارادہ تھوڑی دیر وہاں چل پھر کر وقت گزارنے کا تھا۔ کیونکہ وہاں گول چبوترے کے اندر شفاف پانی کا فوارہ چل رہا تھا۔ موسم بڑا خوشگوار ہو گیا ہوا تھا۔ سردی کی شدت ختم ہو چکی تھی۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ صرف رات کو ذرا خنک ہو جاتی تھی۔ فوارے کے پیچھے ایک کشادہ سڑک تھی جس پر سے کاریں اور ٹریلر وغیرہ گزر رہے تھے۔ سڑک کے عقب میں ایک عالی شان بلند و بالا عمارت تھی جس کی شیشے کی دیواریں تھیں۔ دیواروں کے اندر پردے پڑے تھے جن پر دھیمی دھیمی روشنی پڑ رہی تھی۔ یہ کوئی فائیو سٹار یا تھری سٹار ہوٹل لگ رہا تھا۔ میں فوارے کے پاس لکڑی کے بنچ پر بیٹھ کر سگریٹ پینے اور فوارے پر پڑتی رنگ برنگی روشنیوں کا نظارہ کرنے لگا۔

میں نے سگریٹ ختم کر کے گھڑی دیکھی۔ رات کے گیارہ بجنے میں ابھی بیس منٹ باقی تھے۔ میں اٹھ کر کتابوں کی دکان سے اندر سے ہوتا ہوا پارکنگ لاٹ کے سامنے آ کھڑا ہو گیا۔ میں فٹ پاتھ پر تھا۔ درمیان میں سڑک تھی جو ایئر پورٹ کے وسیع و عریض عمارت کے گرد گھوم جاتی تھی۔ سامنے کونے میں وینس دیوی کا سنگ مرمر کا مجسمہ تھا۔ ابھی تک اس کے پیچھے کوئی گاڑی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ سب گاڑیاں پارکنگ لاٹ میں ہی کھڑی تھیں۔ نئی گاڑیاں بھی پارکنگ کے گیٹ میں سے داخل ہو کر وہیں جا کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈال لیتا تھا۔ اس دوران کئی جہاز وینس کے ایئرپورٹ پر اترے اور کئی جہازوں نے ٹیک آف کیا۔ جن کی آوازیں میں سنتا رہا۔ لینڈ کرنے والے دو تین جہاز ایئرپورٹ کی عمارت کے اوپر سے بھی گزرے۔ جب گیارہ بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے تو میری بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ اچانک ایک جانب سے ایک پرانی سی کار آ کر رینس کے مجسمے کے ذرا پیچھے اندھیرے میں کھڑی ہو گئی۔ میں نے گاڑی پر نظریں جما دیں۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان لڑکا باہر نکلا۔ میں نے دور ہی سے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکا تھا جس نے مجھے ثنائی کا خط دیا تھا۔ میں فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک کراس کر کے اس کے پاس آ گیا۔ لڑکا گاڑی کے بونٹ کا سہارا لیے کھڑا تھا۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔

اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے اندر بیٹھ گیا۔ وہ دروازہ بند کرنے لگا تو میں نے اطالین میں پوچھا۔ "سینورینا کہاں ہے؟"

لڑکے نے بند کھڑکی کے شیشے کے قریب منہ لا کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ وہ مجھے خاموش رہنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ میں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھے انگریزی فلموں کے سین یاد آ رہے تھے۔ خدا جانے ثنائی نے کس طرف سے آنا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ جس قسم کا کلائمیکس پیدا کیا جا رہا تھا یہ کوئی ڈرامائی اور اعصاب کا سین ہی ہوگا۔ دھڑا دھڑ فائرنگ ہوگی، ثنائی بھاگتی ہوئی آئے گی اور دور ہی سے چلا کر کہے گی۔ "گاڑی سٹارٹ کرو۔"

اور پھر دھم سے گاڑی میں اپنے آپ کو گرا دے گی۔

ایئرپورٹ پر دھماکہ

میں نے گھڑی دیکھی۔ گاڑی کے ہلکے ہلکے اندھیرے میں گھڑی کی چمکتی ہوئی سوئیوں نے مجھے بتایا کہ پورے گیارہ بج گئے ہیں۔ پر اسرار لڑکے نے بھی اپنی گھڑی پر وقت دیکھا اور پھر دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

زبردست سسپنس پیدا ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی کوئی دھماکہ ہوگا۔ اچانک مجھے ایک زبردست دھماکے کی آواز سنائی دی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ میرا وہم ہے۔ مگر دھماکہ اس قدر شدید تھا اور اتنی زبردست آواز پیدا ہوئی تھی کہ لوگ ایئرپورٹ سے نکل کر پارکنگ لاٹ کی طرف دوڑتے نظر آئے۔ میں سمجھ گیا کہ کسی تخریب کار نے ایئرپورٹ کے اندر بم پھینک دیا ہے۔ میں نے لڑکے سے کہا۔ "کوئی بم پھٹا ہے ......ثنائی ابھی تک کیوں نہیں آئی؟"

پراسرار لڑکے نے اب بھی مجھے کوئی جواب نہ دیا اور ونڈ سکرین پر آگے کو جھکا غور سے ایئرپورٹ کے مین گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ لڑکے نے انجن سٹارٹ کر دیا۔

مین گیٹ میں سے لوگ گھبراہٹ کے ساتھ باہر بھی نکل رہے تھے اور کچھ دوڑ کر اندر بھی داخل ہو رہے تھے۔ پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں آنے لگیں۔ اتنے میں مجھے ثنائی نظر آئی۔ وہ لمبے کوٹ میں تھی۔ اس کے سر پر ہیٹ تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے تقریباً دوڑتی ہوئی ہماری گاڑی کی طرف آ رہی تھی۔ لڑکے نے گاڑی کو گیئر میں ڈال کر اس طرح گھمایا کہ میرے برابر والی خالی سیٹ سڑک کی جانب ہو گئی۔ لڑکے نے کہا۔ "دروازہ کھول دو میڈم۔"

میں نے دروازہ کھول دیا۔ ثنائی قریب آ چکی تھی۔ وہ جلدی سے گاڑی میں داخل ہوئی اور دروازہ بند کر کے سر کو سیٹ کے پیچھے لگا کر نیچے کھسک گئی تاکہ وہ باہر سے کسی کو نظر نہ آ سکے۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا ہاتھ ٹھنڈا تھا اور کانپ رہا تھا۔

گاڑی ایئرپورٹ کی عقبی سڑک پر سے نکل کر فوارے کے پیچھے جو بڑی سڑک تھی اس پر آ گئی۔ یہاں سے گاڑی نے دائیں جانب ٹرن لیا تو میں نے دیکھا کہ ایئرپورٹ کے عقب میں جو ہوٹل کی شاندار بلڈنگ تھی اس کی چوتھی منزل کے ایک کمرے میں آگ کے شعلے اور دھواں باہر نکل رہا تھا۔ آگ بجھانے والے انجن کا سائرن زور زور سے بج رہا تھا اور لوگ ادھر ادھر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ فٹ پاتھ پر تماشائیوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ ہماری گاڑی ہوٹل کے پہلو سے ہو کر آگے نکل گئی۔ ثنائی نے ابھی تک مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے بھی اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے اور ہم کہاں جا رہے ہیں۔

میں بھی سیٹ پر کھسک کر نیچے ہو گیا تھا۔ میں نے ثنائی کی طرف جھک کر پوچھا۔ "تم ٹھیک ہو نا؟"

ثنائی نے جواب دینے کی بجائے میرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ دیا۔ گرم اوور کوٹ کے اندر سے مجھے اس کے دل کی دھڑکن محسوس ہونے لگی۔ ثنائی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے لڑکے کا نام لے کر اطالوی میں کہا۔ "گاڑی تیز کر دو۔"

گاڑی کی رفتار مزید تیز ہو گئی۔ شہر کی بارونق سڑکیں اور جگمگاتی عمارتیں پیچھے رہ گئیں اور گاڑی ہائی وے پر آ کر فل سپیڈ کے ساتھ شمال کی طرف روانہ ہو گئی۔ تب میں نے ثنائی سے پوچھا۔ "ہم کس طرف جا رہے ہیں؟"

اب ہم سیٹ پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے مگر ثنائی نے ہیٹ کو ماتھے پر آگے کو اس طرح جھکایا ہوا تھا کہ کوئی گزرتی گاڑی میں بیٹھا اس کی شکل نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ثنائی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اب اس کا ہاتھ گرم تھا اور کپکپا بھی نہیں رہا تھا۔ اس کی آنکھ ٹھیک ہو گئی تھی۔ سوجن کا بھی کہیں نام و نشان باقی نہ تھا۔ وہ بھرپور میک اپ میں تھی۔ جب اس نے میرے سوال کا جواب نہ دیا تو میں نے مسکراتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔ "اتنا بھاری میک اپ کر کے تم کہاں جا رہی تھی؟"

ثنائی نے بڑی محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "میں صرف تمہارے پاس آ رہی تھی۔"

میں نے پوچھا۔ "اچھا یہ بتاؤ پلیز کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور ہوٹل میں یہ دھماکہ کیسا ہوا تھا؟"

ثنائی نے میرا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "سب کچھ بتادوں گی، ابھی خاموش رہو۔"

وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد گردن گھما کر پچھلے شیشے میں سے ہائی وے کو دیکھ لیتی تھی۔ اس نے ایک بار ڈرائیور لڑکے سے اطالوی زبان میں کہا۔ "کوئی ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا؟"

لڑکے نے دوبارہ شیشے کی طرف غور سے تکنے کے بعد کہا۔ "نہیں، ابھی تک کوئی نہیں ہے۔"

ثنائی نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہا۔ "میں بہت تھک گئی ہوں۔ میرے اعصاب شل ہو چکے ہیں۔ میں تھوڑی دیر کے لیے سونے کی کوشش کرتی ہوں۔"

اس نے سر سیٹ کی پشت سے لگا کر فیلٹ ہیٹ اپنے چہرے کے اوپر کر لیا۔ میں نے بھی اپنا سر پیچھے لگا دیا۔ گاڑی ایک نپی تلی رفتار کے ساتھ ہائی وے پر دوڑی جا رہی تھی۔ ہمارے آگے پیچھے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دوسری گاڑیاں بھی تھیں۔ میں نے سپیڈو میٹر کی سبز روشنی میں دیکھا۔ ہماری رفتار ستر میل فی گھنٹہ تھی۔ ہم وینس شہر کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل آئے۔ اب ہائی وے پر گاڑیوں کی تعداد بھی کم ہو گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ثنائی سو گئی ہو گی مگر وہ جاگ رہی تھی۔ اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دھیمی آواز میں کہا۔ "تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے اطالوی زبان میں میرے پاس کوئی لفظ نہیں ہے۔"

میں نے اس کا ہاتھ گرم جوشی سے دباتے ہوئے کہا۔ "ثنائی! میں جو کچھ کر رہا ہوں، صرف اس وجہ سے کر رہا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔"

یہ اعتراف میں نے پہلی بار اس کے سامنے کیا تھا اور اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر کیا تھا۔ ثنائی نے فیلٹ ہیٹ چہرے کے آگے سے ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ گاڑی کے اندر زیادہ روشنی نہیں تھی۔ باہر سے کوئی گاڑی گزرتی تو اس کی روشنی اندر چمک جاتی تھی۔ لیکن اتنا اندھیرا بھی نہیں تھا کہ مجھے کچھ دکھائی نہ دے رہا ہو۔ میں نے دیکھا کہ ثنائی کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ پھر اس نے اپنا چہرہ میرے بازو میں چھپا لیا اور ہلکی ہلکی سسکیاں لینے لگی۔ میں خاموش رہا اور اپنا بازو اس کے گرد ڈال کر اس کے بازو کو آہستہ آہستہ تھپتھپانے لگا۔ میں نے دل میں سوچا کہیں میں نے ثنائی کے آگے جھوٹ تو نہیں بول دیا۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ میں بڑی آسانی سے جھوٹ بول دیا کرتا تھا اور خاص طور پر پاکستان میں میں نے کئی لڑکیوں کے آگے جھوٹ بولا تھا اور ان سے محبت نہ ہوتے ہوئے بھی انہیں یقین دلایا تھا کہ میں ان سے شدید محبت کرتا ہوں۔

لیکن میں نے ثنائی کے آگے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ یہ میں آپ کے سامنے بھی کہتا ہوں کہ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ کیونکہ میں نے آپ سے وعدہ کر رکھا ہے کہ میں جو کچھ لکھوں گا، جو کہوں گا، سچ کہوں گا، سچ لکھوں گا۔ اس واقعے کو کتنے سال بیت گئے ہیں، اب جب میں

اپنا سفرنامہ اور سرگزشت لکھنے بیٹھا ہوں تو ہر چیز کھل کر میرے سامنے آ رہی ہے۔ یقین کریں کہ میں واقعی نتالی سے محبت کرنے لگا تھا۔ ورنہ یہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میرے جیسا آدمی جو لڑکیوں سے آگے اکثر جھوٹ بولتا ہو ایک غیر ملکی لڑکی کے لیے اپنی جان پر کھیل جانے کے لیے تیار ہو جاتا۔

رات آدھی گزر چکی تھی کہ ہم وینس سے آگے اٹلی کے شمال مشرقی پڈوو پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم نے ریل پکڑی اور اٹلی کے دوسرے شہر ویرونا کے لیے چل پڑے۔ پُراسرار لڑکا یہاں ہم سے جدا ہو گیا۔ میں نے نتالی سے پوچھا کہ یہ لڑکا کون تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اس کی بڑی بہن کا بیٹا ہے اور پڈوو میں جاب کرتا ہے۔ نتالی نے اسے اسی مقصد کے لیے پڈووا سے وینس بلایا تھا۔ کیونکہ وینس میں وہ کسی دوسرے آدمی پر بھروسہ نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے ساشی کے قتل پر افسوس کا اظہار کیا تو نتالی کا چہرہ اداس ہو گیا۔ کہنے لگی۔ ''وہ میری ایک ہی سہیلی تھی۔ میری خاطر اس نے اپنی جان قربان کر دی۔ میں اس کے احسان کو مرتے دم تک کبھی نہ بھلا سکوں گی۔''

میں نے پوچھا۔ ''آخر ہوا کیا تھا۔۔۔۔۔۔۔ ساشی کے فلیٹ پر کون لوگ تم دونوں کو اغوا کر کے لے گئے تھے؟''

نتالی نے کہا۔ ''مارکو کے آدمیوں کے سوا اور کون لوگ ہو سکتے ہیں۔''

''وہ تمہیں کہاں لے گئے تھے اور ساشی کو انہوں نے اسی روز قتل کیوں نہیں کر دیا؟''

وہ کہنے لگی۔ ''ہم دونوں کو مارکو کے اسی فارم میں پہنچا دیا گیا تھا جہاں سے تم اور ساشی مجھے نکال کر لے آئے تھے۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ساشی کے ساتھ وہ کون تھا جس نے ان کے آدمی کو شدید زخمی کیا تھا اور مجھے وہاں سے نکالا تھا۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ساشی اکیلی یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔''

''پھر کیا ساشی نے انہیں میرے بارے میں بتا دیا؟''

میں نے ابھی نتالی سے یہ بات پوشیدہ رکھی تھی کہ مارکو کے دو غنڈے اکثر میری تلاش میں کلب میں بھی آئے تھے اور انہوں نے میرے بارے میں مجھ ہی سے پوچھ گچھ کی تھی اور تب مجھے پتہ چلا تھا کہ ساشی نے انہیں میرا نام اور حلیہ اصلی نہیں بتایا۔ نتالی کہنے لگی۔ ''انہوں نے ساشی کو بڑی سخت اذیتیں دیں۔ اسے بہت مارا پیٹا مگر اس نے تمہارا نام نہ دیا۔ ساشی نے مجھے بتایا تھا کہ اذیتوں سے تنگ آ کر اس نے مارکو کے غنڈوں کو تمہارا غلط نام اور غلط حلیہ بتا دیا تھا۔''

میں نے نتالی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ساشی بڑی گریٹ عورت تھی نتالی! اب میں تمہیں بتاتا ہوں کلب میں مارکو کے آدمی میرا پتہ معلوم کرنے آئے تھے۔۔۔۔۔۔''

پھر میں نے نتالی کو سارا واقعہ بیان کر دیا اور کہا۔ ''مجھے یہ بتاؤ کیا وہ بدمعاش گارڈ میرا پتھر لگنے سے مر گیا تھا؟''

نتالی نے کہا۔ "نہیں، وہ زندہ بچ گیا تھا مگر شدید زخمی ہو گیا تھا اور اس کی کھوپڑی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ ابھی تک وینس کے ہسپتال میں ہے۔"

"کیا انہوں نے تم پر تشدد نہیں کیا؟ تم سے میرے بارے میں نہیں پوچھا؟" میں نے نتالی سے سوال کیا۔

وہ کہنے لگی۔ "اصل میں اب وہ مجھ پر مزید تشدد کر کے میرا حلیہ بگاڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے مجھ سے وہ کام لینا تھا جس کا دھماکہ تم نے آج ایئرپورٹ کے پاس سنا تھا۔"

میں نتالی کا منہ تکنے لگا۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "تو کیا یہ دھماکہ تم نے کیا تھا نتالی؟"

نتالی نے ٹھنڈا سانس بھرا اور اپنا سر ٹرین کی کھڑکی کے ساتھ لگا دیا جس پر سفید پردے آدھے کھنچے ہوئے تھے۔ رات کا پچھلا پہر تھا اور ٹرین شمالی اٹلی کے پہاڑی علاقے میں سے گزر رہی تھی۔ نتالی اپنے ساتھ کافی پیسے لے کر آئی تھی۔ اس نے پڈوا سے ویرونا تک کے لیے فسٹ کلاس کا ایک دو آدمیوں کا کوپہ لے لیا تھا اور ہم اسی کوپے میں سفر کر رہے تھے۔ آمنے سامنے دو بستر لگے تھے اور ان پر صاف ستھری سفید چادریں بچھی تھیں اور گولڈن کلر کے کمبل بڑی نفاست سے تہہ کر کے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے نتالی سے اپنا سوال دہراتے ہوئے پوچھا۔ "نتالی! تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیا وہ دھماکہ تم نے کیا تھا؟"

نتالی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں .... وہ دھماکہ میں نے ہی کیا تھا مگر جہاں ہرکو دھماکہ کرنا چاہتا تھا وہاں نہیں کیا تھا .... یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔"

میں نے کہا۔ "پلیز نتالی! مجھے سب کچھ بتاؤ۔ سب کچھ .... کیونکہ میں تم سے پیار کرتا ہوں اور میں تمہارے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ مجھ سے کوئی بات نہ چھپاؤ۔ میں نے تمہاری خاطر جان کی بازی لگا دی تھی اور یقین کرو اگر وقت پڑا تو میں تم پر اپنی جان بھی نچھاور کر سکتا ہوں۔"

نتالی پر میرے جملوں کا شدید اثر ہوا۔ اس نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔ عورت چاہے کالاش کی ہو چاہے یورپ کی، وہ محبت اور خلوص کی پیاسی ہوتی ہے۔ وہ خود بھی اندر سے محبت اور خلوص کا پیکر ہوتی ہے۔ اس کے دل کے کسی نہ کسی کونے میں محبت، ممتا اور سچائی اور قربانی اور ایثار کا سرچشمہ ابل رہا ہوتا ہے اور اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اس کے خلوص کو پہچانے، اس سے سچا پیار کرے اور اس کو قربانی اور ایثار کا موقع دے۔ مرد نے عورت کو بہت ہی کم سمجھا ہے۔ اس نے اسے اپنے جذبات کا کھلونا بنایا ہے۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر نہیں دیکھا کہ اصل عورت محبت، پیار، خلوص اور ایثار کا نام ہے۔

ویرونا ایکسپریس تیزی سے شمالی اٹلی کے پہاڑی علاقے میں بھاگی چلی جا رہی تھی۔ ابھی باہر آسمان پر سپیدۂ سحر نمودار نہیں ہوا تھا۔ میں

نے ثنائی سے بم دھماکے سے متعلق دوبارہ سوال کیا' تو اس نے مجھے ساری کہانی سنائی۔ میں اس کہانی کو جو سچے واقعات پر مشتمل تھی اپنی زبان میں بیان کرتا ہوں۔

بم دھماکے کی روداد

مارکو اٹلی کے وینس کے علاقے میں مافیا کا ہیڈ تھا۔ سیاسی قتل' دہشت گردی' ارب پتی تاجروں کا کاروباری رقابت کی بنا پر قتل اور اغواء برائے تاوان ۔۔۔۔۔۔۔ یہ مارکو کے گینگ کی سرگرمیاں تھیں۔ اٹلی میں مافیا کے سربراہ کا مارکو کو حکم ملا کہ اٹلی کا ارب پتی تاجر زاویرے وینس میں کاروباری دورے پر آیا ہوا ہے' اسے قتل کرنا ہے۔ بس صرف دو لفظی حکم تھا۔ مارکو نے فوراً تیاری شروع کر دی۔

اسے معلوم ہوا کہ وینس کے فائیو سٹار ہوٹل میں زاویرے نے کچھ کاروباری لوگوں کو کھانے پر بلایا ہے۔ اس نے ثنائی کو یہ مشن سونپ دیا۔ ثنائی اس وقت تک تشدد اور گھناؤنی جسمانی اذیتوں سے نڈھال ہو کر اپنے آپ کو مارکو گینگ کے حوالے کر چکی تھی۔ لیکن دل میں وہ کسی موقع کی تلاش میں تھی۔ آج اسے موقع مل گیا تھا۔ کیونکہ اسے کسی وقت بھی تنہا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ گینگ کے دو مشٹنڈے پستولیں جیب میں ڈالے سائے کی طرح اس کے پیچھے لگے رہتے تھے۔ جب سے بتایا گیا کہ فلاں دن رات کے نو بجے ائیرپورٹ کے عقب والے فائیو سٹار ہوٹل میں ارب پتی زاویرے کو بم کے دھماکے سے ہلاک کرنا ہے تو ثنائی کو امید کی ہلکی سی کرن نظر آئی۔ اس نے اپنے ذہن میں سارا پروگرام مرتب کر لیا اور اپنے بھائی مجھ سے کسی طرح رابطہ کر لیا اور اس کے ہاتھ میں میرے نام خط روانہ کر دیا۔ ثنائی اس فائیو سٹار ہوٹل کے سارے باہر نکلنے والے راستوں سے واقف تھی۔ اس کے ذمے جو کام سونپا گیا تھا' وہ یہ تھا۔۔۔۔۔۔۔

وہ رات کے نو بجے فائیو سٹار ہوٹل کے ایک خاص کمرے میں پہنچے گی' جہاں اسے ویٹرس کا لباس پہنایا جائے گا۔ ایک ٹرالی پر کافی کا سارا سامان رکھا ہوگا۔ وہ ڈنر کے بعد کافی کی ٹرالی لے کر ڈائننگ روم میں سیدھی ارب پتی زاویرے کی کرسی کے پیچھے جائے گی اور ٹرالی اس کے عقب میں ستون کے پاس رکھ کر واپس آ جائے گی۔ ٹرالی میں جو کافی کا گلدان رکھا ہوگا' اس میں پلاسٹک کا زبردست دھماکے سے پھٹنے والا بم رکھا ہوا ہوگا۔ اس بم کو ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ذریعے چلایا جانا تھا۔ ثنائی بم والی ٹرالی وہیں چھوڑ کر واپس اسی کمرے میں آ جائے گی جہاں وہ ویٹرس والی وردی اتار کر اپنے کپڑے پہن لے گی۔ اس دوران ایک آدمی ہیڈ بیرے کی وردی میں برابر اس کی نگرانی کر رہا ہوگا۔ وقت مقررہ پر ثنائی کو گاڑی میں بٹھا کر فائیو سٹار ہوٹل پہنچا دیا گیا۔ اسے عقبی دروازے سے دوسرے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں مارکو کے تین آدمی پہلے سے موجود تھے۔

ہوٹل کی ایک ویٹرس بھی بیڈ روم میں بند تھی۔ اس ویٹرس کی وردی اور نمبر لگا کر ثنائی نے کافی کی ٹرالی ارب پتی زاویرے کی میز کے عقب میں لے جانی تھی۔ ثنائی کو ایک آدمی بیڈ روم میں لے گیا۔ وہاں اصلی ویٹرس کے منہ پر سکاچ ٹیپ لگی تھی۔ اس کی وردی اتروا کر ثنائی کو

پہنائی گئی۔ جو وقت آپریشن شروع کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ ٹھیک اس وقت مارکو کے خاص آدمی سارکو نے ڈرائنگ روم کے کونے میں تیار رکھی ہوئی کافی کی ٹرالی میں گلدان رکھ دیا اور گلدان رکھنے سے پہلے اس نے گلدستہ نکال کر سنان کو پلاسٹک کا وہ بہت ہی طاقتور بم دکھایا جسے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے کافی کی ٹرالی زاویرے کے عقب میں رکھنے کے ٹھیک دس منٹ بعد پھٹنا تھا کیونکہ اسی وقت ڈنر جاری ہو گا۔ سنان، سارکو اور دوسرا ایکسرا بھی اپنی اپنی گھڑیاں دیکھنے لگے۔ یہ گھڑیاں انہوں نے پہلے سے ملا رکھی تھیں۔ جب گھڑی کی سوئیاں ایک خاص ہندسے پر پہنچیں تو سارکو نے چٹکی بجا کر سنان کو اشارہ کیا۔ سنان نے ٹرالی کمرے سے باہر نکالی اور کاریڈور میں سے تیزی سے گزرتے ہوئے بڑی راہداری میں آ گئی جہاں سے ہوٹل کے ویٹر وغیرہ کھانے پینے کا سامان لے کر ڈائننگ روم کی طرف جاتے تھے۔ سارکو کمرے میں ہی رہا تھا۔ اس کا ساتھی سنان کی نگرانی کے طور پر چند قدم پیچھے چلا آ رہا تھا۔ جب سنان ڈائننگ روم میں داخل ہوئی تو نگران جاسوس باہر ایک طرف رک گیا۔ اسے یہاں کھڑے رہ کر سنان کی واپسی کا انتظار کرنا تھا اور پھر اسے اپنی نگرانی میں واپس کمرے میں لانا تھا جہاں سنان نے لباس تبدیل کرنا تھا اور پھر تینوں کو فائیو سٹار ہوٹل کی اس منزل کے عقبی لفٹ کے نیچے جانا تھا اور پارکنگ لاٹ سے گاڑی نکال کر ہوٹل سے دو فرلانگ دور جا کر ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا دینا تھا اور ہوٹل کی تیسری منزل کے ڈائننگ روم کو ایک دھماکے کے ساتھ اڑ جانا تھا۔ یہ سارا پروگرام ایک ایک سیکنڈ کے حساب سے طے تھا۔

مگر سنان نے بھی اپنے دل میں ایک پروگرام طے کر رکھا تھا۔ اسے صرف ایک ہی خطرہ تھا کہ کہیں اس کا محافظ اس کے ساتھ ہی ڈائننگ روم میں نہ آ جائے۔ کیونکہ پھر وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی اور اس کا منصوبہ ناکام ہو جاتا۔ لیکن یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ سارکو کا ساتھی جو سنان کی ٹرالی کے چند قدم پیچھے چل رہا تھا ڈائننگ روم کے باہر ہی کھڑا ہو گیا۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ تھی اور وہ یہ تھی کہ ارب پتی تاجر زاویرے نے شہر کے سربرآوردہ تاجروں کو کھانے پر بلا رکھا تھا اور ان میں سے کچھ لوگ سارکو اور اس کے ساتھی کی صورتوں سے واقف تھے اور یہ لوگ انہیں اپنی شکلیں نہیں دکھانا چاہتے تھے۔ سنان ٹرالی لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔ ڈائننگ روم میں ڈنر ہو رہا تھا۔ فضا اعلیٰ قسم کے کھانوں کی خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔ ان میں خوش لباس اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین کے قیمتی پرفیومز کی خوشبوئیں بھی شامل تھیں۔ آدمیوں کی باتیں کرنے اور پلیٹوں سے چھری کانٹوں کے ٹکرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سنان نے جو پروگرام اپنے دل میں طے کر رکھا تھا اس پر عمل کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

سنان ٹرالی کو ارب پتی تاجر زاویرے کی کرسی کے عقب میں ستون کے پاس کھڑی کرنے کی بجائے کونے میں جو لفٹ لگی تھی اس کے پاس لے گئی اور لفٹ کا بٹن دبا دیا۔ کمرے میں جو بیرے سروس میں مصروف تھے انہوں نے سنان کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ کیونکہ وہ ویٹرس کے لباس میں تھی اور سب یہی سمجھے کہ وہ کافی کی سروس کے سلسلے میں نیچے جا رہی ہو گی۔ لفٹ اوپر سے نیچے آ گئی۔ دروازہ کھلا۔ سنان

دان سمیت لفٹ میں داخل ہوگئی۔ اور دوسری منزل کا بٹن دبا دیا۔ دوسری منزل میں وہ لفٹ سے نکلی۔ ساتھ ہی جنریٹرز روم تھا جہاں صفائی وغیرہ کا سامان پڑا تھا۔ ثنائی کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔

اس نے گلدان اٹھا کر جنریٹرز روم کے ایک کونے میں رکھ دیا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ کمرہ خالی ہوتا ہے۔ یہاں بم پھٹ بھی گیا تو جانی نقصان نہیں ہوگا۔ اس طرف سٹور روم ہی تھے۔ اس کے بعد وہ تیزی سے مڑی اور اوپر تیسری منزل میں آئی۔ ٹرالی کو ایک طرف کھڑا کیا اور تیز تیز قدموں سے ڈریسنگ روم سے باہر نکل آئی۔ سارکو کا آدمی چند قدموں کے فاصلے پر دیوار سے لگ کر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ثنائی کو تیز تیز قدموں سے آتی دیکھ کر وہ واپس پلٹا۔ ثنائی نے قریب سے گزرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ٹرالی راہداری کے پیچھے رکھ دی ہے۔ مجھے باتھ روم میں جانے کی زبردست حاجت ہو رہی ہے۔ تم کمرے سے چلو میں ابھی آتی ہوں۔''

محافظ نے ثنائی کی طرف گھور کر دیکھا۔ ثنائی نے مسکرا کر اس کے گال کو آہستہ سے تھپتھپایا اور کہا۔ ''میری جان! مجھ پر شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں تو اب ساری زندگی تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔''

اور ثنائی نے اس کا ماتھا چوم لیا۔ محافظ ثنائی کے جال میں آ گیا اور بولا۔ ''جلدی باہر نکلنا ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں یہیں کھڑا ہوں۔''

ثنائی مسکراتے ہوئے سامنے والے عورتوں کے باتھ روم میں داخل ہوگئی۔ اس باتھ روم کا عقبی دروازہ دوسری راہداری کی طرف کھلتا تھا۔ یہ ساری معلومات ثنائی نے اپنے بھائی اور اسی پراسرار لڑکے برونو کی مدد سے معلوم کر رکھی تھیں۔ ثنائی نے باتھ روم کا دروازہ بند کیا اور جلدی جلدی قدم اٹھاتی باتھ روم کے عقبی دروازے سے دوسری راہداری میں آ گئی۔ یہاں سے لفٹ میں گئی اور ہوٹل کی لابی میں آ گئی۔ اور وہاں سے تیز تیز چلتی ایئرپورٹ کی سڑک پار کر کے تقریباً دوڑتی ہوئی پارکنگ لاٹ میں وینس کے مجسمے کے پاس پہنچ گئی جہاں میں اور اس کا بھائی برونو پہلے سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

اس کے بعد اوپر کیا ہوا؟

ثنائی کا منتظر محافظ ضرور دو منٹ انتظار کرنے کے بعد باتھ روم میں داخل ہو گیا ہوگا۔ جب اسے وہاں ثنائی نظر نہیں آئی ہوگی تو وہ دوڑتا ہوا سارکو کے پاس آیا ہوگا اور اسے بتایا ہوگا کہ ثنائی بھاگ گئی ہے۔ یقیناً سارکو نے یہی فیصلہ کیا ہوگا کہ جتنی جلدی ہو سکے ہوٹل سے نکل جانا چاہیے اور باہر نکل کر وہ گاڑی میں بیٹھے ہوں گے اور دو فرلانگ یا اس سے بھی کم فاصلے پر جا کر سارکو نے ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا دیا ہوگا۔ زبردست دھماکے اور آگ کے شعلوں اور دھوئیں کو دیکھ کر کسی کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا ہوگا کہ دھماکہ دوسری منزل کے جنریٹرز روم میں ہوا ہے۔ خود میں نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا کہ دھماکہ تیسری منزل پر ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے سارکو اور اس کے باس ساتھی کو معلوم ہو گیا ہو کہ

دھماکہ دوسری منزل میں ہوا ہے اور وہ انتہائی غصے کے عالم میں پستولیں نکال کر گاڑی سے کر ستانی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہوں۔ مگر اس وقت تک ہم ہائی وے پر بہت دور نکل چکے تھے۔

ستانی نے جو کہانی سنائی' میں اسے بڑے غور سے سن رہا تھا۔

"اب تک تو ان لوگوں کو صاف پتہ چل گیا ہوگا کہ تم نے دوسری منزل میں گلدستہ رکھا تھا۔ ارب پتی تاجر دیرے سے بھی زندہ ہوگا۔ مارکو کے آدمی تمہاری تلاش میں ہوں گے۔"

ستانی کہنے لگی۔ "وہ اس طرف نہیں آئیں گے جہاں ہم جا رہے ہیں۔"

میں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ ان لوگوں کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔ ان کے آدمی تو اٹلی کے ہر شہر میں پھیلے ہوئے ہیں۔

"ضروری بات ہے کہ انہوں نے پڈووا اور ویرونا شہر میں بھی جہاں ہم جا رہے ہیں اپنے آدمیوں کو خبردار کر دیا ہوگا۔"

ستانی کہنے لگی۔ "ویرونا کے لوگ میری شکل سے واقف نہیں ہیں۔ جتنی دیر میں ارجنٹ میل کے ذریعے ان تک میری تصویر پہنچے گی ہم ویرونا سے بھی آگے بہت دور نکل چکے ہوں گے۔"

میں کسی حد تک مطمئن ہو گیا مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ ہم خطرے سے دور نہیں بلکہ خطرے کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ صورت حال ایسی بن گئی تھی کہ میں ستانی کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ اس نے صرف میرے بھروسے پر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ صرف اس امید میں کہ میں اسے گناہ کی دلدل سے نکالنے اور ایک بہتر شریفانہ زندگی گزارنے میں مدد دوں گا۔ میں نے اپنی تسلی کے لیے کہا۔

"ستانی! اگر خدانخواستہ مارکو کے آدمیوں نے ہمیں پکڑ لیا تو تمہیں تو وہ اپنے ساتھ لے جائیں گے لیکن مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ خیر کوئی بات نہیں' تمہاری خاطر میں ہر طرح کا خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔" میں نے ستانی کا ہاتھ چوم کر کہا۔ "میری جان' تمہارے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔"

ضمیر کی آواز

لیکن میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ویرونا سٹیشن پر ستانی سے الگ ہو جاؤں گا۔ میں ستانی سے محبت ضرور کرتا تھا۔ لیکن اس کی خاطر اپنی جان مزید خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ کیونکہ اب اگر وہ لوگ ہمیں پکڑ لیتے ہیں (اور یقینی بات تھی کہ ایک نہ ایک دن انہوں نے ہمیں پکڑ لینا تھا) تو پھر یا تو مجھے اسی وقت شوٹ کر دیں گے اور پھر تشدد کریں گے اتنی اذیتیں دیں گے کہ میں تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گا۔ پردیس میں مجھے ایسی ذلیل موت مرنا ہرگز گوارا نہیں تھا۔ مجھے اپنا گھر' بھائی' بہن اور لاہور شہر کے اپنے دوست یاد آنے لگے تھے۔ اب میرا دماغ میرے ضمیر کو اپنی مرضی کے مطابق سمجھانے لگا کہ یہ ستانی لڑکی محض ایک ڈانسر ہے تم اس کی

باتوں پر کیوں اعتبار کرتے ہو۔ ہو سکتا ہے کل کو وہ پھر اسی ڈگر پر آ جائے۔ اور پھر تم اس کے ساتھ اگر شادی بھی کر لو گے تو مارکو مافیا کے لوگ تمہیں کبھی نہ کبھی ضرور دبوچ لیں گے۔ ستانی تو بڑے آرام سے اپنی پرانی زندگی اختیار کر لے گی مگر تم رگڑے جاؤ گے۔ آخر یہ اطالوی لڑکی اتنی بھی نیک پروین نہیں ہے۔ ٹرین ویرونا کے ریلوے سٹیشن میں داخل ہو رہی تھی اور میں نے اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیا تھا اور اب یہ سوچ رہا تھا کہ ستانی کو ریلوے سٹیشن پر کس جگہ اکیلا چھوڑوں۔

ویرونا

ٹرین ویرونا کے ریلوے سٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔

اس دوران ستانی نے مجھے بتا دیا تھا کہ اس کا پروگرام کیا ہے۔ اٹلی کے اس شمالی شہر سے دور پہاڑی علاقے میں کہیں ایک گاؤں تھا جہاں ستانی کی ایک آنٹی رہتی تھی۔ ستانی میرے ساتھ کچھ روز وہاں روپوش ہو کر رہنے کے بعد سوئٹزرلینڈ کی طرف نکل جانا چاہتی تھی جہاں اس کا ارادہ مجھ سے شادی کر کے ایک نئی زندگی شروع کرنے کا تھا۔ اس نے یہ پروگرام بنا رکھا تھا اور میں نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ ریلوے سٹیشن پر اترتے ہی اسے کسی بہانے ویٹنگ روم میں تھوڑی دیر کے لیے انتظار کرنے کو کہوں گا اور خود شہر میں روپوش ہو جاؤں گا۔ جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ ستانی میرا انتظار کرتے کرتے تھک ہار کر چلی گئی ہو گی تو ریلوے سٹیشن پر آ کر اٹلی کے کسی دوسرے شہر کی طرف رفوچکر ہو جاؤں گا۔ پاسپورٹ ہر وقت میں اپنی جیکٹ کی اندر کی جیب میں ہی رکھتا تھا۔ میرے پاس اتنی رقم بھی تھی کہ میں وہاں سے میلان کے شہر تک با آسانی جا سکتا تھا۔ میلان اٹلی کے شمال میں ایک بڑا شہر تھا۔ وہاں مجھے کسی نہ کسی کلب میں کام مل سکتا تھا۔ تھوڑا بہت وہاں کماؤں گا اور پھر وہاں سے کسی دوسرے شہر چلا جاؤں گا۔

ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی تھی۔ اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا اور شام کے سائے گہرے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ عجیب اتفاق تھا کہ پیچھے سارا راستہ آسمان صاف رہا تھا مگر ویرونا کے قریب پہنچتے پہنچتے آسمان پر بادل نظر آنے لگے تھے اور لگتا تھا کہ بارش ہو گی۔ ویرونا کے پلیٹ فارم پر زیادہ رش نہیں تھا۔ ٹرین ابھی رکی نہیں تھی کہ ستانی نے اپنا لباس درست کیا۔ بڑی محبت سے میرا ہاتھ چوم کر کہا۔

”میں پہلے باہر نکلوں گی۔ تم میرے پیچھے پیچھے کچھ فاصلہ چھوڑ کر آنا۔ ہو سکتا ہے مارکو کے آدمی یہاں ہماری تلاش میں موجود ہوں۔“

کوبرا ایکشن

میں نے دل میں کہا مارکو اور اس کے آدمی جائیں جہنم میں۔ میں تو یہاں سے ایسا غائب ہوں گا کہ پھر میری شکل بھی کسی کو نظر نہیں آئے گی۔ ٹرین رک گئی۔ ابھی تک ڈبے کی کھڑکی کے پردے گرے ہوئے تھے۔ ٹرین رکی تو ستانی نے پردے کو ایک طرف کھسکا کر پلیٹ فارم

پر نظر ڈالی۔ اس نے جلدی سے پردہ برابر کیا اور گھبرا کر وہیں بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ستالی کا سانس اوپر ہی رہ گیا تھا۔

"میرے خدا.......... کوبرا اپنے آدمیوں کے ساتھ آ رہا ہے۔"

میں ابھی کچھ بھی نہیں سمجھا تھا کہ یہ کوبرا کون بلا ہے کہ ڈبے کا دروازہ دھڑاک سے کھلا اور تین ہٹے کٹے انسان اندر گھس آئے اور جو آدمی آگے آگے تھا اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی نال پر سائیلنسر چڑھا ہوا تھا۔ اس نے ستالی کا نام لے کر غراتے ہوئے کہا۔ "تم کیا سمجھتی تھی کہ ہمارے چنگل سے نکل جاؤ گی؟"

میں ذرا پیچھے کو کھسکنے لگا تو اس نے ریوالور کا رخ میری طرف کر دیا اور اطالوی میں کہا۔ "اب تم بھی زندہ نہیں بچو گے۔"

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں اطالوی زبان نہیں جانتا۔ اتنے میں اس کے آدمیوں نے آگے بڑھ کر ستالی کی پسلیوں میں زور سے ایک ایک گھونسہ مارا۔ ستالی وہیں دوہری ہو کر سیٹ پر گر پڑی۔ ایک گھونسہ اس کے جبڑوں پر پڑا۔ ستالی بے ہوش ہو چکی تھی۔ جو آدمی آگے آگے تھا یقیناً اسی کا نام کوبرا تھا۔ اس کو دیکھ کر ہی ستالی نے کوبرا کا نام لیا تھا۔ کوبرا نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے فوراً بے ہوش ستالی کو اٹھایا اور ڈبے سے باہر نکل گئے۔ کوبرا نے ریوالور کی نالی میری کمر کے ساتھ لگا دی اور بالکل میرے ساتھ لگ کر بولا۔ "باہر چلو۔ ذرا ادھر ادھر ہوئے تو چھ گولیاں تمہارے جسم کے پار ہو جائیں گی۔"

میں یوں ظاہر کرنے لگا جیسے میں کچھ نہیں سمجھا۔ اس نے میرے سر کے پیچھے زور سے مکا مارا۔ میں آگے کو گرا۔ اس نے جھنجھوڑ کر مجھے اٹھایا اور گرج کر کہا۔ "آگے چلو۔"

وہ بالکل میرے ساتھ لگ گیا۔ ریوالور کی نالی میری پشت کے ساتھ لگی تھی۔ وہ بالکل میرے ساتھ لگ کر اس طرح ڈبے سے باہر نکلا جیسے کچھ بھی نہیں ہوا اور وہ میرا دوست ہے جو مجھے لینے آیا ہے اور پہلے جس عورت کو بے ہوشی کی حالت میں باہر نکالا گیا تھا وہ میری بیوی تھی اور بیمار تھی۔

میں نے سوچ رکھا تھا اور آگے کچھ ہی ہو گیا تھا۔ شاید خدا نے مجھے میری خودغرضی اور ستالی ایسی صاف ضمیر لڑکی کے ساتھ میری منافقت کی سزا دی تھی۔ وہ ستالی کو پہلے ہی کسی راستے سے نکال کر لے جا چکے تھے۔ ریوالور کی نالی میری پسلیوں کو چھو رہی تھی۔ اور یہ لوگ پکے بدقماش تھے۔ اگر میں وہاں شور بھی مچاتا تو اس کا نتیجہ یہی نکلتا کہ اوپر تلے کم از کم تین گولیاں میری پسلیاں توڑتی ہوئی نکل جاتیں۔ جہاں تک اٹلی کی پولیس کا تعلق تھا تو میں اسے بڑی اچھی طرح سے سمجھ چکا تھا۔ کہیں فائرنگ وغیرہ ہو تو پولیس کے آدمی فوراً دوسری طرف ر

لیتے تھے۔ جرائم پیشہ غنڈوں کی فائرنگ سے تو وہ خود گھبراتے تھے اور موقع واردات سے کھسک جاتے تھے یا صرف سیٹیاں بجاتے رہتے تھے۔ اتنے میں قاتل اپنا کام کر کے روپوش ہو چکا ہوتا تھا۔

کوبرا مجھے ریوالور کی نال سے دھکیلتا ہوا پلیٹ فارم کی پچھلی طرف لے گیا جہاں زیادہ روشنی نہیں تھی۔ یہاں کچھ گاڑیاں دور تک کھڑی تھیں۔ ان میں ایک ایمبولینس کی گاڑی بھی تھی۔ وہ مجھے لے کر ایمبولینس کی طرف بڑھا۔ جب مجھے اس نے ایمبولینس کے پچھلے دروازے سے اندر دھکا دے کر گرایا تو میں نے دیکھا کہ اس کے دونوں بھیڑیے نما غنڈے ساتھی پہلے سے وہاں بیٹھے تھے۔ درمیان میں سٹریچر پر انتونیا بے ہوش پڑی تھی اور اس کے اوپر سینے تک لال کمبل ڈال دیا گیا تھا۔ کوبرا بھی اندر گھس آیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور ایمبولینس گاڑی سائرن بجاتی ویرونا کی سڑکوں پر روانہ ہو گئی۔ گاڑی بند تھی۔ شیشوں پر پردے پڑے تھے۔ میں ایمبولینس کے بینچ پر دو غنڈوں کے درمیان سکڑ کر بیٹھا خدا کو یاد کر رہا تھا۔ کوبرا نے اطالوی زبان میں مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اطالوی جانتا ہوں۔ میں نے ایسا رد عمل ظاہر کیا جیسے میں کچھ نہیں سمجھا کہ اس نے کیا کہا ہے۔ اس نے انگریزی میں یہی سوال دہرایا تو میں نے کہا۔

"میں تو ٹورسٹ ہوں۔ مجھے اطالوی زبان نہیں آتی۔ اس لڑکی سے پڈوا ریلوے اسٹیشن پر ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ سفر کرنے کی دعوت دی اور میں ------"

یہ جملہ ابھی میری زبان پر ہی تھا کہ کوبرا نے زور سے میرے جبڑے پر ایک مکا مارا۔ میں دوسرے غنڈے کے اوپر گر پڑا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ درد سے میری چیخیں نکلیں تو ایک غنڈے نے اطالوی میں کہا۔ "اسے بے ہوش کر دو کوبرا! یہ راستے میں کوئی مصیبت نہ ڈال دے۔"

کوبرا نے جیب سے چمڑے کا ایک بٹوا نکالا۔ اس میں سرنج پہلے سے کسی دوائی سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے سوئی کے اوپر چڑھا ہوا کور اتارا۔ دونوں غنڈوں نے مجھے پکڑے رکھا اور کوبرا نے میرے بازو پر ٹیکہ لگا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو میں ایک مدھم روشن چھوٹے سے کمرے میں فرش پر پڑا تھا۔ میرے نیچے میٹرس تھی جس کے سپرنگ مجھے چبھ رہے تھے۔ میرا سارا بدن دکھ رہا تھا۔ جبڑا سخت درد کر رہا تھا۔ بے ہوشی کی دوا کا ابھی تک اثر تھا۔ آنکھیں پوری طرح سے نہیں کھل رہی تھیں۔ حلق خشک تھا۔ چھت پر تار کے ساتھ بندھا ایک بہت دھیمی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ قریب ہی فرش پر ایک کرسی پڑی تھی۔ سامنے لکڑی کا ایک ستون تھا۔ دیوار میں ایک ہی کھڑکی تھی جو بند تھی۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ دن کا وقت ہے یا رات کا۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور کوبرا اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھی نے مجھے بکرے کی طرح پکڑ کر اٹھایا اور زبردستی

سٹول پر بٹھا دیا۔ کوبرا میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور پھنکار سی آواز نکال کر انگریزی میں کہا۔

"ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ تم ہی وہ ٹورسٹ ہو جو ساشی کے ساتھ مارکو کے فارم پر آدھی رات کو آئے تھے۔ تم نے ہی ہمارے آدمی کی کھوپڑی توڑی تھی اور ساشی کو نکال کر لے گئے تھے۔ ہمیں صرف اتنا بتا دو کہ تمہارے ساتھ اور کون تھا اور ساشی تمہیں ساتھ لے کر کس کے پاس جا رہی تھی؟"

میں اپنے پہلے بیان پر قائم رہا اور بڑی مشکل سے اپنے حواس قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میں کسی ساشی واشی کو نہیں جانتا۔ میں تو ایک معمولی سا ٹورسٹ ہوں۔ پاکستان سے یہاں سیاحت کی غرض سے آیا ہوں۔ پڈو سٹیشن پر......"

کوبرا نے مجھ پر گھونسوں اور ٹھڈوں کی بارش کر دی۔ میں فرش پر گر پڑا اور اپنے آپ کو کوبرا کی لاتوں اور گھونسوں سے بچانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ جب کوبرا تھک گیا تو اس نے اطالوی زبان میں اپنے ساتھی سے کہا۔ "اسے صبح دریا پر لے جا کر ختم کر دو۔ لاش دریا میں ہی پھینک دینا۔"

میں درد سے کراہ رہا تھا مگر میں نے یہ ظاہر کیا کہ جیسے میں نے کوبرا کے جملے کا مطلب بالکل نہیں سمجھا۔ میں درد سے کراہتا رہا۔ ساتھ ہی میرے جسم میں خوف کی سرد لہر بھی دوڑ گئی۔ موت میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ یہ لوگ سرد مہر سفاک قاتل تھے۔ میں تو اس بات پر آج بھی حیران ہوں کہ انہوں نے مجھے وہیں پر ہی کیوں نہیں شوٹ کر دیا۔ خدا جانے اس میں کون سی مصلحت یا مجبوری تھی کہ جس مکان میں انہوں نے مجھے بند کر رکھا تھا وہ وہاں پر مجھے ہلاک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کوبرا پہلے کمرے سے باہر نکلا، پھر دوسرا آدمی بھی مجھے گھور کر دیکھتا باہر نکل گیا۔ دروازے پر باہر سے تالا لگانے کی آواز آئی۔ یہ میری جوانی کا زمانہ تھا، مجھے بری طرح مارا پیٹا گیا تھا مگر میں اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ جسم ضرور درد کر رہا تھا۔

صبح آنے والی موت کے خوف نے میرے جسم کی درد کو تھوڑی دیر کے لیے بھلا دیا۔ مجھے وہاں سے فرار کی کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کھولنا چاہی۔ کھڑکی کے پٹ کیلیں ٹھونک کر بند کر دیئے گئے تھے۔ میں سٹول پر بیٹھ گیا۔

بے وطن مسافر

پھر سجدے میں گر گیا اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ لاہور میں اپنے ماں باپ بہن بھائیوں اور دوستوں کی شکلیں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگیں۔ لاہور شہر کے بازار، دروازے، گلی کوچے اور بزرگانِ دین کے مزارات یاد آنے لگے۔ میں مسلسل رو رہا تھا اور خدا سے التجا کر رہا تھا کہ یا اللہ میری خود غرضیوں، میری کمینگیوں اور میری منافقتوں کو معاف فرما دے۔ میں نے بڑے گناہ کیے ہیں، شاید اتنے گناہ نہیں کیے جتنے گناہ کے ارادے کیے ہیں۔ مگر گناہ کا ارادہ کر لینا بھی گناہ کرنے کے برابر ہوتا ہے

تو بخشش کرنے والا ہے مجھے بخش دے۔ میری جان بچا لے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب کبھی اپنے آپ کو ہلاکت میں نہیں ڈالوں گا۔ کبھی کوئی گناہ نہیں کروں گا' بلکہ گناہ کا ارادہ کیا تو گناہ کا خیال بھی دل میں نہیں لاؤں گا۔

میں نے سجدے سے سر اٹھایا تو مجھے محسوس ہوا کہ میرا ذہن کچھ ہلکا ہو گیا ہے۔ جسم کا درد بھی کافی گھٹ گیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ میاں نے میری فریاد میری دعا قبول فرما لی ہے۔ اس یقین نے میرے اندر جیسے ایک نئی طاقت' ایک نئی توانائی بھر دی۔ میرا ذہن تیزی سے سوچنے لگا کہ میں وہاں سے کیسے فرار ہو سکتا ہوں۔ ابھی تک مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ وقت کون سا ہے' آیا دن ہے یا رات ہے۔ میری گھڑی اور پاسپورٹ وغیرہ ان لوگوں نے نکال لیے تھے۔ میری جیکٹ میں ایک پیسہ تک نہیں تھا۔ سگریٹ اور لائٹر بھی غائب تھے۔ میں نے اٹھ کر دوبارہ کھڑکی کو کھولنے کی کوشش کی مگر میری پسلیوں میں ایک ٹیس سی اٹھی اور میں وہیں بیٹھ گیا۔ پھر وہیں ٹانگیں پسار کر لیٹ گیا۔ مجھے اس چھوٹے سے نیم روشن کمرے پر پھانسی کی کوٹھڑی کا گمان ہو رہا تھا جہاں سے مجھے صبح تک پھانسی دینے کے لیے لے جایا جائے گا۔ پردیس میں ایسی عبرت ناک موت کے خیال سے میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ کاش میں اس ملک کے سفر پر کبھی نہ آتا۔ کاش میں نے سالیا کے سنہری بالوں کے جال میں الجھ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالا ہوتا۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں اپنے آپ کو برے راستوں سے بچا کر رکھتا اور جس طرح دوسرے سیاح دہلی میں آتے ہیں' اسی طرح میں بھی آتا' دہلی شہر کی سیر کرتا' کہیں تھوڑے دن جاب کرتا اور کرایہ اکٹھا کر کے دوسرے شہر کی طرف روانہ ہو جاتا۔ لیکن میں جذبات کی رو میں بہہ گیا تھا اور آج اس کا سنگین نتیجہ بھگت رہا تھا۔

مجھے سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کیا یہ لوگ مجھے مارنے سے پہلے سگریٹ کا ایک کش بھی نہیں لگانے دیں گے۔ کسی وقت خیال آتا کہ نہیں' یہ لوگ مجھے ماریں گے نہیں ------- کوبرے نے محض ڈرانے کے لیے صبح کو مجھے باہر لے جا کر شوٹ کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ آخر ان لوگوں کو مجھے مار کر کیا ملے گا۔ میں نے ان کے کسی آدمی کو ہلاک نہیں کیا تھا۔ وہ تو زخمی ہوا تھا' پھر یہ لوگ مجھے کیوں ماریں گے؟ بدن بھی درد کر رہا تھا۔ بے ہوشی کے انجکشن کا اثر بھی تھا۔ کسی وقت میری آنکھیں اپنے آپ بند ہو جاتیں اور آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا۔ اور اس اندھیرے میں تارے سے چمک چمک کر ٹوٹنے لگتے۔ کسی وقت میں ہوش میں آ جاتا اور پوری آنکھیں کھول کر قید خانے کی سنگین دیواروں کو تکنے لگتا۔ اس کے بعد میری آنکھیں دوبارہ بند ہو جاتیں۔ اسی طرح زندگی اور موت کے درمیان بہتا رہا۔ کبھی جاگ کر' کبھی سو کر...... اسی طرح نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ بند کھڑکی کی دوسری جانب سے کوئی آواز تک سنائی نہیں دی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ کوٹھڑی کسی قبرستان میں واقع ہے۔

اچانک ہوائی جہاز کے گزرنے کی آواز آئی۔ یہ جیٹ طیارے کی آواز تھی جو میرے قید خانے کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ انجنوں کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ لینڈ کرنے والا ہے۔ ایئرپورٹ وہاں کہیں قریب ہی تھا۔ میرے دل میں حسرت پیدا ہوئی۔ کاش میں ہوائی جہاز میں سوار ہوتا

اور فضا میں پرواز کرتا' اپنے وطن پاکستان پہنچ جاتا اور کراچی کے ایئر پورٹ پر اتر کر خدا کا لاکھوں لاکھ شکر ادا کرتا اور لوگوں کو بتاتا کہ خدا کے لیے اپنے وطن پاکستان کی قدر کرو۔ یہی ایک ملک ہے جہاں تم جس حالت میں بھی ہو غریب ہو یا امیر ہو خوشحال ہو جیسے بھی ہو تمہاری شناخت' تمہاری زندگی اور تمہارا حفظ و امان اللہ کے بعد اسی وطن پاکستان کے ساتھ قائم ہے۔

مگر جھینگرے کی آواز گم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ باہر سے کسی پرندے کی آواز بھی نہیں آتی تھی۔ اچانک کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ موت کا فرشتہ آن پہنچا ہے۔ اب خدا سے اپنے گناہوں کی آخری بار معافی مانگ لو۔ تھوڑی دیر بعد تمہاری بے گور و کفن لاش کسی گڑھے میں پڑی ہوگی یا دریا میں اسے مچھلیاں کھا رہی ہوں گی۔ دروازہ کھلا' دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ یہ وہی آدمی تھے جو کوبرا کے ساتھ ہوتے تھے۔ میرا دل حلق کے قریب آ کر دھڑکنے لگا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ دوسرے کے کندھے سے رائفل لٹک رہی تھی۔ ریوالور والے نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ میری موت نے مجھے اشارہ کیا تھا۔ میں اٹھا مگر لڑکھڑا گیا۔ دوسرے نے میری کمر میں ہاتھ ڈالا اور ایک طرح سے گھسیٹتا ہوا کمرے سے نکال کر اپنے ساتھ ہی دوسری طرف لے آیا جو ایک تنگ سی راہداری تھی۔ آگے دیوار میں ایک دروازہ تھا جس کا ایک پٹ کھلا تھا۔ یہاں سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ وہ مجھے باہر کھلی فضا میں لے آئے۔ میں نے حسرت بھری نظروں سے آسمان کو دیکھا۔ آسمان پر سپیدۂ سحر کی ملگجی سی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ کوبرا کے حکم کے مطابق مجھے صبح صبح گولی مار کر میری لاش کو دریا میں پھینکنے کا وقت آن پہنچا تھا۔ میں خدا کو یاد کرنے لگا۔ کن آنذو میں اپنے گھر کا نقشہ میری آنکھوں میں گھومنے لگا۔ لاہور کی سڑکوں پر میں نے سکوٹر گاڑیوں اور بسیں چلتی دیکھیں۔ مجھے لاہور کی مسجدوں سے بلند ہوتی اذان کی آوازیں آنے لگیں۔ "یا اللہ! میرے گناہ معاف کر دینا' یا اللہ! میرے گناہ معاف کر دینا۔۔۔۔۔۔۔ میں بڑا گناہ گار ہوں' مجھے بخش دینا۔'

یہی ورد کرتا میں جیپ میں بیٹھ گیا بلکہ دھکیل دیا گیا۔ جیپ پہاڑی اونچے نیچے رستوں پر میری موت کی منزل کی طرف تیزی سے بڑھنے لگی۔ مجھ پر موت کا خوف طاری تھا۔ اپنے لاہور کے دوست یاد آ رہے تھے۔ پاک ٹی ہاؤس کی محفلیں یاد آ رہی تھیں۔ الوداع! میرے پیارے دوستو! الوداع۔۔۔۔۔۔۔ میرے پیارے وطن پاکستان کے شہرو! شہر کی پیاری گلیو! اب تم سے کبھی ملاقات نہیں ہوگی ۔۔۔۔۔۔۔ خدا تمہیں آباد رکھے۔

موت سے جنگ

جیپ تیزی سے چلی جا رہی تھی۔ اب وہ ایک چڑھائی چڑھنے لگی۔ یہاں اس کی رفتار ہلکی ہو گئی۔ وہ مقام آ گیا تھا جہاں سے جا کر ان جلادوں نے مجھے موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ ایک مقام پر پہنچ کر جیپ ایک طرف گھوم کر رک گئی۔ مجھے کھینچ کر جیپ سے باہر نکالا گیا۔ مجھ

کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ یہ ایک ٹیلے کی چوٹی ہے۔ ارد گرد کوئی درخت نہیں ہے۔ مجھے چوٹی کے کنارے کھڑا کر دیا گیا۔ میں نے آخری بار چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ نیچے کافی گہرائی میں مجھے دریا کا پانی بہتا ہوا نظر آیا۔ مجھے ٹیلے کے کنارے پر اسی لیے کھڑا کیا گیا تھا کہ گولی لگنے کے بعد جب میں مر جاؤں تو اپنے آپ میری لاش نیچے دریا میں گر پڑے اور ان لوگوں کو میری لاش ٹھکانے لگانے کی بھی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔

اچانک ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں چمک اٹھا۔

یہ صرف خیال ہی نہیں تھا اس کے ساتھ خیال پر عمل کرنے کی طاقت بھی آ گئی تھی۔ اگر مرنا ہی ہے تو کیوں نہ زندگی بچانے کی آخری کوشش کی جائے۔ ریوالور والا آدمی ایک طرف ہٹ کر سگریٹ سلگا رہا تھا۔ دوسرا آدمی رائفل کا سیفٹی کیچ آگے کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ یہ سب کچھ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں آناً فاناً ہو گیا۔ وہ رائفل کا رخ میری طرف کر کے شست لگا رہا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو پیچھے گرا دیا۔ آخری آواز جو میں نے سنی وہ رائفل کے دھماکے کی آواز تھی۔

میں قلابازیاں کھاتا نیچے دریا میں جا گرا اور نیچے ہی نیچے تیرتا چلا گیا۔ میری زندگی ابھی باقی تھی۔ یہاں دریا گہرا تھا اور نیچے بڑے بڑے پتھر نہیں تھے۔ اوپر سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ خدا جانے ان لوگوں کی گولیاں کہاں گر رہی تھیں۔ میں پانی کے اندر نیچے ہی نیچے ہاتھ پاؤں چلاتا آگے بڑھنے لگا۔ پانی کا بہاؤ یہاں زیادہ تیز نہیں تھا۔ زندہ بچنے اور موت کے چنگل سے بچ نکلنے کی خوشی نے میرے اندر زبردست طاقت بھر دی تھی۔ مجھے پانی کے اندر فائر کی آوازیں ابھی تک سنائی دے رہی تھیں۔ میرا سانس ختم ہو گیا۔ میں نے جلدی سے سر پانی سے باہر نکالا۔ یہاں دریا ایک طرف مڑ رہا تھا اور موجوں کی رفتار تیز تھی۔ پانی کا ریلا مجھے تیزی سے بہاتا ہوا پہاڑی کی طرف دوسری طرف لے گیا۔ یہاں دریا نشیب میں بہتا تھا۔ میں تیز رفتار موجوں کے ساتھ تیزی سے بہتا ہوا کافی آگے نکل گیا۔ خدا نے مجھے موت کے منہ سے نکال لیا تھا۔ پانی بے حد ٹھنڈا تھا۔ دن کی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ دریا کے دونوں جانب اونچی پہاڑیاں تھیں۔

یہ پہاڑیاں بالکل سیدھی تھیں اور ان کی چوٹیوں پر بھورے رنگ کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ دریا کا بہاؤ مجھے اپنے آپ بہائے لیے جا رہا تھا۔ سردی سے میرا جسم بے حس ہونے لگا تھا۔ مجھے صرف یہ ڈر تھا کہ کہیں دریا کے یخ پانی میں ٹھٹھر کر نہ مر جاؤں۔ بدن سن ہو جانے کی وجہ سے جسم سے درد کا احساس جاتا رہا تھا۔ اگر سردیوں کا موسم ہوتا تو میں اب تک سردی سے ٹھٹھر کر ختم ہو چکا ہوتا۔ یہ بہار کا موسم تھا اور فضا میں ہلکی ہلکی گرمائش آ چکی تھی۔

میں چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے دریا سے باہر نکل جاؤں مگر بہاؤ بڑا تیز تھا اور میں لکڑی کے ٹکڑے کی طرح لہروں پر ادھر ادھر اچھلتا

بہا چلا جا رہا تھا۔ آسمان پر رات کے شروع میں جو بادل چھائے ہوئے تھے اور جنہیں میں نے ویرونا ریلوے سٹیشن میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا اب غائب ہو چکے تھے۔ اور سورج کی پیلی گلابی شعاعیں بائیں جانب والی پہاڑیوں کے درختوں کو روشن کرنے لگی تھیں۔ دریا ایک بار پھر ٹیلے کی دوسری جانب گھوم گیا۔ میں نے وہاں جھاڑیوں کو پکڑنے کی بڑی کوشش کی مگر پانی کے تیز بہاؤ نے مجھے اتنی مہلت نہ دی کہ کسی جھاڑی کو مضبوطی سے پکڑ کر کنارے پر جا پہنچوں۔

پہاڑی ٹیلوں کے اندر ہی اندر دو تین موڑ مڑنے کے بعد دریا کھلی جگہ میں آ گیا۔ یہاں موجوں کی رفتار سست ہو گئی۔ پہاڑی ٹیلے دور دور ہٹ گئے تھے۔ میں نے اپنے جسم کی بچی کھچی طاقت کو جمع کر کے دریا کے قریبی کنارے کی طرف تیرنا شروع کر دیا۔ تیرنا مجھے لاہور کے دریائے راوی اور حضرت میاں میر صاحب والی نہر نے سکھایا تھا۔ بچپن اور لڑکپن میں اس نہر میں چھلانگیں لگایا کرتا تھا۔ کالج کے زمانے میں دریائے راوی پر تیرنے جاتا تھا۔ اس زمانے کا تجربہ میرے کام آ رہا تھا۔ بہت جلد میں دریا سے نکل گیا۔

کنارے پر آتے ہی جھاڑیوں میں لیٹ گیا۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ جسم سرد ہو گیا تھا۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ دھوپ کی گرمی نے میرے جسم کی سردی ختم کر دی۔ اس کے ساتھ ہی جسم درد کرنے لگا۔ ان غنڈوں نے میری بہت پٹائی کی تھی۔ پسلیاں اور جبڑا ابھی تک درد کر رہا تھا۔ مگر میں زندہ بچ کر نکل آیا تھا۔ جس دریا میں میری لاش کو تیرنا تھا اس دریا میں سے میں تیر کر کنارے پر نکل آیا تھا۔ میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور جھاڑیوں میں سے لنگڑاتا ہوا نکلا اور کھلی جگہ گھاس پر آ کر بالکل چت لیٹ گیا۔ دھوپ میرے سارے جسم پر پڑ رہی تھی۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ کوبرا اور اس کے ساتھی اتنی جلدی میرے پیچھے اس علاقے میں نہیں آ سکتے تھے۔ دریا کی موجیں مجھے کئی پہاڑیاں درمیان میں ڈال کر بہت آگے لے آئی تھیں۔ اس طرح میرے اور میرے جلادوں کے درمیان کافی فاصلہ پڑ چکا تھا۔ پھر بھی میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ مجھے جتنی جلدی ہو سکے وہاں سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہیے تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری جیکٹ جینز سب کچھ گیلا ہو چکا تھا۔ میں نے جیبوں کو ٹٹول کر دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور دریا کے کنارے کنارے سورج کی سمت چلنے لگا۔ یہ علاقہ زیادہ تر پہاڑی علاقہ تھا۔ مگر پہاڑیاں اور ٹیلے دور دور تھے۔ میں جھاڑیوں میں سے نکل کر کھلی جگہ پر آ گیا۔ یہ گھاس کا ایک میدان تھا۔ میدان کے پار مجھے درختوں کا ایک جھنڈ دکھائی دیا۔ میں اس طرف چل پڑا کہ شاید وہاں کوئی باڑہ وغیرہ ہو اور میں کچھ دیر وہاں بیٹھ کر کم از کم اپنے کپڑے ہی سکھا سکوں۔ جسم درد کر رہا تھا مگر میں رکے بغیر آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ گھاس کے میدان میں ایک پگڈنڈی مل گئی جو درختوں کے جھنڈ کی طرف جا رہی تھی۔ یہ بھی ڈر تھا کہ وہاں کوبرا کے لوگ نہ مل جائیں۔ مگر اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ میرے لیے اب سارے کا سارا اٹلی کا ملک ہی مافیا کا اڈہ تھا۔ مجھے ہر حال میں اس ملک سے نکلنا تھا۔ یہ خیال بھی تھا کہ میرے پاس پاسپورٹ وغیرہ بھی نہیں ہے اور میں سرحد پار کرتے ہوئے پکڑا جاؤں گا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ سرحد پار کرتے پکڑ لیا جاؤں تو ٹھیک ہے کم از کم مافیا والوں سے تو بچ جاؤں گا۔ یہ بات میرے علم میں بھی تھی کہ میں شمالی اٹلی میں ہوں جہاں مشرق کی طرف یوگوسلاویہ کا ملک شروع ہوتا ہے اور شمال کی جانب سوئٹزرلینڈ کا ملک ہے۔ میں مشرق کی جانب جا رہا تھا۔

درختوں کا جھنڈ قریب آیا تو میں ایک جگہ بیٹھ کر غور سے درختوں کو دیکھنے لگا۔ درختوں کے درمیان مجھے ایک ڈھلوان چھت والا باڑہ دکھائی دیا جس کے پہلو میں ایک چھوٹا سا پتھر کا دیہاتی ٹائپ کا مکان تھا۔ وہاں کوئی انسان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مویشی وغیرہ بھی نہیں تھے۔ میں نے خدا کو یاد کیا اور باڑے کا رخ کر لیا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی۔ دیوار میں اوپر جا کر روشن دان تھے۔

یہ باڑہ ہی تھا جسے انگریزی زبان میں بارن کہتے ہیں۔ اس کا آدھا دروازہ کھلا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ یورپ کے رواج کے مطابق وہاں سوکھی گھاس کے چوکور گٹھے ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ دیوار کے ساتھ گینتی، بیلچے اور فصل صاف کرنے والے پھاوڑے اور سہ شاخ دار بیلچے لٹکے تھے۔ گڈے کا ایک پہیہ بھی پڑا تھا۔ باڑے میں فضا گرم تھی۔ مجھے وہاں بڑا سکون ملا۔ سوکھی گھاس کے گٹھوں کے درمیان کافی جگہ تھی۔ میں وہاں ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہاں سے مجھے کس طرف جانا چاہیے۔

میں نے اب یوگوسلاویہ کی سرحد پر پہنچنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یوگوسلاویہ کی بارڈر پولیس مجھے غیر قانونی طور پر سرحد پار کرتے ہوئے ضرور گرفتار کرے گی۔ میں یہی چاہتا تھا۔

میں اٹلی میں پاکستانی سفارت خانے میں بھی جا سکتا تھا۔ مگر اٹلی میں ہمارا سفارت خانہ روم شہر میں تھا جو وہاں سے اتنی دور تھا کہ مافیا کے لوگ مجھے راستے ہی میں پکڑ لیتے اور پھر میرے پاس روم تک پہنچنے کا کرایہ اور زادِ راہ بھی نہیں تھا۔ میرے لیے یہی بہتر تھا کہ میں یوگوسلاویہ کی سرحد پر گرفتار ہو جاؤں اور پھر اپنے پاکستانی سفارت خانے سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کروں۔ مجھے بھوک اور پیاس بھی لگ رہی تھی۔ وہاں نہ تو کہیں پانی نظر آ رہا تھا اور نہ کھانے کو کچھ تھا۔ میرا خیال تھا کہ باڑے کے ساتھ جو پتھر کا بنا ہوا چھوٹا سا دیہاتی مکان ہے وہاں ضرور کوئی نہ کوئی رہتا ہوگا۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں باڑے سے نکل کر ساتھ والے مکان کے پاس آ گیا۔ اس کے صحن میں درخت اور کاشت کاری کے آلات ایک طرف پڑے تھے۔ پیچھے ایک کمرہ تھا۔ میں نے اس کا دروازہ کھولا تو اندر بھوسہ بھرا ہوا تھا۔ واپس صحن میں آ گیا اور پتھر کی تین فٹ اونچی دیوار پر دھوپ میں بیٹھ گیا۔

نیک دل دیہاتی باپ بیٹی

سوچنے لگا کہ یہاں بیٹھے رہنا بیکار ہے۔ مجھے آگے چل دینا چاہیے شاید آگے کوئی گاؤں آ جائے اور مجھے کھانے پینے کو کچھ مل جائے۔ اتنے میں مجھے باڑے کی جانب سے بکری کے ممیانے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر اس طرف گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ باڑے کے باہر

ایک دیہاتی لڑکی سر پر سفید ٹوپی اور بدن پر لمبا سا گاؤن پہنے ہاتھ میں چھڑی لیے کھڑی میری طرف غور سے دیکھ رہی ہے۔ اس نے پہلے ہی مجھ دیکھ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بکری تھی جس کی رسی لڑکی کے ہاتھ میں تھی۔ میں سلاوی زبان میں بات کر سکتا تھا۔ میں نے قریب جا کر کہا کہ مجھے بھوک اور پیاس لگی ہے۔ میں ٹورسٹ ہوں اور راستہ بھول کر ادھر آ نکلا ہوں۔ لڑکی نے کہا۔ "تم یہاں بیٹھو۔ میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔"

بکری کو اس نے ایک کھمبے کے ساتھ باندھا اور خود دوڑتی ہوئی درختوں کے جھنڈ کی دوسری طرف نکل گئی۔ دوسری طرف نشیب تھا۔ میں نے سوچا کہیں یہ کسی کو میرے بارے میں بتا نہ دے۔ کہیں مایا کے آدمی یہاں بھی نہ پہنچ گئے ہوں۔ موت کے خوف کی وجہ سے میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ میں نے درختوں کے پاس جا کر نیچے نشیب میں دیکھا۔ میدان کی ڈھلان پر ذرا نیچے جا کر دو دیہاتی مکان ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ لڑکی ان میں سے ایک مکان میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر نکلی تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری اور دوسرے ہاتھ میں پلاسٹک کی بوتل تھی جو دھوپ میں چمکتی مجھے دور سے نظر آ گئی تھی۔

یہ دیہاتی لڑکی میرے لیے ڈبل روٹی، سیب کا مربہ اور پانی لائی تھی۔ اس نے یہ چیزیں میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "گھر میں اس وقت یہی کچھ تھا جو میں لے آئی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم کس ملک کے رہنے والے ہو؟"

میں نے سیب کے مربے کے ساتھ ڈبل روٹی کھاتے اور ساتھ ہی پانی کا گھونٹ نگلتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ "پاکستان"

وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ وہ مجھے کھاتے دیکھ کر ذرا ذرا مسکرا رہی تھی۔ کھانا کھانے اور پانی پینے سے میری توانائی بحال ہوئی تو میں نے لڑکی سے پوچھا۔ "یہاں سے آگے یوگوسلاویہ کا ملک کس طرف ہے؟ میں یوگوسلاویہ جانا چاہتا ہوں۔"

لڑکی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم۔ میرے پاپا مارکیٹ میں گئے ہوئے ہیں۔ تم یہاں بیٹھو۔ وہ آئیں گے تو تم ان سے پوچھنا۔"

یہ کہہ کر لڑکی نے ٹوکری اور برتن اٹھائے اور واپس چلی گئی۔ کھانے کے بعد میں اپنے اندر طاقت سی محسوس کرنے لگا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آخر یہی فیصلہ کیا کہ یہ دیہاتی قسم کے لوگ ہیں۔ ان بے چاروں کا مارکو مایا سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ ان سے یوگوسلاویہ کے بارڈر کے بارے میں پوری معلومات حاصل کی جائیں اور پھر آگے قدم اٹھایا جائے۔ میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی کہ میں چلتا چلتا کسی شاہراہ پر پہنچ کر کسی بس وغیرہ میں ہی سوار ہو سکتا۔ میں وہیں دھوپ میں لیٹ کر لڑکی کے ماں باپ کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد مجھے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ وہی دیہاتی لڑکی ایک مضبوط قد کاٹھ والے آدمی کے ساتھ میری طرف چلی آ رہی تھی۔ وہ آدمی یقیناً اس لڑکی کا باپ تھا۔ اس کی کنپٹیوں پر بال تھوڑے سفید تھے۔ وہ منہ میں سگریٹ دبائے ہوئے تھا۔

میں نے اسے اطالوی طریقے پر سلام کیا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پوچھا۔ "تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے اسے بتایا کہ میں پاکستان کا سیاح ہوں۔ راستے میں میرا سامان کا تھیلا چوری ہو گیا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ یوگوسلاویہ جا کر اپنے ملک کے سفارت خانے سے رابطہ پیدا کروں اور اپنے ملک واپس چلا جاؤں۔

اس آدمی نے کہا۔ "تم اطالین اچھی طرح بول لیتے ہو۔ ورنہ عموماً سیاح جو یہاں آتے ہیں وہ ہماری زبان نہیں بول سکتے۔"

میں نے کہا۔ "پاکستان سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے اطالوی زبان کا کورس پورا کیا تھا۔"

اس نے اپنی بیٹی کو گھر جانے کا اشارہ کیا اور خود میرے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے سگریٹ پینے کو دیا اور کہنے لگا۔ "یوگوسلاویہ کی سرحد یہاں سے کافی دور ہے۔ اس طرف کوئی ریلوے لائن بھی نہیں ہے۔ یہاں سے آگے سو کلومیٹر پر برسک نام کا ایک قصبہ ہے۔ وہاں سے سبزیوں اور انگوروں سے لدے ہوئے ٹرک بارڈر تک جاتے ہیں۔ اگر وہ لوگ تمہیں ٹرک میں بٹھا لیں تو تم یوگوسلاویہ بارڈر تک پہنچ سکتے ہو۔"

یہ میرے لیے بہت بڑی خوشخبری تھی۔ میں نے کہا۔ "مگر میرے پاس ٹرک کا کرایہ ادا کرنے کے لیے ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔"

وہ میری طرف دیکھ رہا تھا پھر بولا۔ "میں تمہیں اتنے پیسے دے سکتا ہوں کہ تم یوگوسلاویہ کی سرحد تک پہنچ جاؤ۔ یہاں بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ میرے دل میں وسوسے پیدا ہونے لگے۔ کہیں یہ بھی مافیا کا ایجنٹ نہ ہو۔ کہیں یہ مافیا کے آدمیوں کو خبر نہ کر دے۔ کہیں میں مارا نہ جاؤں۔ پھر سوچتا کہ نہیں یہ تو سیدھا سادا دیہاتی آدمی ہے۔ مجھ سے ہمدردی کے ساتھ پیش آیا ہے۔ میں انہی خیالوں میں کھویا یہاں بیٹھا رہا۔ کبھی اٹھ کر ڈھلان کے پاس جا کر نیچے دیکھتا کہ وہ گھر سے باہر نکلا ہے کہ نہیں۔ میں نے اسے مکان سے باہر آتے دیکھا تو جلدی سے واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔

نیک دل دیہاتی نے مجھے کچھ لیرے دیئے۔ ایک لفافہ دیا جس میں ایک بڑی ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے اور کچھ سوکھا گوشت تھا۔ کہنے لگا۔ "یہاں سے سیدھا ان ٹیلوں کی طرف چلے جاؤ۔ آگے تمہیں ایک سڑک ملے گی۔ وہاں سے تمہیں کوئی نہ کوئی سواری برسک جاتی مل جائے گی۔"

اتنا کہہ کر اس نیک دل دیہاتی نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے نئے سفر پر روانہ ہو گیا۔ سارے کا سارا علاقہ سرسبز اور پہاڑی علاقہ تھا مگر پہاڑیاں ایک دوسری سے کافی دور دور ہوتی جا رہی تھیں۔ جس پگڈنڈی پر میں چلا جا رہا تھا وہ گھاس کا میدان عبور کرتے ہی ختم ہو گئی۔ اب یہاں کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پسلیوں میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا جس کی وجہ سے میں آہستہ

آہستہ چل رہا تھا۔ اس اعتبار سے مجھے ایک اطمینان بھی تھا کہ مافیا کے لوگ یہاں میرے تعاقب میں نہیں آئیں گے۔ کیونکہ ان لوگوں کا زور اور سرگرمیاں زیادہ تر شہروں میں ہی ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کو مجھ سے کوئی سنگین خطرہ بھی نہیں تھا، وہ تو مجھے مار ڈالنے آئے تھے۔ میں نے بلند پہاڑی کی چوٹی سے دریا میں چھلانگ لگائی تھی۔ انہیں یقین ہوگا کہ میں اتنی بلندی سے پتھروں سے بھرے ہوئے دریا میں چھلانگ لگانے کے بعد زندہ نہیں بچا ہوں گا۔ پھر انہوں نے اوپر سے کافی فائرنگ بھی کی تھی۔ بہر حال میں اس ملک سے جتنی جلدی ممکن ہو سکے نکل جانا چاہتا تھا۔

چراگاہ کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ میرے جسم میں گرماہٹ بھی آ گئی تھی اور میرے گیلے کپڑے بھی سوکھ گئے تھے۔ جسم کے گرم ہو جانے سے میری چوٹوں کے درد میں بھی تھوڑا سا افاقہ ہو گیا تھا۔ مگر پسلیوں میں ہلکی ہلکی ٹیسیں اسی طرح پڑ رہی تھیں۔ جدوجہد کر کے میں ایک سڑک پر آ گیا۔ یہ پختہ سڑک تھی۔ دور سے ایک ٹرک آ رہا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ دیا۔ وہ رکا نہیں گزر گیا۔ اس کے کچھ دیر بعد ایک ٹرالر آیا جس پر سبزیاں لدی ہوئی تھیں۔ یہ بھی میرے ہاتھ کے اشارے پر نہ رکا اور آگے نکل گیا۔ میں سڑک کے کنارے کنارے آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ میری بائیں جانب نشیب میں پھلوں کے باغات تھے۔ دو تین آدمی ان باغوں میں کانٹ چھانٹ میں لگے تھے۔ مجھے پیچھے سے موٹر کے انجن کی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ایک ویگن آ رہی تھی۔ میں نے اسے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

خوش قسمتی سے ویگن میرے قریب آ کر رک گئی۔

ویگن کی چھت پر مرغیوں کے ڈربے لدے ہوئے تھے۔ ایک سفید مونچھوں والا بوڑھا اطالوی منہ میں پائپ لگائے اسے چلا رہا تھا۔ اس نے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر کہا۔ ”میں لبرسنگ تک جا رہا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے بھی وہیں جانا ہے سینور“

اس نے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ویگن آگے روانہ ہو گئی۔ یہ بوڑھا اطالوی بڑا باتونی تھا۔ فر فر دیہاتی اطالوی زبان میں باتیں کیے جا رہا تھا۔ اس کی کچھ اطالوی میری سمجھ میں آتی، کچھ نہیں آتی تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں پاکستان کا سیاح ہوں اور سب وگوسا جا رہا ہوں تو وہ خوش ہو کر بولا۔ ”پاکستان ۔۔۔۔۔۔ میں وہاں ایک بار گیا تھا ۔۔۔۔۔۔ لاہور خوبصورت شہر ------ لوگ بڑے اچھے ہیں ------ تم بہادر لوگ ہو ------ ہم رومن بھی بہادر قوم ہیں ------ تم نے ۶۵ء کی جنگ میں ہندوستان کی زبردست طاقت کا خوب مقابلہ کیا ------ کیا تم شادی شدہ ہو؟“

اس کے اس اچانک سوال پر میں نے اس کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا۔ ”تم ایشیائی لوگ بہت دیر بعد

شادی کرتے ہوئے ہچکچاہٹ ہے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ ہم ہیمبرگ کس وقت تک پہنچ جائیں گے۔ وہ بڑے آرام سے کہنے لگا۔ ”کل اس وقت تک پہنچ جائیں گے۔“

میں ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گیا۔ دوپہر تک وہ ویگن چلاتا رہا۔ اس دوران ویگن کئی چھوٹے چھوٹے قصبات سے گزری۔ پھر اس نے سڑک کے کنارے ایک پٹرول پمپ کے پاس گاڑی کھڑی کر دی۔ پٹرول ڈلوایا اور گاڑی وہیں چھوڑ کر مجھے ایک ریستوران میں لے آیا۔

”تمہارے پاس کتنے پیسے ہوں گے؟“

میں نے سارے لیرے جیب سے نکال کر اس کو دکھائے۔ وہ غور سے میری ہتھیلی پر رکھے نوٹوں کو دیکھ کر بولا۔ ”ٹھیک ہے انہیں تم اپنے پاس رکھو۔ دوپہر کا کھانا تمہیں میں کھلا دوں گا تم مجھے رات کا کھانا کھلا دینا۔“

ریستوران میں ہم نے جو کچھ کھایا۔ بوڑھے نے وائن کی ایک بوتل بھی ساتھ رکھ لی۔ یہاں سے چلے تو پھر شام تک سفر جاری رہا۔ رات ہم نے ایک بڑے قصبے کے پٹرول پمپ کے گیراج میں ویگن کے اندر ہی لیٹ کر گزاری۔ رات کا کھانا میں نے کھلایا تھا۔ میرے پاس تھوڑے سے پیسے بچے تھے مگر میں اسی خیال سے بڑا خوش تھا کہ کل میں اٹلی سے نکل چکا ہوں گا۔ بوڑھا کھانے کے بعد وائن کی پوری بوتل چڑھا گیا اور رات گئے تک خدا جانے کیا کیا بولتا اور کیا کیا کچھ مجھے سناتا رہا۔

لبرسنک شہر

دوسرے دن کوئی تین بجے کے قریب ہماری ویگن لبرسنک کے سرحدی شہر کے مضافات میں داخل ہوگئی۔ یہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا شہر تھا جس کی گلیاں پتھریلی تھیں۔

سڑک سے دور ہٹ کر ایک گرجا گھر کی خوبصورت عمارت بنی ہوئی تھی۔ زیادہ تر لوگ سائیکلوں پر آ جا رہے تھے۔ شہر کا دروازہ پتھر کا محرابدار تھا جس طرح ہمارے ہاں لاہور کا دہلی دروازہ ہے۔ بوڑھے نے مجھے بارڈر کا راستہ بتا دیا تھا۔ میں ایک چھوٹے سے پارک میں بیٹھ گیا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ دو تین بچیاں پارک میں رنگین فٹ بال سے کھیل رہی تھیں۔ ایک بوڑھی عورت ان کے قریب ہی بنچ پر بیٹھی سویٹر بن رہی تھی۔ بڑی پر سکون فضا تھی۔ ہوا میں سردی بالکل نہیں تھی۔ دو لیرے کا میں نے سگریٹ کا سستا سا پیکٹ خرید لیا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور سوچنے لگا کہ بارڈر کو کہاں سے اور کس طرح کراس کیا جانا چاہیے۔ قاعدے قانون کے مطابق میں بارڈر کراس نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے بارڈر کی چوکی پر سے ہی واپس کر دیا جاتا۔ کیونکہ میرے پاس پاسپورٹ بھی نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ بارڈر پولیس مجھے گرفتار کر لے۔ اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کرنے کی کوشش کروں۔ اس میں یہ خطرہ بھی تھا کہ بارڈر پولیس

کی گولی کا نشانہ نہ بن جاؤں۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ دن کی روشنی میں بارڈر کراس کرنا چاہیے اور اس وقت کراس کرنا چاہیے جب بارڈر سکیورٹی پولیس کی جیپ دور ہی سے نظر آ رہی ہو۔

یہ سوچ کر میں اٹھا اور اس سڑک پر روانہ ہو گیا جو بارڈر کو جاتی تھی۔ یہ چھوٹی سی سڑک جو گول پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ مجھے اس بات کا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ بارڈر کی طرف جاتے ہوئے یا بارڈر کراس کرتے ہوئے کوئی دیکھ نہ لے۔ بلکہ میں خود چاہتا تھا کہ مجھے بارڈر سکیورٹی پولیس والے دیکھیں اور گرفتار کر لیں۔

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد بارڈر کا ایریا شروع ہو گیا۔ یہاں درختوں کا صفایا کر دیا گیا تھا اور کئی جگہوں پر زمین میں گول پتھر گڑے ہوئے تھے جن پر سفید رنگ پھیر دیا گیا تھا۔ میں دو چھوٹے ٹیلوں کے درمیان آ گیا جہاں خاردار تار گچھوں کی شکل میں ٹیلوں کی ڈھلان سے شروع ہو کر میرے سامنے سے گزرتی ہوئی دوسرے ٹیلے کے اوپر تک چلی گئی تھی۔ یہ اٹلی اور یوگوسلاویہ کا بارڈر تھا۔ یہ ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا کہ میں خاردار تاروں کے گچھوں کو کہاں سے اور کیسے عبور کروں۔ میں خاردار باڑ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ایک جگہ میری نظر پڑی وہاں زمین میں بارش کے پانی کے گرنے کی وجہ سے گڑھا بن گیا تھا۔ گڑھے میں پانی نہیں تھا۔ وہ خاردار باڑ کے بالکل نیچے تھا۔ میں گڑھے میں اتر گیا اور دونوں ہاتھوں سے مٹی ہٹانے لگا۔ مٹی نرم تھی۔ بڑی جلدی وہاں اتنا سوراخ بن گیا جس میں سے گزر سکتا تھا۔ میں نے ایک سیکنڈ بھی ضائع نہ کیا اور سوراخ میں سے گزر کر دوسری طرف نکل گیا۔ دوسری طرف چھوٹا سا پتھریلا راستہ بنا ہوا تھا۔ میں وہاں آ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مجھے یوگوسلاویہ کی بارڈر سکیورٹی فورس والوں کا انتظار تھا۔

یوگوسلاویہ کی سرزمین پر

مجھے ایک جیپ دور سے اپنی طرف آتی نظر آئی۔ میں بھاگنے کی بجائے وہیں کھڑا رہا۔ جیپ میرے پاس آ کر رک گئی۔ اس میں سکیورٹی فورس کے تین وردی پوش سپاہی سوار تھے۔ وہ فوراً میرے پاس آ گئے۔ ان میں سے ایک نے مجھے گردن سے دبوچ لیا اور اپنی زبان میں کچھ پوچھا۔ ظاہر ہے یہی پوچھا ہو گا کہ میں کہاں سے آیا ہوں اور کون ہوں۔

میں گونگا بن گیا۔ انہوں نے مجھے پکڑ کر جیپ میں بٹھایا اور چیک پوسٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں یہی چاہتا تھا۔ اگر میں انگریزی یا اطالوی میں انہیں بتاتا کہ میں پاکستانی ہوں اور میں اٹلی کا بارڈر کراس کر کے یوگوسلاویہ جانا چاہتا ہوں تو ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے وہیں سے اٹلی کی طرف دھکیل دیتے۔ جب میں گونگا بن گیا تو انہیں شک پڑا کہ میں ضرور کوئی جاسوس ہوں اور جان بوجھ کر گونگا بن گیا ہوں۔ چیک پوسٹ پر میری تلاشی لی گئی۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا، پاسپورٹ بھی نہیں تھا۔ چیک پوسٹ سے مجھے پیچھے لے جا کر ایک کوارٹر میں بند کر دیا گیا۔ کوئی دس منٹ بعد ایک وردی پوش صحت مند خوبصورت افسر اندر آیا۔ اس کے ساتھ دو سکیورٹی فورس کے سپاہی تھے۔ افسر نے آتے

ہی مجھ سے بڑی صاف انگریزی میں پوچھا۔

”تم کون ہو۔۔۔۔۔۔۔تمہیں کس نے بھیجا ہے؟“

میں یہاں یہ بیان کر دوں کہ یوگوسلاویہ میں ابھی بوسنیا‘ سربیا اور کروشیا کی چپقلش شروع نہیں ہوئی تھی۔ ابھی سارے ملک کا نام یوگوسلاویہ تھا۔ یہ قیام پاکستان کے کچھ بعد کا زمانہ تھا۔ میں نے یوگوسلاوی افسر کو انگریزی میں اپنی ساری روداد بالکل سچ سچ بیان کر دی اور اس سے درخواست کی کہ مجھے پاکستانی سفارت خانے میں پہنچا دیا جائے۔ خدا جانے یہ میری زبان اور سچ بولنے کا اثر تھا یا وہ یوگوسلاوی افسر ہی رحم دل تھا۔ اس پر میری باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے آہستہ سے اپنا سر ہلایا اور اپنی زبان میں اپنے ساتھ آئے ہوئے سپاہیوں سے کچھ کہا اور ان کے ساتھ ہی باہر نکل گیا۔

ایک گھنٹے بعد میرا بیان قلم بند کیا گیا۔ میرے ہاتھوں کے نشان لیے گئے اور مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ دو دن تک میں بارڈر پولیس کی حوالات میں بند رہا۔ اس دوران کسٹم حکام نے میرے بارے میں اپنے طور پر ضروری تحقیقات مکمل کی اور پھر ایک روز بارڈر پولیس کے ٹرک میں بٹھا کر زغرب شہر روانہ کر دیا۔ زغرب میں امیگریشن والوں نے میرے بارے میں اپنے طور پر ضروری تحقیق کی اور بلغراد میں پاکستانی سفارت خانے سے رابطہ قائم کرنے کے بعد مجھے پولیس کی حراست میں بلغراد کے پاکستانی سفارت خانے پہنچا دیا گیا۔ میں بھی اس زمانے کی یوگوسلاوی حکومت اور یوگوسلاوی کسٹم حکام کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے ساتھ انسان دوستی کا سلوک کیا۔

پاک سرزمین پر واپسی

بلغراد میں پاکستانی سفارت خانے کی طرف سے میرا عارضی پاسپورٹ بنایا گیا اور مجھے بذریعہ ہوائی جہاز کراچی پہنچا دیا گیا۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ میں طوفانی سمندروں اور خطرناک جنگلوں کے ہیبت ناک سفر کے بعد اپنے گھر کے آنگن میں آ گیا ہوں۔۔ بے اختیار میرا جی چاہا کہ میں پاکستان کی سرزمین کو جھک کر چوم لوں۔ مگر اس خیال سے میں ایسا نہ کر سکا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ کراچی سے میں ٹرین میں بیٹھا اور لاہور اپنے گھر آ گیا۔

وینس شہر اور اٹلی میں میرے ساتھ بیتے ہوئے واقعات کی تلخ اور خوشگوار یادیں ابھی تازہ تھیں۔ کسی وقت اکیلا لاہور کے کسی ریستوران کے کونے میں بیٹھا چائے پی رہا ہوتا تو گزرے ہوئے واقعات کی ایک فلم آنکھوں کے سامنے چلنے لگتی۔ وینس کے قبرستان میں ملنے والی پر اسرار لڑکی یاد آ جاتی‘ وینس کی نہروں والی گلیوں کی پرانی حویلی میں قدیم رومن ایمپائر کی یادوں کو سینے سے لگائے عہد ماضی کے ایوانوں میں گم ماورائی لڑکی ایلس یاد آتی۔ کشادہ پیشانی اور چوڑے نتھنوں والی نتالی کی نکلی نیگرو لڑکی ساشی یاد آتی جس نے نتالی کی خاطر اپنی جان کی قربانی دے دی۔ سنہری بالوں والی نتالی یاد آتی جو گناہ آلود زندگی کے حصار سے نکل کر نیکی کے روشن راستوں کی تلاش میں

غائب کر دی گئی جو مجھ سے محبت کرتی تھی اور جس سے مجھے بھی محبت ہو گئی تھی۔ سگریٹ کے نیلگوں دھوئیں میں ستالی کا چہرہ ابھر ابھر کر ڈوب جاتا۔ میں جب آخری بار اس سے جدا کیا گیا تو اسے وینس کے جرائم پیشہ غنڈوں نے بری طرح زدوکوب کیا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ پھر وہ اسے اٹھا کر لے گئے تھے۔

یہ منظر بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ اور میرا دل غم سے بوجھل ہو جاتا۔ وقت گزرتا رہا۔

آخری سلام محبت!

مجھے وینس سے واپس لاہور آئے دو مہینے گزر چکے تھے کہ ایک روز مجھے ڈاک میں ایک ایئر میل لفافہ ملا جس پر اٹلی کے ٹکٹ لگے ہوئے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا اس پر وینس کے کسی پوسٹ آفس کی مہر بھی تھی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ لفافے کو کھولا۔ اس میں سے ایک خط نکلا۔ یہ خط سینٹ ماریانہ ہسپتال کے پیڈ پر لکھا گیا تھا۔ خط کی تحریر انگریزی میں تھی۔ اوپر میرے نام سے پہلے "سینور" لکھا ہوا تھا۔ آگے لکھا تھا:

"سینور!

یہ خط ہسپتال کے بیڈ نمبر ۱۱ کی مریضہ ستالیانہ مجھ سے لکھوا رہی ہے۔ وہ بستر مرگ پر ہے۔ اس کے پیٹ میں تین گولیاں لگی تھیں۔ وہ چند لمحوں کی مہمان ہے۔ اس پر صبح سے بے ہوشی طاری ہے۔ رات جب میں اس کا ٹمپریچر لینے گئی تو وہ ہوش میں تھی۔ اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے اور زندگی کے آخری لمحوں میں تمہیں یاد کر رہی ہے۔ اس نے تمہارا ایڈریس بھی مجھے دیا اور تاکید کی کہ میں اس کا آخری سلام محبت تم تک پہنچا دوں۔ اس کے کچھ دیر بعد ستالیانہ بے ہوش ہو گئی۔ میں وارڈ کی ہیڈ نرس ہوں۔ مجھے معلوم ہے ستالیانہ پر موت کی بیہوشی طاری ہوئی ہے۔ میں اس کے بیڈ سے اٹھ کر یہ خط تمہیں نرسنگ روم میں بیٹھی لکھ رہی ہوں۔ ستالیانہ کو کوئی ظالم شخص گولیاں مار کر ہائی وے کے کنارے جھاڑیوں میں پھینک گیا تھا۔ ستالیانہ کو بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال لایا گیا۔ میں ایک ہفتے سے اس کی تیمارداری کر رہی ہوں۔ اس نے ہوش میں آنے کے بعد مجھ سے صرف تمہارا ذکر کیا۔ تمہارا نام بتایا اور کہا کہ وہ تم سے پیار کرتی تھی اور موت کے بعد بھی تم ہی سے پیار کرتی رہے گی۔ عجیب لڑکی ہے۔ اس وقت رات کے دو بج رہے ہیں۔ ستالیانہ صبح سے بے ہوش ہے۔ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ ایک گولی اس کے جگر میں سے گزر گئی تھی۔

میں خط لکھنا تھوڑی دیر کے لیے بند کرتی ہوں۔ ستالیانہ کے ٹمپریچر چیک کرنے کا وقت ہو گیا ہے۔

سینور! میں ابھی ابھی ستالیانہ کے بیڈ سے واپس آئی ہوں۔ میں اس کا ٹمپریچر چیک کرنے گئی تھی۔ مگر افسوس کہ وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی مر چکی تھی۔

آئی ایم سوری!

فقط!

ہیلڈرس جولیانہ پوڈستا"

اٹلی کے سینٹ ماریانہ ہسپتال سے سنہری بالوں والی حنالی کی موت سے لے کر آیا ہوا خط میرے سامنے کھلا تھا اور اس پر میرے آنسو گر رہے تھے جس طرح خشک پتوں پر خزاں کی بارش کے موتی گرتے ہیں۔

◆ ◆ ◆